پھانسی
سرگزشت اسیر
وکٹر ہیوگو کا شاہکار
سعادت حسن منٹو

سرگزشتِ اسیر —— ایک ناول

پھانسی

وکٹر ہیوگو کا شاہکار

مترجمہ

سعادت حسن منٹو

ملنے کا پتہ

نیرنگ خیال بکڈپو فلیمنگ روڈ لاہور

قیمت عہ

انتساب

مُجرم کی معصُوم بچّی

میری کے نام

(مترجم)

سرگذشتِ اسیر

فرانس کے مایۂ ناز بین الملّی شاعر، ادیب اور مفکر وکٹر —— ہیوگو" VICTOR HUGO " کی ہستی محتاج تعارف نہیں۔ وہ اپنی لاثانی و غیر فانی تصنیف "مصیبت زدگان" یعنی LES MISERABLES سے شہرت دوام حاصل کر چکا ہے۔ فی الحقیقت فرانسیسی انشا پرداز اپنے زمانہ (۱۸۸۵-۱۸۰۲) میں فطرتِ انسانی کا بہترین ماہر تھا۔ سوسائٹی یعنی مجلسی دائرہ کے پیدا کردہ عیوب اور اخلاقی تباہیوں سے وہ اس قدر متاثر ہوا۔ کہ اس کی ہر تصنیف اس چیز کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ وہ امراء کی تعیش پسندی کو نفرت و حقارت کی نگاہوں سے دیکھتا۔ گرسنہ شکم اور برہنہ جسم غرباء کی حالت سے متاثر ہوتا۔ اس کے نزدیک تمام عیوب سوسائٹی کے پیدا کردہ ہیں۔ اور انسان جب سوسائٹی کی قیود سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ تب سوسائٹی اپنے یک طرفہ غیر آئینی اور ناقابل قبول قوانین سے

اُسے مصائب اور نوائب میں اس خیال سے دھکیل دیتی ہے۔ کہ اس کی اصلاح ہو۔ حالانکہ ایسا کرنے سے اصل اصلاح نہیں ہو سکتی۔

وہ غربا کی منتہی اور غیر مختتم تکالیف سے متاثر ہو کر لکھتا ہے :۔

"ترازوئے عدل کی طرف دیکھو۔ تمام مصائب غربا کے لئے اور تمام مسرتیں امراء کے لئے۔ دونوں پلڑے غیر مساوی ہیں۔ ترازوئے عدل کو دھوکا نہیں دینا چاہیئے۔ اور نہ ہی حکومت کو اس دھوکہ دہی میں مدد کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس سے غرباء کے مصائب میں اضافہ ہوتا ہے۔

تم عدل و انصاف کو کام میں لاؤ۔ تاکہ غرباء کو معلوم ہو جائے۔ کہ اُن کے لئے نیلگوں آسمان کے نیچے کوئی جائے پناہ ہے۔ ایک ارضی جنت ہے۔ جس کی لطیف فضاؤں سے وہ بھی متمتع ہو سکتا ہے۔ اس کا مرتبہ بلند کر دو۔ تاکہ اسے بھی معلوم ہو کہ امراء کی تعیش پسندی میں وہ بھی برابر کا شریک ہے۔

جس چیز نے ہیوگو کے دماغ کو حد سے زائد پریشان کیا جس مسئلہ نے ہیوگو پر راتوں کی نیند حرام کر دی۔ جس قانون نے اس کے قلم کو اعجاز بخشا۔ وہ سزائے موت کا خونی فتویٰ تھا۔

اس کے نزدیک وہ کتاب قانون کا سیاہ ترین ورق تھا۔ جس میں حقیقتہ طور پر موت کی سزا کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ ہیوگو فتوائے موت کو فرانسیسی مقننین کی عدل و انصاف کی رُو سے غداری بتاتا ہے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو دعوت مبارزت دیتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ ان کے پاس سزائے موت کے جواز میں جس قدر بھی دلائل و براہین ہیں۔ وہ اُن سے اسے آگاہ کریں۔ وہ لوگ جو سزائے موت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ دلائل پیش کرتے ہیں۔ کہ ایسے متنفس کا وجود جس نے مجلسی زندگی میں تلخی پیدا کی۔ قابل اخراج ہے۔ سب سے بہترین دلیل جو وہ پیش کرتے ہیں۔ وہ نظریہ

عبرت ہے۔ ہیوگو نظریہ عبرت کے خلاف مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے۔:-

"اگر ان مثالوں کی موجودگی میں بھی تم نظریہ عبرت کے قائل ہو۔ تو گردش ایام کا رخ ماضی کی طرف پھیر کر ہمیں سولھویں صدی عیسوی میں لے چلو حقیقت میں خوفناک بن جاؤ ہمارے لئے تکالیف و مصائب کے دروازے کھول دو۔ ازمنہ عتیق کی بربری سزائیں از سر نو رائج کردو ہر راہگذار پر تختہ دار کو نصب کردو۔ بدنی سزا کو عام کردو پیرس کے بازاروں میں دیگر دوکانداروں کی طرح ایک دوکان جلاد کی ہو جہاں انسانی گوشت پوست دیگر اجناس کی طرح فروخت ہو فنا کو بادۂ سر جام کرنے اور سزائے موت کو اس طرح عام کرنے سے۔ تم نظریہ عبرت کو زیادہ کامیاب بنا سکتے ہو"

ہیوگو تنسیخ سزائے موت کے معاشری اور مجلسی اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

میزان عقل میں بڑے بڑے جرم کو تولو تمہیں معلوم ہو جائیگا۔ کہ سوسائٹی کو اس چیز سے محروم کر دینے کا کوئی حق حاصل نہیں جسے وہ عطا نہیں کر سکتی۔

جنس انسان کیلئے تم موت کی سزا تجویز کرتے ہو۔ اسکی معاشری زندگی مندرجہ ذیل صورتوں میں ہو سکتی ہے۔

اولاً وہ شخص افراد خاندان اور صحبت احباب سے محروم ہے۔ اس صورت میں وہ صحیح تعلیم و تربیت حاصل نہیں کر سکا۔ جب اس کے دماغ کی اصلاح کیلئے کوئی سعی نہیں کی گئی تب تمہیں اس معاشری یتیم کے قتل کرنے کا کیا حق ہے؟

تم اسے اس لئے قتل کرتے ہو۔ کہ اس کا عہد طفولیت عالم نگہداشت کی نظر ہوا۔ تم اسے اپنے کئے کی سزا دیتے ہو۔ تم اس بدبخت کو جرم کا لباس پہناتے ہو۔

کیا تم اس وقت خوفزدہ نہیں ہوتے جب تم اس کے لڑکے اور لڑکیوں کا خیال کرتے ہو ——— ان بچوں کا جن سے زندگی کا سہارا چھین لیا گیا کیا تم محسوس نہیں کرتے۔ کہ آئندہ پندرہ برس میں بیٹا زندان میں ہوگا۔ اور بیٹی تعیش پسند

امرا کی نفسانی خواہش کے بھلنے کا ذریعہ ہوگی"۔

جسطرح ہیوگو نے غربا کے مصائب سے متاثر ہو کر "مصیبت زدگان" لکھی ٹھیک اسی طرح سزائے موت کے مجرم کے اندرونی احساسات اور قلبی کیفیات سے اثر پذیر ہو کر اس نے ایک کتاب The last days of Condemned. لکھی۔

کتاب کا انداز تحریر پڑھنے والوں کے دماغ سے گذر کر اُن کے دل پر منقش ہو جاتا ہے۔ کتاب فی الحقیقت ایک بین المِلّی المناک داستان ہے۔ قانون دان طبقہ اور فطرت انسانی سے دلچسپی لینے والے حضرات کو چاہئے۔ کہ وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔

میں نے ہیوگو کے اس شاہکار کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت میرے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ اولاً ہیوگو کا تنسیخ سزائے موت کا نظریہ۔ ثانیاً وطنی ادبیات کی خدمت۔ ممکن ہے۔ کہ میں اپنے موخرالذکر مقصد میں کامیاب نہ ہو سکوں بہرحال میں نے سعی ضرور کی ہے۔

سعادت حسن منٹو

دیباچہ از وکٹر ہیوگو

دیباچہ از مصنّف

جب یہ کتاب پہلی مرتبہ شایع ہوئی۔ تو اس کے سرورق پر مصنف کے نام کی جگہ ذیل کی چند سطور درج تھیں۔

اس کتاب کی تکمیل دو اسباب کی مرہونِ منت ہو سکتی ہے۔ اولاً کسی تباہ شدہ انسان کے احساسات مشاہدات اور مدرکات بوسیدہ کاغذات کی صورت میں دستیاب ہوئے ہوں جنہیں لفظاً لفظاً نقل کر دیا ہو۔ ثانیاً کسی حساس مفکر، شاعر یا فلسفی کے خیالات کا مجموعہ جن کے عمیق سمندر میں وہ برسوں غوطہ زن رہا۔ اور اس وقت تک چین نہ لیا جب تک اس کے افکار نے کتابی صورت اختیار نہ کر لی۔ ان دو اسباب میں کسی ایک کے ذہنی رشتہ کی استواری کا انحصار ناظرین پر ہے۔

کتاب کی پہلی اشاعت میں مصنف نے جو مجھے فکر کو آزادانہ بہنے سے عمداً باز رکھا

وہ تفہیم نظریہ کا منتظر تھا۔ ایسا ہی ہوا۔ مصنف اب تنسیخ سزائے موت کے سیاسی اور معاشری اسباب ادبی رنگ میں پیش کرتا ہے۔ وہ اس امر کا اعلان کرتا ہے۔ کہ سرگزشت اسیر سے اس کا مقصد سزائے موت کی تنسیخ ہے۔ اس کے پیش نظر کسی خاص مجرم کا تحفظ نہیں۔ وہ تمام مجرموں کی طرف سے وکالت کرتا ہے۔ خواہ وہ عہد حاضرہ کے ہوں۔ یا زمانۂ مستقبل کے۔ مصنف انسانی حقوق کو سب سے بڑی عدالت یعنی سوسائٹی میں پیش کرتا ہے۔ فتوے سزائے موت کے المناک تاثرات عدالت کی فصاحت میں گم ہو جاتے ہیں۔ زندگی اور موت کا سوال "یہ ایک واضح اور عیاں مسئلہ ہے۔ مجلس وکلا نے اس کی ہیئت کو تبدیل کر رکھا ہے۔ اس مسئلہ کو اس کے حقیقی قیام گاہ پر روز روشن میں دیکھنا چاہیئے۔ اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ عدالت کی جگہ تختۂ دار پر لگانا چاہیئے۔ اور اس امر پر غور کرتے وقت جج کی نسبت قاتل کا زیادہ خیال رکھنا چاہیئے۔

انہیں تاثرات کی تخلیق و تولید کے لئے اس نے یہ کتاب لکھی۔ اگر ان تاثرات سے متاثر ہو کر سوسائٹی مصنف کے نظریہ کو شرف قبولیت بخشے۔ تو اس سے زیادہ کامیابی کا اور کیا سہرا ہو سکتا ہے۔

اس خیال کے پیش نظر کہ اس کی وکالت اس کے نظریہ کی طرح زمان و مکان امصار و افراد کی تخصیص سے آزاد ہو۔ مصنف نے "سرگزشت اسیر" میں کسی خاص فرد۔ خاص مقام۔ خاص مجرم۔ خاص عدالت اور خاص جلاد کا ذکر نہیں کیا۔ اس نے جانفشانی کے ساتھ اپنے خیالات کو اس انداز میں پیش کیا ہے۔ کہ ہر ایک حساس قلب اس پر خون کے آنسو بہائے بغیر رہ سکے۔

وہ نہایت خوش ہوگا۔ اگر منصف نرم دل ہو کر مجرم کے احساسات قلب سے آشنا ہو جائیں۔

تین سال گزرے جب یہ کتاب پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ اس وقت لوگوں

میں اس تصنیف کے متعلق بحث کا بازار گرم تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا۔ کہ یہ کسی امریکی کی تصنیف ہے۔ بعض اسے برطانی کتاب سمجھ بیٹھے تھے۔ بعض کے نزدیک یہ کسی چینی مفکر کی رہین منت تھی۔ کس قدر ظلم ہے۔ کہ انسان اپنے پائیں باغ کی ندی کا سرچشمہ دریائے نیل کو قرار دے۔ یہ کتاب نہ امریکی ہے۔ نہ برطانی اور نہ چینی۔ مصنف نے سرگزشت اسیر کا تخیل ایسے مقام سے لیا۔ جسے آپ بارہا دیکھ چکے ہیں۔ جہاں پر آپ کے دماغ میں بھی ایسے ہی خیالات پیدا ہوتے۔ میری مراد "پیلس دی گریو" کا چوک ہے۔ جہاں تم پھانسی کا چبوترہ تعمیر کرتے ہو۔

اسی مقام پر مصنف کے ذہن میں سزائے موت کے ہولناک نتائج نے جگہ پکڑی۔ جب وہ اپنے مکان پر بیٹھا تماشائیوں کو مقتل کی طرف اندھا دھند بھاگتے دیکھتا۔ تب اس کا خیال مقتول کی طرف ہوتا۔ وہ اس کی مشکلات کا خاکہ کھینچتا۔ وہ خود کو مقتول تصور کرتا۔ تاکہ اس پر تدریجی مصائب واضح ہو جائیں۔ یہ المناک منظر صبح سے لیکر چار بجے شام تک جاری رہتا۔ جب پھانسی کا گھنٹہ بج چکتا۔ تب اس کے ذہن کو تھوڑا سا سکون حاصل ہوتا۔ اور وہ اپنے کام میں از سر نو مشغول ہوتا۔ "ال بیک" کے واقعہ قتل کے بعد اس نے یہ تصنیف شروع کی۔ اس تصنیف کی ابتداء کے بعد وہ سمجھتا۔ کہ مقتل میں اس کا کوئی حصہ نہیں بلکہ وہ اس کے خلاف صدا اٹھا رہا ہے۔ یہ محسوس کر کے اُسے ایک گونہ تسلی ہوتی۔

اس کے پیش نظر اس کے سوا کچھ نہیں کہ سزائے موت کا وجود دنیا سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔ اور اس کی خواہش ہے۔ کہ اقوام عالم کے روشن دماغ اور معلم اس کی اس خواہش کی تکمیل کے لئے کوشاں ہوں۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ اس شجر کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ جسے انقلاب بھی تباہ نہیں کر سکتا۔ مصنف بھی تختۂ دار کو سطح زمین کے ساتھ ہموار کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا

ہے۔ اس تختۂ دار کو جو مسیحیت کی گذشتہ صدیوں سے نصب ہے۔ اندر جب آج سے ستر سال پیشتر "نکرپا" نے تباہ کرنے کی کوشش کی۔ ہم نے ابھی عرض کیا۔ کہ صرف تختۂ دار ہی ایک ایسی ہولناک چیز ہے جسے انقلاب بھی فنا نہیں کر سکا۔ اگرچہ کلید انقلاب قفل زیست کو وا کرتی ہے۔ اور وہ اپنے ساتھ قحط، زلزلے اور بجلیاں لاتا ہے تاہم سب کی تخریب میں تعمیر کا راز مضمر ہوتا ہے۔ لیکن انقلاب بھی "سزائے موت" کو موت کے گھاٹ نہیں اتار سکا۔

ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ صرف جولائی کا انقلاب ہی ایسا انقلاب تھا۔ جس نے موت کی سزا کو یک قلم موقوف کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ موجودہ در اصلاحی تحریک کا نتیجہ تھا جس نے لوئی پانزدہم، رسکو اور روبس پیری کے خونیں قوانین کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۸۳۰ء کے انقلاب نے ۱۷۸۹ء کی خون آشام تلوار کو نیام میں کر دیا۔

اگست ۱۸۳۰ء میں ہم متوقع تھے۔ کہ من جملہ تجربہ محبوب کے سزائے موت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ کیونکہ اس وقت شرافت و تہذیب کی لہر عام لوگوں میں دوڑ رہی تھی۔ لیکن چند ہفتوں بعد ہمیں ناکام ہونا پڑا حقیقی آزادی کی طرح سزائے موت کی تنسیخ بھی ناممکنات میں سے تھی۔

اکتوبر ۱۸۳۰ء میں جب فرانسیسیوں نے اپنے بطل عظیم نپولین کی لاش کو سرزمین فرانس میں دفن کیا۔ سزائے موت کا مسئلہ چیمبر میں پیش ہوا۔ دو دن تک اس مسئلہ کے متعلق گرما گرم بحث جاری رہی فریقین نے فصاحت کے دریا بہا دیئے۔ اس بحث کا موضوع کیا تھا؟ تنسیخ سزائے موت! انکار یا اقرار! واقعہ یہ ہے۔

چار افراد نے .... سیاسیات کے اعلیٰ مدارج اور ...... اس نکتہ تک پہنچنے کی کوشش کی جسے بیکن جرم اور بیچارگی "ہم قرار دیتا ہے۔

خیر اجرم ہو یا ہم قانون موت کی سزا دیتا ہے۔ اب چار دل بد بخت قیدی تھے۔ سقافتی مجرم جن کی حفاظت پر تین سو سپاہی متعین تھے۔ اب کیا ہونے والا تھا؟ انہیں زندان کی گاڑی میں مقتل کی طرف جو ہجوم سے پرے کھلے جانا مشکل تھا۔ ان چار افراد کے نام کے اظہار کی ضرورت نہیں ——— چار افراد ہمارے زمانے کے ہیں۔ سزائے موت کی تنسیخ کے مسئلہ پر غور کرنے کیلئے چیمبر کا اجلاس منعقد ہوا۔

دیکھئے حضرات! کل تک یہی لوگ تنسیخ سزائے موت کو محض ایک خیالی شئے تصور کرتے تھے۔ اس سے قبل بارہا ان کی توجہ دار و رسن کی طرف مبذول کرائی گئی۔ یہ امر کتنا تعجب انگیز ہے۔ کہ آناً فاناً ان کے دماغوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا۔

یقیناً ان کے پاس مشتعل ہونے کیلئے کافی ذرائع تھے۔ وہ سزائے موت کے خاتمہ کیلئے بحث نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ اپنے ذاتی مفاد کیلئے بہت کچھ کر رہے تھے۔ اس طرح خود غرضی اور جاہ طلبی سے انہوں نے مجلسی زندگی کو مسموم کر رکھا تھا۔

ہمارے لئے اس امر کا اعلان ضروری ہے۔ کہ ہمارا تعلق ان افراد سے نہ تھا۔ جو ان چار وزراء کی موت کے خواہاں تھے جب وہ زندان میں اسیر کئے گئے۔ اس وقت دوسرے لوگوں کی طرح ہمارے قلب میں بھی ان کے لئے ہمدردی کے جذبات موجزن تھے۔ ہماری انتہائی خواہش تھی۔ کہ انہیں موت کے گھاٹ نہ اتارا جائے۔ بلکہ ان کی زندگیوں کو محفوظ رکھنے کیلئے خود کو تکالیف میں ڈالنے کیلئے تیار تھے۔

اگر تختہ دار پیرس میں نصب کیا جاتا۔ تو اس کے خلاف اسی قدر پر زور مظاہرہ ہوتا۔ کہ اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہوتا ان مظاہرے کرنے والوں میں ہم پیش پیش ہوتے۔

میں اس امر کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔ کہ سیاسی اختلافات کی بنا پر سزائے موت عوام کو بہت زیادہ مشتعل کرتی ہے۔ اس کے نتائج تباہی، بربادی اور خون آشامی

کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔ ہم سیاسی اور نفسیاتی بنا پر ان لوگوں کی جماعت میں داخل تھے جو ان وزراء کی جان بخشی کے خواہاں تھے۔

زمانۂ انقلاب میں اڈیلیس مرسے خبردار ہو جسے تم تن سے جدا کر رہے ہو۔ یہ فعل ہی لوگوں کو مشتعل کرنے کیلئے بہت کافی ہوتا ہے۔

ہماری خواہش تھی۔ کہ مجلس میں ان کے متعلق غور و فکر ہونے کے بعد سزائے موت کا فتوٰی کو منسوخ کر دیا جاتا۔

کیا انہوں نے کبھی جرائم کے اسباب پر غور کیا ہے؟ ان کی نگاہیں۔ ان کے اسباب و علل سے بالکل ناآشنا ہیں۔ آہ! غربا بھوک سے تنگ آکر چوری کرتے ہیں۔ اور چوری ہی تمام نتائج کو پیدا کرتی ہے۔ غریب اور لاوارث بچے جن کی پرورش سے انسانیت غافل ہے۔ ۱۲ سال کی عمر میں جیبوں کو آباد کرتے ہیں۔ ۱۸ سال میں وہ عبور دریائے شور کی سزا پاتے ہیں۔ اور ۴۵ سال کی عمر میں وہ تختۂ دار پر لٹکا دیئے جاتے ہیں۔

آہ! برگشتہ بخت جنہیں تم بیدار بخت بنا سکتے ہو۔ ان کا کوئی پرساں حال نہیں۔ سزائے موت کی تنسیخ سے تم نوع انسان کو ممنون احسان بنا سکتے ہو۔ تمہیں ایسا ضرور کرنا چاہئے۔ خواہ تم ذاتی طور پر اس میں دلچسپی نہیں لیتے تمہارا یہ فعل سیاسی مراعات سے ارفع و اعلیٰ ہوگا۔ تم عوام کی مجلسی اور معاشرتی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہو۔

سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ قوانین ساز تہذیب و تمدن کو کیا سمجھتے ہیں؟ ہمارا تنزل اور انحطاط قابل رحم ہے۔ عدل و انصاف نے دجل و فریب کا جامہ پہن رکھا ہے۔ قانون ایک مضحکہ خیز امر ہو چکا ہے۔

جس شخص کو تم موت کی سزا دیتے ہو۔ اس کے متعلق علی الصبح بازاروں اور کوچوں میں اعلان کیا جاتا ہے۔ اس کے سوانح حیات جرم، سزا اور اس کی تکالیف کا اخبار میں توسیع اشاعت کی غرض سے ذکر کیا جاتا ہے۔ کیسی خوفناک تجارت ہے وہ سکھ جو

کے ہاتھ تک پہنچتا ہے۔ خون آلودہ ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سزائے موت کے لرزہ براندام نتائج

سزائے موت !!!

آہ! کس قدر المناک!

سزائے موت کے جواز میں آپ کے پاس جس قدر بھی دلائل وبراہین ہیں۔ ان سے ہمیں آگاہ کریں۔

میں نہایت متانت سے دریافت کرتا ہوں۔ کہ اس کا جواب دیا جائے۔ میرا روئے سخن متقنین کی طرف ہے۔ مجھے دماغی عیاشوں سے کوئی سروکار نہیں۔

بعض افراد سزائے موت کو دیگر مسائل کی طرح خلاف قیاس، اور بعید العقل تصور کرتے ہیں۔ اور بعض سزائے موت کی تنسیخ پر صرف اس لئے زور دیتے ہیں۔ کہ انہیں اس سے نفرت ہے۔ بعض اصحاب کے نزدیک یہ صرف ادبی مسئلہ ہے۔ میں ایسے لوگوں سے مخاطب نہیں ہوں معترلین اور منطقیون اور فقہا کی عنان توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہوں۔ ان لوگوں کی توجہ جن کے نزدیک سزائے موت جائز ہے۔

انہیں اپنے دلائل پیش کرنے چاہئیں۔

قانون دان اصحاب کا ایک طبقہ سزائے موت کو جائز قرار دیتے ہوئے مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتا ہے:۔

اولاً مجلسی دائرے سے ایسے متنفس کا وجود قابل اخراج ہے۔ جس نے مجلسی زندگی میں تلخی پیدا کی۔ اگر اسے زندہ چھوڑ دیا گیا تو سوسائٹی کو اس سے مزید نقصان کا احتمال ہے۔ اگر یہی ہے۔ تو میرے خیال میں حبسِ دوام کافی ہے۔ سزائے موت کے کیا معنی!

تم کہتے ہو کہ قیدی جیل سے فرار ہو جائیگا۔ اس کی خوب نگہداشت کرو۔ آہنی سلاخیں تنہائی کو تلخ بنانے کیلئے کافی ہیں۔ اور جب کہ محافظ جیل کا وجود کافی ہے۔ تو جلاد کی

کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن وہ جواب دیتے ہیں۔ "سوسائٹی کو ضرور انتقام لینا چاہئے سوسائٹی ضرور سزا دے۔"

انتقام ایک انفرادی فعل ہے سزا کا اختیار صرف خدا کو ہے۔ سوسائٹی کا راستہ انتقام اور سزا کے درمیان ہے۔ سزا اس دائرۂ اقتدار سے باہر ہے۔ انتقام سوسائٹی کے شایان شان نہیں۔ سوسائٹی کو انتقام کیلئے سزا نہیں دینی چاہئے بلکہ اسے مجرموں کی اصلاح کرنی چاہیئے۔

سب سے آخری دلیل "نظریہ عبرت" ہے۔

"ہمیں نظریۂ عبرت کیلئے مثالیں قائم کرنی چاہئیں، وہ سزائیں جو مجرموں کو دی جاتی ہیں۔ ان لوگوں کو خوفزدہ کرتی ہیں، جن کے آغوشِ اذہان میں جرائم پرورش پاتے ہیں۔"

خوب! سب سے اول ہم نظریۂ عبرت کے امکانات سے انکار کرتے ہیں۔ سربازار سزائے موت سے بیان کردہ تاثرات نہیں ہوتے۔ بلکہ جمہور کے دماغوں پر ایسے ہولناک مناظر سے خطرناک اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے احساسات اور حسیات قسب مجروح ہوتے ہیں۔ ان کے اخلاق پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ ہمارے پاس متعدد مثالیں موجود ہیں۔ جن سے ہم اپنے آراء کی تائید و حمایت کر سکتے ہیں۔ فی الحال ہم صرف ایک پر اکتفا کریں گے۔

آج سے ٹھیک دس روز قبل جب لوئی کاس کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا۔ تو ایک جم غفیر نے اس بے حس لاش کے گرد، گردمجنونانہ رقص سے اظہار انبساط کیا.... نظریۂ عبرت!

اگر ان مثالوں کی موجودگی میں بھی تم "نظریہ عبرت" کے قائل ہو۔ تو گردش ایام کا رُخ ماضی کی طرف پھیر کر بیس سولھویں صدی عیسوی میں لے چلو حقیقت میں خوفناک بن جاؤگے۔ ہمارے لئے تکالیف و مصائب کے دروازے کھول دو ہر رہگذر پر تختہ دار نصب کردو بدنی سزا کو عام کردو۔ پیرس کے بازاروں میں اور دوکانداروں کی طرح ایک دوکان جلادکی ہو جہاں انسانی گوشت پوست دیگر اجناس کی طرح فروخت ہو

فنا کو بادہ ہرجام کرنے اور سزائے موت کو اس طرح عام کرنے سے تم نظریہ عبرت کو زیادہ کامیاب بنا سکتے ہو۔

کیا تمہیں اس امر کا یقین ہے۔ کہ جب تم شہر سے بہت دور ایک غیر آباد حصہ میں ایک انسان کو موت کے گھاٹ اتارتے ہو اس وقت تمہارے پیش نظر بھی نظریہ عبرت ہوتا ہے؟

دن کے وقت ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن علی الصبح تمہیں کسے سبق دینا مقصود رہے کس کے لئے مثال قائم کی جاتی ہے۔ غالباً حجر وشجر کو خوفزدہ کیا جاتا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ مجرموں کو "سزائے جرم" تخلیہ میں دی جاتی ہے۔ کیا تم سزائے موت سے خائف ہو یا ہجوم کی ذہنیت سے ہراساں؟

میزانِ عقل میں بڑے سے بڑے جرم کو تولو۔ تمہیں معلوم ہو جائیگا۔ کہ سوسائٹی کو اس چیز سے محروم کر دینے کا کوئی حق حاصل نہیں جسکو وہ عطا نہیں کر سکتی۔

جس انسان کیلئے تم موت کی سزا تجویز کرتے ہو۔ اس کی معاشری زندگی کی ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اوّلاً وہ شخص افراد خاندان اور صحبت احباب سے محروم ہے اس صورت میں وہ صحیح تعلیم و تربیت حاصل نہیں کر سکا جب اسکے دل و دماغ کی اصلاح کیلئے کوئی۔

سمی نہیں کی گئی۔ تب تمہیں اس معاشری یتیم کے قتل کرنے کا کیا حق ہے؟ تم اسے اسلئے قتل کرتے ہو۔ کہ عہد طفولیت عدم نگہداشت کی نذر ہؤا۔ تم اسے اپنے کئے کی سزا دیتے ہو۔ تم اس بدبخت کو جرائم کا لباس پہناتے ہو۔

اس نے جہالت کی گود میں ـــــ پرورش پائی۔ یہ اس کی تقدیر کا قصور ہے۔ وہ بالکل بے گناہ ہے ـــــ تم ایسے انسان کا خاتمہ کرتے ہو جو بالکل معصوم تھا۔ تم معصومیت کو تختۂ دار پر لٹکاتے ہو۔

ثانیاً وہ انسان جسے تم نے موت کی سزا دی۔ وہ اہل وعیال رکھتا ہے۔ ایک خاندان کا فرد ہے۔ کیا اس صورت میں تم صرف ایک انسان کو زندگی سے محروم کرتے ہو؟ نہیں! تم اسے موت کی سزا دیتے وقت اس کے افراد خاندان کے آسمان امید پر ادبار کے سیاہ بادل پیدا کرتے ہو۔ اس صورت میں تم معصوموں کو سزا دیتے ہو۔ معصومیت پھر تمہاری نوحہ خوانی کرتی ہے۔

سزائے موت کو تم خواہ کسی رنگ میں جامہ پہناؤ اس کا وار صرف معصومیت پر ہی ہوگا۔

ایسے مجرم کو حبس دوام کی سزا دو کیونکہ تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بھی وہ اپنے لواحقین کیلئے سامان زیست پیدا کر سکتا ہے لیکن وہ مرقد کی گہرائیوں سے ان کی معاونت کیسے کر سکتا ہے!

کیا تم اس وقت خوفزدہ نہیں ہوتے جب تم اس کے لڑکے اور لڑکیوں کا خیال کرتے ہو؟ ـــــ ان بچوں کا خیال جن سے زندگی کا سہارا چھین لیا گیا ہے۔

کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ آئندہ پندرہ برس میں بیٹا زندان میں ہوگا۔ اور بیٹی عیش پسند امراء کی نفسانی خواہش کے بجھانے کا ذریعہ ہوگی؟

کیا تم نے کبھی اس کی روح کے متعلق غور کیا!

کیا تم اس کی زمانی اور مکانی کیفیت سے آگاہ ہو؟

بعض منطق پرست حضرات کے نزدیک یہ ایک جذباتی اور ہنگامی دلیل ہوگی کیونکہ وہ ذہنی براہین کے قائل ہوتے ہیں۔ میں دماغ کی نسبت دل کا زیادہ قائل ہوں۔ جلیل احساس اور تجربہ ہماری حمایت پر ہیں۔

جن ممالک میں سزائے موت منسوخ ہو چکی ہے۔ وہاں وارداتِ قتل ہر سال کم ہوتی جاتی ہیں۔ اس وزنی دلیل کی اہمیت کا اندازہ لگاؤ۔

زمانہ خود بخود اس مسئلہ کو حل کر دیگا۔ گذشتہ صدی سے سزاؤں میں نرمی کا دخل ہو چکا ہے۔ خونی سزا قریباً منسوخ ہو چکی ہے۔ اس خلاف عقل سزا سے فرانس کو عنقریب نجات حاصل ہوگی۔

ازمنہ عتیق میں معاشری قصر تین ستونوں یعنی پرومہت، بادشاہ اور جلاد پر استوار تھا مدت ہوئی کہ ایوان انسانیت کے دریچوں سے یہ صدا آئی "پرومہت رخصت ہو چکے ہیں"۔ ازاں بعد ایک اور آواز آئی "بادشاہ رخصت ہو گئے"۔ اب تیسری آواز بلند ہونیکا وقت ہے جو بانگ دہل اعلان کر دے "جلاد کو نکال دو"۔

وہ جنہیں پرومہت کے رخصت ہونے کا غم ہے۔ ہم ان سے کہتے ہیں۔ کہ خدا موجود ہے۔ جو بادشاہ کے خاتمہ پر افسوس ظاہر کرتے ہیں۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ ہمارا ملک موجود ہے۔ جنہیں جلاد کے رخصت ہونیکا رنج ہوگا۔ ان کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔۔۔

تختہ دار کی قطع و برید سے ہمارے معاشری نظام میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑے گا۔ معاشری نظام کا سنگ بنیاد تختہ دار نہیں ہو سکتا۔ تمدن ایک تغیر پذیر سلسلہ ہے جس میں تمہاری معاونت چاہتا ہوں۔ کیسی مسئلہ ہیں! تبدیلی قوانین ہیں مسیح کے اخلاقی قوانین انسانوں پر پھر حکمران ہوں گے وقت آنیوالا ہے جب ہم جرم کو مرض تصور کریں گے۔ اور جیل کی جگہ ان امراض کے دفع کرنے والے ڈاکٹر ہوں گے زندانوں کی جگہ شفاخانے ہونگے۔ افق پر اخوت و محبت کا آفتاب طلوع ہوگا۔

۱۵ مارچ ۱۸۳۱ء

فرہنگِ متعلقہ المیہ

افراد

۱ مادام وی بلنول
۲ عسکری
۳ ارگاسطے
۴ مرثیہ گو
۵ فلسفی
۶ مرد فربہ
۷ مرد لاغر
۸ خاتون
۹ خادم

ایک کمرہ!

مرثیہ گو شاعر اپنا کلام سنا رہا ہے۔

....

....

....

دوسرے دن میدان میں نقش پلٹے یار نظر آیا

باوفا کتا دریا کے کنارے سراپا انتظار تھا

واپسی پر حسینہ کی آنکھیں نم آلود تھیں

از منۂ قدیم کی یادگار — قلعہ سے وہ کسی کو

نمناک آنکھوں سے دیکھ رہی تھی،

لیکن خوش الحان مطرب کی صدا

ہاں اسی آتش نفس مغنی کی صدا

صحرائی فضاؤں میں گم تھی

جملہ حاضرین:۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیسے بلند شعر ہیں

مادام دی بلبول:۔ مقطع کے شعر میں ناقابلِ بیان اسرار ہے جو آنکھوں میں بے

آنسو بے آتا ہے۔

مرثیہ گو:۔ اصل واقع ابھی پنہاں ہے۔

عسکری:۔ (وجدانی حالت میں) مطرب —— اور صبا کیسے رومان انگیز ہیں۔

مرثیہ گو —— لیکن رومان کی حد سے تجاوز نہیں۔

عسکری:۔ میں ان رومان آفریں اشعار کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا میں ان اشعار کی خاطر دنیا بھر کے رومان آفریں اشعار قربان کرنے کو تیار ہوں۔

عسکری:۔ لیکن جنٹل فرانسیسی لفظ نہیں۔ ہم کیسٹل لکھتے ہیں۔

یکے از حاضرین:۔ دیکھئے جناب ہم فرانسیسی میں جنٹل نہیں لکھتے بلکہ گاتھک۔

مرثیہ گو۔ گاتھک شعر میں مستعمل نہیں۔

یکے از حاضرین:۔ آہ! معانی میں اختلاف ہے۔

مرثیہ گو:۔ جناب میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ جو فرانسیسی زبان کو اشعار میں لا کر اس کی اصلی صورت کو مسخ کر دیتے ہیں۔ اور ہمیں رونزرڈ اور ہرٹری بیوف کے زمانے میں لے جاتے ہیں۔ میں رومان پسند ہوں۔ لیکن درجہ اعتدال تک اسی طرح جذباتی شاعری میں بھی۔

میں لطیف اور اندوہ آگین اشعار پسند کرتا ہوں۔ لیکن خونی اور سفاکانہ اشعار سے مجھے نفرت ہے۔ میں جانتا ہوں۔ کہ دنیا میں ایسے احمق ہیں۔ جو انہیں خیالات کی اشاعت سے —— ٹھہریئے! کیا آپ نے وہ نیا ناول دیکھا ہے؟

خواتین:۔ کونسا ناول؟

مرثیہ گو:۔ سرگزشت اسیر یا پھانسی!!

مرد فربہ:۔ بس بس مجھے معلوم ہے۔ کہ آپ کیا کہنے والے ہیں۔ اس کتاب کا سرورق ہی لرزہ بر اندام کر دیتا ہے۔

مادام ڈی بلیتول :- بعینہ یہی حال میرا ہے۔ بہت خطرناک کتاب ہے۔ وہ اِ میرے پاس اتفاقاً موجود ہے۔

خواتین :- دکھلیئے تو! دکھلیئے تو!

(کتاب دست بدست ہر ایک کے پاس پہنچتی ہے)

ایک خاتون :- (کتاب کا نام پڑھتی ہے) "سرگذشت اسیر یا پھانسی"!!!

مرد فربہ :- مادام خدا کے لیئے!!

مادام ڈی بلیتول :- اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ یہ کتاب بہت خوفناک ہے۔ یہ پڑھنے والوں کو بیمار کر دیتی ہے۔ اور ان کی خوابوں میں ڈراؤنی صورت میں نمودار ہو کر اُن پر نیند حرام کر دیتی ہے۔

ایک خاتون :- بس اسے ضرور پڑھوں گی۔

مرد فربہ :- ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ تمدن دن بدن رُو بہ تنزل ہے میرے خدا! ایک مجرم جسے موت کی منزل چکی ہو۔ اُسکی آخری لمحات کی کیفیت اور اس کی جسمانی تکالیف کا بیان کس قدر مہمل خیال ہے۔ کیا یہ خیال قابل نفرت نہیں؟ معزز خواتین! کیا آپ کو یقین ہے۔ کہ مصنّف نے سزائے موت پر بحیثیت ایک مصلح کے بحث کی ہے۔

عسکری :- یہ فی الحقیقت بیہودگی کی بہترین مثال ہے؟

مادام :- اس کا مصنّف کون ہے؟

مرد فربہ :- کتاب کی پہلی اشاعت میں سرورق پر مصنّف کا نام موجود نہ تھا۔

مرثیہ گو :- یہ وہی مصنّف ہے جو اس سے قبل دو ناول اور بھی لکھ چکا ہے میرے ذہن سے ان کے نام محو ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ٹھیک کتاب کا آغاز مارگ سے ہوتا۔ اور انجام تختۂ دار پر

کتاب کے ہرباب سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا ایک دیو بچہ کو نگلنے جا رہا ہے۔

مرد فربہ :۔ کیا وہ کتاب آپ کی نظروں سے گذری ہے!

مرثیہ گو :۔ ہاں جناب! واقعہ کا محل وقوع برفستان تھا!

مرد فربہ :۔ برفستان ـــــ کس قدر خوفناک ہے!

مرثیہ گو :۔ دوسری کتاب میں قصائد اور رزمیہ اشعار ہیں ۔ ان کے علاوہ اور بہت کچھ ہے۔ کتاب میں ان دیوؤں کا ذکر ہے جو انسانی گوشت پر زندہ رہتے ہیں

عسکری (مسکراتے ہوئے) اس کے اشعار وجد آفریں ہوں گے۔

مرثیہ گو :۔ اس نے ایک تمثیل بھی لکھی ہے ۔ وہ اسے تمثیل کہتا ہے۔ جس میں یہ خوبصورت جملہ مندرج ہے :۔

کل پچیس جون ایک ہزار چھ سو ستاون عیسوی ـــــــ

یکے از حاضرین :۔ واہ! واہ کیا خوبصورت شعر ہے!

مرثیہ گو :۔ معزز خواتین! یہ شعر ہندسوں میں لکھا جا سکتا تھا۔

کل ۲۵ جون سنہ ۱۶۵۷ء ـــــــ

وہ مسکراتا ہے ـــــــ سب ہنستے ہیں۔

عسکری :۔ یہ موجودہ زمانے کی عجیب و غریب شاعری کا نمونہ ہے۔

مرد فربہ :۔ شعر و شاعری سے اسے کیا نسبت ـــــ کیا نام ہے اس کا!

مادام :۔ ایک ناپاک انسان

مرد فربہ :۔ قابل نفرت ہستی۔

ایک جوان خاتون :۔ ـــ ایک صاحب جو اسے جانتے ہیں ۔ انہوں نے مجھ سے کہا ـــــ

مرد فربہ :۔ تم انہیں جانتی ہو جو اسے جانتا ہے؟

جواں خاتون :- جی ہاں! انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ ایک سادہ مزاج اور تنہائی پسند جو اپنا بیشتر وقت اپنے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں بسر کرتا ہے۔

مرثیہ گو :- اور آغوش شب میں سیاہ ترین خیالات کی پرورش کرتا ہے۔ مجھے اتفاقیہ ایک شعر کے مطالعہ کا موقع ملا جس میں اس نے انہیں تنگ و تار خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مرد فربہ :- تم کہتی ہو۔ کہ اس کے بچے ہیں۔ ناممکن! خاتون جب اس نے ایسی خوفناک کتاب لکھی ہو۔

یکے از حاضرین :- آخر اس کتاب کا مقصد۔

مرثیہ گو :- میں کیونکر جانوں۔

فلسفی :- کتاب کا مقصد تنسیخ سزائے موت ہے۔

مرد فربہ :- میرے نزدیک اس کا مقصد دہشت آفرینی ہے۔

مسخری :- چہ خوب! گویا جلاد سے مبارزت ہے۔

مرثیہ گو :- اس کے نزدیک تختۂ دار ہی تمام مصائب کا سرچشمہ ہے۔

مرد فربہ :- ہرگز نہیں! تنسیخ سزائے موت کے مسئلہ پر صرف چند سطور میں بحث کی گئی ہے۔ کتاب کا باقی حصہ جذباتی ہے۔

فلسفی: اس موضوع پر کتاب لکھتے وقت دلائل اور براہین پیش نظر ہونے چاہئیں منطق کے دامن کو ہاتھ سے کبھی نہ کھونا چاہیئے۔ میں نے کتاب کا مطالعہ کیا۔ فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے کتاب مہمل اور ناقص ہے۔ تمثیل یا ناول کے دائرہ سے سزائے موت کی بحث خارج ہے۔

مرثیہ گو :- بلند اخراقات کا! کیا یہ فن کاری ہے؟ میں نہیں جانتا۔ کہ مجرم کون ہے اس نے کیا کیا؟ میری طرح اور بھی تو کوئی نہیں جانتا۔ شاید وہ بدمعاش ہو۔

کتاب کے ہر باب سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا ایک دیوچہ کو لگنے جا رہا ہے۔

مرد فربہ:۔ کیا وہ کتاب آپ کی نظروں سے گذری ہے!

مرثیہ گو:۔ ہاں جناب! واقعہ کا محل وقوع برفستان تھا!

مرد فربہ:۔ ——— برفستان ——— کس قدر خوفناک ہے!

مرثیہ گو:۔ دوسری کتاب میں قصائد اور رزمیہ اشعار ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت کچھ ہے۔ کتاب میں ان دیوؤں کا ذکر ہے جو انسانی گوشت پر زندہ رہتے ہیں

عسکری:۔ (مسکراتے ہوئے) اس کے اشعار وجد آفریں ہوں گے۔

مرثیہ گو:۔ اس نے ایک تمثیل بھی لکھی ہے۔ وہ اسے تمثیل کہتا ہے۔ جس میں یہ خوبصورت جملہ مندرج ہے:۔

کل پچیس جون ایک ہزار چھ سو ستاون عیسوی ———

یکے از حاضرین:۔ واہ! واہ کیا خوبصورت شعر ہے!

مرثیہ گو:۔ معزز خواتین! یہ شعر ہندسوں میں لکھا جا سکتا تھا:۔

کل ۲۵ جون ۱۶۵۷ء ———

وہ مسکراتا ہے ——— سب ہنستے ہیں۔

عسکری:۔ یہ موجودہ زمانے کی عجیب وغریب شاعری کا نمونہ ہے۔

مرد فربہ:۔ شعر و شاعری سے اسے کیا نسبت ——— کیا نام ہے اس کا!

مادام:۔ ایک ناپاک انسان

مرد فربہ:۔ قابل نفرت ہستی۔

ایک جوان خاتون:۔ ——— ایک صاحب جو اسے جانتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ———

مرد فربہ:۔ تم انہیں جانتی ہو۔ جو اسے جانتا ہے؟

جوان خاتون :- جی ہاں! انہوں نے مجھ سے کہا۔ کہ وہ ایک سادہ مزاج اور تنہائی پسند جو اپنا بیشتر وقت اپنے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں بسر کرتا ہے۔

مرثیہ گو :- اور آغوشِ شب میں سیاہ ترین خیالات کی پرورش کرتا ہے۔ مجھے اتفاقیہ ایک شعر کے مطالعہ کا موقع ملا جس میں اس نے انہیں تنگ و تار خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مرد فربہ :- تم کہتی ہو۔ کہ اس کے بچے ہیں۔ ناممکن! خاتون جب اس نے ایسی خوفناک کتاب لکھی ہو۔

یکے از حاضرین :- آخر اس کتاب کا مقصد۔

مرثیہ گو :- میں کیونکر جانوں۔

فلسفی :- کتاب کا مقصد تنسیخ سزائے موت ہے۔

مرد فربہ :- میرے نزدیک اس کا مقصد دہشت آفرینی ہے۔

عسکری :- چہ خوب! گویا جلاد سے مبارزت ہے۔

مرثیہ گو :- اس کے نزدیک تختۂ دار ہی تمام مصائب کا سرچشمہ ہے۔

مرد فربہ :- ہرگز نہیں! تنسیخ سزائے موت کے مسئلہ پر صرف چند سطور میں بحث کی گئی ہے۔ کتاب کا باقی حصّہ جذباتی ہے۔

فلسفی :- اس موضوع پر کتاب لکھتے وقت دلائل اور براہین پیشِ نظر ہونے چاہئیں منطق کے دامن کو ہاتھ سے کبھی نہ کھونا چاہئیے۔ میں نے کتاب کا مطالعہ کیا۔ فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے کتاب مہمل اور ناقص ہے۔ تمثیل یا ناول کے دائرہ سے سزائے موت کی بحث خارج ہے۔

مرثیہ گو :- چند اخراقات کا! کیا یہ فن کاری ہے؟ میں نہیں جانتا۔ کہ مجرم کون ہے اس نے کیا کیا۔ میری طرح اور بھی تو کوئی نہیں جانتا۔ شاید وہ بدمعاش ہو۔

کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں۔ کہ وہ میرے لئے اس چیز میں مذاق پیدا کرے جسکا مجھے علم ہی نہیں۔

مرد فربہ :- مصنف کو یہ بھی اختیار نہیں۔ کہ وہ ایک مجرم کی جسمانی تکالیف سے ہمیں خوفزدہ کرے ہیں کسی المناک حادثہ یا کسی شخص کو اپنے ہاتھوں سے اپنی جان تلف کرتے ہوئے دیکھ کر اتنا متاثر نہیں ہوتا۔ جتنا ایک کتاب پڑھنے سے ـــــ ایک ناول کا مطالعہ تمہیں لرزہ براندام کر سکتا ہے۔ راتکی نیند تم پر حرام کر سکتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد میں دو روز تک صاحبِ فراموش رہا۔

فلسفی :- فی الحقیقت یہ ایک لغو اور بیہودہ کتاب ہے۔

مرثیہ گو :- (طنزاً) کتاب! کتاب!

فلسفی :- جیسا کہ آپ نے پہلے ارشاد فرمایا۔ یہ کتاب کسی اصلیت پر مبنی نہیں۔ میں خشک مضامین کا دلدادہ ہوں۔ لیکن اس کتاب کا کوئی کردار بھی میری طبع کے موافق نہیں۔ طرزِ تحریر بھی ناقص ہے۔
کیا آپ میرے ساتھ متفق ہیں۔

مرثیہ گو :- بے شک! بے شک!

فلسفی :- مجرم کا کردار دلچسپی سے خالی ہے۔

مرثیہ گو :- وہ دلچسپ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ اس کا دامن گوناگون جرائم سے رنگین ہے۔ میں اسے مختلف صورت میں پیش کرتا۔ میں اپنے مجرم کی سرگذشت کو یوں بیان کرتا ہے۔ اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ـــــ اعلیٰ تعلیم ـــــ محبت ـــــ رقابت ـــــ ناکردہ گناہ ـــــ تاسف

چونکہ انسانی قوانین پیچیدہ ہیں۔ اسلئے اسے موت کی سزا دی جاتی ہے تب اور تب میں سزائے موت کے مسئلہ پر بحث کرتا۔

مادام :- واہ ! واہ !

فلسفی :- معاف کیجئے ۔ آپ کے خیال کے مطابق بھی کتاب بے معنی ہے ۔ ایک خاص حلوہ سب کو یکساں متاثر نہیں کر سکتا ۔

مرثیہ گو :- بہت خوب ! بہتر تھا کہ کتاب میں کسی ہیرو کا تذکرہ ہوتا ۔ مثلاً مالش اربی ۔

متقی :- مالش اربی کے آخری لمحات تب مصنف ہمارے سامنے ایک اچھا واقعہ پیش کرنے میں کامیاب ہو سکتا ۔

میں شور مچاتا چیخ و پکار کرتا ۔ مالش اربی کے ساتھ خود بھی تختۂ دار پر لٹکنے کیلئے تیار ہو جاتا ۔

فلسفی :- میں ہرگز تیار نہ تھا ۔

عسکری :- میں بھی ہرگز نہ ہوتا ۔ آپ کا مالش اربی ایک انقلابی تھا ۔

فلسفی :- مالش اربی کی موت سزائے موت کے خلاف کوئی دلیل بہم پہنچاتی ہے ۔

مرد فربہ :- سزائے موت ! ہم اس غلجان میں کیوں مبتلا ہیں ۔ آپ کا اس نے کیا بگاڑا ہے ۔ اس کتاب کا مصنف غیر تربیت یافتہ معلوم ہوتا ہے ۔

مادام :- یقیناً وہ سنگ دل ہوگا ۔

مرد فربہ :- وہ ہمیں مجبور کرتا ہے ۔ کہ ہمیں زندان اور تختۂ دار کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھیں ۔ یہ ہماری طبیعتوں کے ناموافق ہے ۔ ہم جانتے ہیں ۔ یہ مقام بہت غلیظ ہیں ۔ لیکن سوسائٹی کو ان سے کیا تعلق ؟ ۔

مادام :- مقتنین طفلانِ مکتب نہیں ۔

فلسفی :- واقعات کو صحیح رنگ میں پیش کرتے ہوئے ــــــــــ

مرد لاغر :- جہاں تک صداقت کا تعلق ہے ۔ اس میں ذرہ بھر نہیں ۔ ایک شاعر مگر حقیقی واقعات سے کیا تعلق ۔ کتاب کا مصنف یقیناً سرکاری ذلیل ہوگا ۔ میں ۔

بہترین
ہسپانوی افسانے

ترجمہ: ل. رحیم

زندہ کتابیں

پسین کی داستان خیز سرزمین میں آج تک جو بہترین افسانے لکھے گئے ہیں، یہ کتاب ان کا نمائندہ مجموعہ ہے

2.50

مکتبۂ جدید

بہترین ہسپانوی افسانے

بہترین

ہسپانوی افسانے

ترجمہ و انتخاب

رحیم

مکتبہ جدید لاہور

یعقوب کے نام ———

جس کے پیہم اصرار و معاونت کے طفیل میں ان
افسانوں کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کے قابل
ہو سکا ———

رحیم

ترتیب

پیش لفظ

آپ کی خدمت میں ہسپانیہ (سپین) کے مختصر افسانوں کا ایک نمائندہ مجموعہ پیش کرنا ہی اس کتاب کا مقصد ہے مختلف ادوار میں ہسپانوی کہانیوں نے جو ادبی رنگ اختیار کیے، ان کے نمونے ہسپانوی اور امریکی ہسپانیہ کی سرزمینوں سے فراہم کیے گئے ہیں۔

سالہا سال کی مدتِ مدید میں ہسپانوی مختصر افسانے نے کئی شکلیں بدلیں۔ لوک کہانیاں ابتدا سمجھیے اور مصنف کی تحلیلِ نفسی اور ذاتی نکتہ ہائے نظر کے ترجمان افسانے انتہا، اور اگر ان کی طوالت کی ابتدا چڑیا چڑے کی ننھی کہانی تھی تو انتہا مختصر ناول۔ آپ کو قدیم ترین شکل ان روایتی قصوں میں ملے گی جو انسان کے جمالیاتی ذوق کا ابتدائی ذریعۂ اظہار ہیں۔

عربی شان و تجمل کے آٹھ سو سالہ تسلط میں سپین مشرق و مغرب کا مقامِ اتصال تھا اور غرناطہ، قرطبہ اور تولیدو میں عربی تہذیب و تمدن اپنی صولت و شوکت کی معراج پر پہنچی ہوئی تھی۔ عرب اپنے ساتھ صرف مشرق کا فلسفہ اور سائنس ہی نہیں لائے تھے جو قرونِ وسطیٰ میں یہاں سے یورپ بھر کو نصیب ہوئی بلکہ مشرقی افسانوں کے بہت سے مجموعے بھی ہمراہ تھے۔

الفانسو، دانائے سپین کا دربار علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ اس نے ۱۲۶۱ء میں ان مجموعوں میں سے ایک کے ترجمے کا حکم دیا ——— کلیلہ و دمنہ۔ دو سال بعد ایک

اور ترجمہ بحکم برادرِ شاہ - دون فدریک - معرضِ وجود میں آیا ـــ سندباد کا سفر اور اس کے بعد بے شمار ترجموں نے سپین کے دل و دماغ کو نوازا -

لیکن اصل ہسپانوی نژاد مختصر افسانہ میگویل دے سیروانتیس کے زورِ تخیل کا مرہونِ منت ہے اور اس کی ابتدا اس کی کتاب موسومہ مثالی ناول سے ہوتی ہے جو پہلی بار ۱۶۱۳ء میں چھپی تھی - اس کتاب کے بارہ قصوں اور ان کہانیوں کے ذریعے جو "دون کیخوتے" میں مندرج ہیں اس نے دنیا کو ایک نیا اسلوبِ بیان بخشا - کہانیاں علیحدہ علیحدہ ہیں اور ایسی ہیں جو ابھی تک معرضِ تحریر میں نہیں آئی تھیں - ان کے موضوعوں میں تنوع ہے اور ان کے رنگا رنگ اسلوبِ اظہار کے فنی جوہروں سے سیروانتیس کو اپنے پیش رو ادب کے اظہارِ بیان پر پوری پوری دسترس ہو گئی - اس نے اپنے سے پہلے افسانہ گوؤں کی تصنیفات سے اپنے مفید مطلب مواد کو کانٹ چھانٹ لیا اور جس زبان کو انھوں نے قطع و تراش سے اک صورت دی تھی اس نے اس میں اپنی روشنیٔ طبع سے شیرینی، لطافت اور لچک بھر دی - آگہیٔ ذات کی بےنظیر صفت سے متصف ہو کر وہ اپنی کتاب "مثالی ناول" کے دیباچے میں یہ کہتے ہوئے حق بجانب نظر آتا ہے کہ "میں ہی وہ پہلا شخص ہوں جس نے ہسپانوی زبان میں کہانیوں کو تخلیق کیا ہے کہ وہ جو ہسپانوی زبان میں متعدد مطبوعہ کہانیاں بازاروں میں دیکھنے میں آتی ہیں - غیرملکی زبانوں سے ترجمہ ہو رہی ہیں لیکن یہ کہانیاں میری اپنی چیز ہیں - نقل اور سرقہ کا مال نہیں ہیں - میری قوتِ متخیلہ نے انھیں جان بخشی اور میرے قلم نے انھیں تخلیق کیا -"

ان کہانیوں کا رواج فوراً قبولِ عام کی سند حاصل کرتے ہوئے دور و نزدیک پھیل گیا۔ ایک ہی سال میں فرانسیسی میں ترجمہ ہوئیں اور اس کے جلد ہی بعد انگریزی اور جرمنی میں - چند میں لوٹ کھسوٹ اور بدمعاشوں کی کرتوتوں کے نقشے ہیں - چند سماج پر طنز ہیں - چند میں نفسیاتی مطالعے ہیں - چند عجیب و غریب معرکوں سے بھرپور ہیں اور چند ایسی ہیں جن

میں ان تمام گوناگوں عناصر کو یکجا دکھایا گیا ہے ـــــ اور موخر الذکر ہی اس مجموعے کی زینت ہیں۔ یہ کہانیاں اس مطمحِ نظر کی حامل ہیں جس کی تحصیل کے لیے سپین کا آرٹ کوشاں ہے ـــــ مطمحِ نظر جو اُس بھری پُری اور پوری پوری زندگی کا عکاس ہے جس میں بیہودگیاں ہیں، تناقص ہیں، نقائص ہیں، قباحتیں ہیں، خوبصورتیاں ہیں اور حقیقت و مثالیت کا امتزاج ہے۔

تمام ادوار کے عظیم ہسپانوی ادبا نے ارادتاً یا بہ فیضِ وجدانِ فطری اتنا ضرور محسوس کر لیا تھا کہ عام لوگ ہی ان کے فن کے لیے اک دوامی مواد لیے ہوئے ہیں جس میں رموز و اسرار کا اک دفتر پنہاں ہے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ہسپانوی ادب میں مافوق العادات اور عجائب و غرائب باتیں شاذ شاذ ہی ملتی ہیں۔

رومانیت نے ادب کی نئی نئی قسموں کو جنم دیا اور دو تو خاص طور پر بڑے زور شور سے ہسپانوی دنیا میں مروج رہیں۔ ایک کا نام ہے Cuadros de costumbreis جو زیادہ تر پُر لطف سین اور واقعات کی تصویر کشی سے متعلق رہی۔ یہ ایک طرح کے خاکے تھے جن میں ماحول اور چال ڈھال اور دوسرے تعلقاتِ انسانی کی جزئیات نگاری پر زور دیا جاتا تھا اور انہی خاکوں نے حقیقت پسندی کے بیج بو دیئے۔ دوسری نوع ادب مقامی تاریخی کہانی پر مشتمل تھی، اور نثر و نظم دونوں میں رائج تھی۔ اس نوع کو ۱۹ ویں صدی کے نصف اوّل میں قبولیت عام حاصل رہی اور یہ تھی بھی ہسپانیہ اور ہسپانوی امریکہ سے مختص۔ چنانچہ اسے یہاں اور جگہوں کی نسبت زیادہ اپنایا گیا۔ مقامیت، انفرادیت کی اک اور قسم ہے اور ہسپانوی کردار کی جان۔ ہر شہر، قصبہ، محلّہ، بازار اپنی اپنی مخصوص کہانیوں کی ترنگ میں مست تھا اور ہر کہیں ہسپانوی ادیب اس سے جی بھر کر بہرہ یاب ہوئے۔ لیکن پیرو کے ریکارڈو پالما کے سر یہ اس بات کا سہرا بندھتا ہے کہ اس نے ان دونوں انواع کو مقامیت کی محدود فضا سے نکال کر عالمی فضاؤں کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ "پیرو کی روایات اور حکایات"

ہسپانوی افسانے

کا طویل سلسلہ شاہد ہے کہ اس نے خود اپنے ملک کا ماضی از سرِ نو زندہ ہی نہیں بلکہ تخلیق کر ڈالا ہے۔ جو واقعات اس نے بیان کیے ہیں ان کا محور ایما ہوتا تھا یا کوئی اور پیرد کی شاہانہ تمکنت کا مقام ـــ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ کل ہی وقوع پذیر ہوا تھا۔ مدت ہائے مدید اور دور دراز کی باتوں کو اس زورِ بیان کرتا ہے کہ ان پر حال کے ہونے کا شبہ گزرتا ہے۔ اس کے بینظیر زورِ تخیل میں اک ندرت، لطافت اور ستم ظریفیٔ فطرت کی جھلک نمایاں ہے۔

حقیقت پسندی کے ظہور سے ہسپانوی ادب کی نسوں میں قوت کی اک جدید لہر دوڑ گئی۔ یہ تحریک دو ادوار میں بٹ سکتی ہے۔ پہلے دور کے مصنفین نے جو ۱۸۷۰ء میں بامِ رفعت پر تھے۔ زیادہ تر ناول لکھے اور چند نے مختصر کہانیاں بھی پیش کیں "تین کونوں والی ٹوپی"۔ کا مشہور مصنف الارکون اس دور کا بہترین نمائندہ ہے۔ اس نے تاریخی اور حکایاتی اور ہیبت ناک اور پُر اسرار افسانے لکھے ہیں۔ جن میں ایڈگر پو کا اثر صاف واضح ہے۔ مگر ۱۸۸۰ء کے بعد دوسرے دور کے ادیبوں کی ہمتوں نے مختصر افسانے کو اور آگے بڑھایا اور اخباروں اور رسالوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے مختصر افسانوں کی مانگ کو تیز کرنے میں خاصی امداد دی۔ فطرت پسندی فرانس میں تو پنپ گئی مگر اس طرح سپین میں قدم نہ جما سکی۔ ثاثیر سے خالی سرد مہرانہ سائنسی جزئیات نگاری سپین کے مزاج کو راس نہیں آسکتی۔ یہ نہ کہئے کہ ہسپانوی کے پاس زندگی کے سنجیدہ اور مظلوم پہلو دیکھنے کے لیے نظر نہیں ہے۔ بلکہ واقع یوں ہے کہ وہ اپنی نظر کو اپنے ذاتی تاثرات سے بھی لبریز کرنا چاہتا ہے۔ انسان ـــ ہسپانوی ادباء کی نگاہوں میں اِک محض تجریدی شئے یا فیصلہ کن قوتوں کے سامنے بے بس کھلونا نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے اک منفرد حیثیت دیتے ہیں۔ اور اس کی کمزوریوں اور شکست کے ساتھ ساتھ اس کی قوت اور ظفرمندی کا بھی اعلان کرتے ہیں۔ جبر نہیں اختیار۔ ہسپانوی عقیدے کا جزو لاینفک ہے اور

پیش لفظ

انفرادیت کی اک دوسری شکل -

۱۹ ویں صدی کے اواخر میں فطرت پسندی اور حقیقت پسندی کے خلاف سپین گیر ردِعمل کی تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اک نیا ادب منصۂ شہود پر آگیا - ۱۸۹۸ءکے ہسپانوی دورِ ادب پر دہ مصنفین چھا گئے جن کی تصنیفات میں ہمیں ایسی کہانیاں ملتی ہیں جو ہمارے معاصرانہ احساس کو بے حد متاثر کرتی ہیں اور جن کے فن کا معیار ہمیں آج بھی درست و بجا نظر آتا ہے - پلاٹ کی دلچسپی کے علاوہ ہمیں ان کی کہانیوں میں اسلوبِ نگارش اور رسائی موضوع سے خاصا لطف حاصل ہوتا ہے اور اس لاثانی احساس کے پرتو کا پتا چلتا ہے جس نے مصنف کے موافقِ مزاج موضوع کو انتخاب کرنے اور اپنانے میں دست گیری کی ہے -

ہسپانوی ادب کے دوسرے گل ہائے نظرا فروز کے لیے ہمیں سمندر پار کرکے امریکہ جانا ہوگا، یہ اک ناقابلِ فراموش حقیقت ہے کہ ہسپانوی امریکی ادیبوں کے کارہائے نمایاں ہسپانوی ادب کے تاج کے درخشاں ہیرے ہیں -

دریافت سے پہلے بھی ہسپانوی امریکہ کا اپنا ادب تھا - نو آبادکاری کے دور میں جب ہسپانوی امریکہ آئے تو وہ اور ان کی امریکی اولاد اک ایسے ادب کی تخلیق کے باعث ہوئی جس کی اپنی انفرادی شان تھی مگر کہنا ہی پڑے گا کہ اس کے کثیر حصے پر اسپین کا نقشِ دوام ثبت تھا - آزادی کے بعد ہسپانوی ادب بہت سے اثرات کی چغلی کھا رہا ہے مگر ادب کی ساری انواع نے یکساں جواب نہیں دیا - شاعری اور سیاسی ادب وافرانہ، وجود میں آئے اور کامیابی نے ان کے قدم چومے - اگرچہ ناول اور ڈرامے کی اہمیت کو اتنا نہیں سراہا گیا پھر بھی اکا دکا دلچسپ ناول دیکھنے میں آجاتے تھے - ناول کے لیے اک مکمل سماجی ڈھانچے کی ضرورت ہے اور وہ ان دنوں مفقود تھا -

۱۹ ویں صدی کے اواخر کا ذکر ہے کہ ہسپانوی امریکہ کے مختلف شہروں میں بیک وقت

ہسپانوی افسانے

غیر معمولی طباع و ذہین ادیبوں کی ایسی "جدت پسند" جماعت میدان میں آئی جس نے ادب میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور جدید ناول اور مختصر افسانے کی داغ بیل ڈال دی۔

اپنے ہسپانوی ہمعصروں کی طرح ان کی تصنیفات میں بھی شاعرانہ اور داخلی تحلیلِ نفسی کا رنگ ٹپکتا ہے اور اپنے فروعی اختلافات کے باوجود دونوں کا نقطۂ نظر ایک ہی تھا —— "آگہیِ ذات"۔

سو سال ہوئے جو نصیحت سارمی اینتو نے چلی کے ادیبوں کو پیش کی تھی معلوم ہوتا ہے ہسپانوی امریکی ادیبوں نے بھی اسے ہی اپنا ادبی معیار مقرر کر لیا تھا۔

"چشمِ بینا وا کرو — اپنی آبائی سرزمین پر نگاہ کرو اور دیکھو اپنے بھائی بندوں کو، ان کے رسم و رواج کو، ان کے اداروں کو، اور ان مسائل کو جن سے ملک دوچار ہے۔ پھر پیار بھرے دل کے ساتھ ان کے متعلق لکھو۔ جو تم محسوس کرتے ہو، جو تمھیں پیش آتا ہے اسے معرضِ تحریر میں لاؤ۔ مضمون خوب ہوگا اور طرزِ مضمون میں جھول ہے تو ہو۔ اس میں تمھارے اپنے جذبات کی شمولیت ہوگی اور جو کبھی کبھار تحریر میں کہیں افراط و تفریط سے واسطہ پڑ جائے تو خاطر جمع رکھو کہ وہ بُری یا بھلی جیسی بھی ہوگی، ہوگی تمھاری اپنی چیز۔"

۲۰ ویں صدی کے ادبا اس دنیا کے باسی ہیں اور اس سے پیوستہ۔ بہتیروں نے غیر ممالک میں جا کر قیام کیا اور حقیقت پسندوں کے برعکس نگاہِ سطحیت سے نہیں بلکہ نگاہِ باطن بیں سے دیکھا اور اپنے عالم کو اپنے دل میں موجود پایا۔ اب وہ زندگی کے ٹھوس اور سخت حقائق کو پیشِ نظر رکھ کر کام میں مصروف ہیں۔ اپنی منفرد شخصیت کی تلاش میں ہیں اور اپنے ملک اور اپنے لوگ اور اپنے رسم و رواج اور اپنے مسائل ہر وقت ان کے سامنے ہیں۔

اس مجموعے کا زیادہ حصہ اپنی ۲۰ ویں صدی کے ادبا کے شاہکاروں کا منتخل ہے۔

اختلافات کے باوجود ان میں ایک مشترک شئے موجود ہے - آپ کو ان کی تحریروں میں روایتی ہسپانوی حسن کی مشابہت تکمیل اور لطف و احتظاظ کم ہی ملے گا کہ ان کا پیغام زیادہ بھرپور، زیادہ انسانیت نواز اور ہمہ گیر ہوگیا ہے جس میں عالی ظرف دل کی ہمدردی فہم و تفہیم اور ذہن و رجحان شامل ہے - اب ان کی نگارشات اپنے مقاصد کی تحصیل کی خاطر عمیق انسانیت نواز جذبات اور زندگی سے عشق آمیز انہماک کا تصور پیش کر رہی ہیں اور فرے لوئی دا لیون کی ہمنوا ہیں جو کہتا ہے -

"حقیقتاً حسن یہی ہے کہ ہر چیز اپنی فطرت کے مطابق کام کو انجام دے رہی ہو" اور انہی الفاظ میں فنکارانہ دیانت کی تعریف مضمر ہے -

ہسپانوی مختصر افسانوں کے تدریجی ارتقا کی یہ مجمل سی داستان ہے -

آٹھ سو سالہ عربی حکومت کے کرداروں کے نقش ان اہل ہسپانیہ میں یوں پیوست ہیں کہ اب بھی ابھرتے نظر آتے ہیں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اجداد کے خون کی پکار نہ بھولے ہیں نہ بھلا سکے ہیں - وہی غیرت و حمیت، وہی ذہنی سوجھ بوجھ کی تیزی، وہی بہار کی سی لطافت اور خنجر کی سی درشتی اور عربی دورِ آخر کی لاابالیانہ طبیعت اور وہی مبالغہ آرائی اور امارت پسندی -

ہسپانیہ کی عیسائیت نے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم توڑے اور جب مسلمان اپنے وطن سے غیروں کی طرح نکالے گئے تو یہی عیسائی کلیسا کا نشانہ بن گئے — فطرت کی سخت ترین تعزیر -

ان افسانوں میں آپ کو ہسپانیہ اور اہلِ ہسپانیہ کی معاشرتی جھلکیاں، ریب و ریا کے بغیر، صاف صاف نظر آئیں گی -

رحیم

کارلوس وائلڈ اوک پینا

گھر کی عزّت

اس نے سر کو باڑ والے جنگلے کی بلندی سے اونچا اٹھایا اور ہاتھوں کو خمیدہ کر کے ایڑوں پر یوں رکھا کہ مغفر کی سی اوٹ بن جائے اور پھر کمرے کے اندر جھانکنے لگا۔ آدمی نیم اندھا تھا اور بینائی سے زیادہ حواس سے کام لے کر چولھے کی آگ کے شعلوں کو دیکھ رہا تھا جن کی لو کے آگے سے مبہم سائے بار بار آتے جاتے تھے۔ ایک راندۂ قانون کی طبعی حزم و احتیاط کے ساتھ اس نے سر، سننے کے انداز میں اٹھا رکھا تھا اور نتھنوں کو کتے کی طرح، ہوا میں سونگھتے وقت پھیلاتا اور ناک سکیڑتا تھا۔ عورتیں غلے کی روٹیاں پکا رہی تھیں اور اسے ان کے پکانے کی کلپ کلپ کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ گرم گرم روٹیوں کی سوندھی بو ہوا میں تیر رہی تھی اور وہ اس ہوا میں سانس لے رہا تھا۔ ہائے، وہ کتنا بھوکا تھا! اس کی بھوک گداگر کی بھوک سے سخت تھی۔ اس سے پیشتر کہ بھوک کا زہریلا ناگ گداگر کے پیٹ کو چاٹ ڈالے۔ اسے فاقوں سے غش آ جائے۔ انسانی ہمدردی اس کی بھوک کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے موجود تھی۔ مگر اس کی بھوک اک مفرور کی بھوک تھی۔ جو شہروں کے نزدیک آ کر بھیک مانگنے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا۔ جب اُسے روٹی میسر بھی ہو جاتی تھی تو وہ اسے اس حال میں نگلتا تھا کہ خنجر ہاتھ میں ہوتا تھا یا بندوق کندھے پر۔

لیکن جوآن تبرالیس نے دل میں عزم کر لیا تھا۔ کیا وہ گرفت میں آ جانے سے خوفزدہ تھا؟ نہیں تو۔ اس سے تو اسے فائدہ ہی پہنچے گا۔ اس نے معاملے پر خوب سوچ بچار کر لیا

کہ پیٹ کے لیے روٹی اور سر کے لیے چھت سائے کی خاطر اپنے آپ کو پولس کے حوالے کر دینا بہتر رہے گا۔ لیکن فی الوقت وہ مویشی خانے کے باشندوں سے روٹی مانگنے کا قصد کئے ہوئے تھا۔ یہاں اسے کوئی پہچاننے والا نہیں ہوگا۔ اس نے جنگلے کا چکر لگایا اور اپنی سوٹی سے راستہ ٹٹولنے لگا۔ راستے کی بڑی دیکھ بھال کی جاتی تھی اور سر سبز و شاداب سبزیوں کی کیاریوں سے ہو کر گزرتا تھا۔ وہ لنگڑا کر چلتا تھا اور اس کی حالت پر ترس آتا تھا۔ آوارہ گرد چلتے چلتے رک گیا۔ وہ کام کے لیے نہ کہے؟ لغویات۔ جب جوانی اور طاقت کے زمانے میں کام نہ کیا تو بھلا اب وہ کیا کام کر سکے گا کہ بوڑھا اور نحیف و نزار ہے۔ ہاں! اب بہتر یہی ہوگا کہ باورچی خانے میں جا کر بھیک کی صدا لگائے!

وہ مویشی خانے کے قریب آ گیا۔ کھسکتا، سرکتا ہوا۔ ایک آوارہ کتے کی چاپلوسی کا انداز لیے۔ عورتیں آگ کے سامنے سے آجا رہی تھیں۔ ایک نے دھوئیں میں سے اسے دیکھا اور بولی۔

"حضور کی کیا خدمت کریں؟"

"راہ مولا ایک روٹی مل جائے!" اس نے لجاجت سے کہا۔ اپنی کرخت اور بھدی آواز میں نرمی بھر دی تھی اور نقل کو اصل اور اصل کو نقل کر دکھانے کا پُر فریب فن وہ ان دنوں سیکھ چکا تھا جب چوری کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔

عورت نے اندر آنے کی دعوت دی۔ کچی اینٹوں کی دیوار کے ساتھ ڈھیلے تختوں کا بنچ پڑا تھا اندر آ کر اس پر بیٹھ گیا۔ عورت نے ایک لمحے کے لیے اسے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا اور غصیلے کتے نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ بھولے ہوئے گوشت کا ایک ٹکڑا اور چند روٹیاں اس کے آگے رکھ دی گئیں۔ وہ مزے مزے سے ہولے ہولے کھا رہا تھا۔ اسے خوف سے آزاد، خوشگوار وقفہ میسر تھا اور اس قابل تھا کہ شکم کی دوزخ کو ٹھنڈا کر سکے جو تمام جانداروں پر مسلّط ہے۔

گھر کی عزت

جب غنودگی نے غلبہ پا لیا تو اس نے کچی اینٹوں کے ساتھ ٹیک لگالی مگر جس عورت نے اسے مدعو کیا تھا، اس کے سوال نے جگا دیا۔ "کہیں دُور جا رہے ہو کیا؟"
وہ سانلماسے آ رہا تھا۔ ابھی ابھی ہسپتال چھوڑا تھا اور راہ پر ہو لیا تھا۔ کدھر؟ یہ تو اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

جب کسی کے بیوی ہو نہ بال بچہ۔ چھت سایہ سر کے لیے ہو نہ روٹی پیٹ کے لیے۔ کمزوری اتنی ہو کہ کوئی کام کاج بھی نہ ہو سکے تو موت سے گریز کی خاطر سب جگہیں برابر ہیں۔ عورت نے اسے ہمدردی بھری دلچسپی سے دیکھا۔ اسے ہو کیا گیا تھا؟ اسے سخت زکام تھا جس سے آنکھیں متاثر تھیں اور عام بخار بھی تھا۔ یہ مرض نشیبی ملکوں میں ہر ایک کو ہو جاتا تھا۔ سالوں ادھر کی بات ہے جب وہ پیٹین کے جنگلات میں کام کرتا تھا تو اس بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا۔

ایک چالیس سالہ گول مٹول عورت بڑے آرام سے کہنے لگی۔ "کہتے ہیں وہاں سبھوں کو بخار ہو جایا کرتا ہے!" پھر جوآن براکس سے مخاطب ہوئی۔ "تمھارا نام؟"
اس دفعہ اس نے اپنا مخصوص قاعدہ توڑ ڈالا اور اجنبیوں کو صحیح نام بتا دیا۔ "میں ہوں آپ کا خاکسار۔۔ جوآن ورگاس۔"

عورت نے اس نام کو دہرایا اور بولی۔ "جوزفا کے خاوند کا نام بھی تو یہی تھا۔"
مفلوک الحال اور غلیظ آدمی بھونچکا سا رہ گیا اور اپنے سوزش زدہ پپوٹوں کو وا کر کے چپ ہو رہا! اک لمحے کے بعد کہنے لگا۔ "کیا یہاں کوئی جوزفا رہتی ہے؟"

"جی ہاں! وہی ہے نا جو اپنی بیٹی سمیت مالک کے گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کہتے ہیں اس کا آدمی بھی تھا جو اسے چھوڑ کر چلا گیا۔"

"مالک یہیں کہیں ہوگا؟"

"نہیں تو! وہ گرتے مالا شہر میں گیا ہوا ہے اور جوزفا گایوں کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ کہتے والے باڑے میں۔"

"اللہ تمہیں جزائے خیر دے!" جوآن براابس رخصت ہو کر گایوں کے باڑے کی راہ پر ہو لیا۔ وہاں جوزفا کو پا لیا اور اک نظر میں پہچان گیا۔ وہ دودھ دوہنے والے لڑکوں کو سخت سُست کہہ رہی تھی۔ جوزفا۔ بوڑھی۔ بھاری بھرکم اور بدمزاج۔ اس کے پیچھے اس کی بیٹی کھڑی تھی۔ جوآن براابس کی بیٹی اور قبول صورت نکل آئی تھی۔ اچھا، ہاں۔ اپنی سابقہ بیوی سے مل کر جوآن براابس کے جذبات میں کچھ اتنا ہیجان بپا نہ ہوا۔ اس کی بیوی تنومند تھی۔ مدور تو مذ نکلی ہوئی تھی۔ سارجنٹ کی سی اونچی آواز میں چلا رہی تھی اور مویشی خانے کے مالک کی شان لیے ہوئے تھی۔ وہ اس کے پاس آیا اور کسی تمہید کے بغیر فوراً ہی بول اٹھا۔ "پہچان لیا ہے مجھے کہ نہیں؟"

وہ چپ چاپ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ہکا بکّا۔ پھر آگے بڑھی اور اس کے اس قدر قریب آ گئی کہ اس کے منتشر گل مچھوں کو چھو رہی تھی۔ اپنی نفرت کو چھپانے کی ذرا کوشش نہ کی اور جو کچھ بھی تھا اسے پہچان لیا۔

"جوآن درگاس! کب آزاد کیا انھوں نے تجھے؟" وہ اس شخص۔ نیم اندھی وحشتناک آنکھوں والے مجرم کے سامنے اسی طرح کانپ گئی جس طرح گزرے ہوئے دنوں میں کانپ جاتی تھی۔ "یہاں کیا کر رہے ہو تم؟"

جوآن براابس منہ کے برابر تک ہاتھ لے گیا۔ منہ کھولا اور پُرسکون طنز کے ساتھ۔ خاموشی سے یوں ظاہر کیا جیسے کوئی چیز نگل رہا ہو۔

ایک بار اور کھاتے پینے کے بعد جوآن براابس نے اپنی بیٹی کو سینے سے لگا لیا اور اسے بچوں کی سی ملاطفت کے ساتھ پیار کرتا رہا۔ جب وہ چلی گئی تو جوزفا سے پوچھنے لگا۔ "لے دے کر یہی ہے نا؟"

وہ اس کے سوال کا مطلب تاڑ گئی۔ "نہیں ایک اور بھی ہے؟"

"ایک اور بھی ہے؟ لڑکا؟"

گھر کی عزت

" ہاں! لڑکا۔"

اس ڈاکو کی نظروں کے سامنے جوزفا مارے غصّے کے بازوؤں کو ہلاتے ہوئے پھوٹ پڑی۔" خدا غارت کرے تمھیں! اور کس بات کی توقع تھی تمھیں؟ نو سال ہوئے کہ تم مجھ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ہم تو..... اور کس بات کی توقع تھی تمھیں؟"

دفعتاً اس نے ہچکیاں لے لے کر رونا شروع کر دیا۔ جوآن برابس کو محسوس ہو گیا کہ جو کچھ ہوا اس کا ہونا قطعی قدرتی امر تھا اور بآخر اس نے جوزفا کو بھی سینے سے لگا لیا۔

نیم اندھا آدمی مویشی خانے میں قیام پذیر ہو گیا اور جوزفا کی سفارش پر مقررہ فرائض کے بغیر گھر کی خدمت پر مامور کر دیا گیا۔ وہ ہر فن مولا تھا اور ہر ایک کام کے لیے آمادہ و تیار۔ جلد ہی مویشی خانے کے ہر کیل کانٹے پر مویشی خانے کا اپنا نشان چسپاں نظر آنے لگا۔ ہر ایک گھوڑے کے نعل لگ گیا اور کوئی ساز زین ایسی نہ تھی جو مرمت طلب رہی ہو! اور تو اور اس نے باغ کی نگہبانی تک اپنے ذمے لے لی اور مرغیوں کے ڈربوں کی نگہداشت کو بھی اپنے فرائض میں شامل کر لیا۔ ایسے ایسے کام جو سنبھالے تو مویشی خانے کے "کامیوں" نے اس کے نام دھر دیے "نانی اماں" اور "چلبلی مرغی"!

بھیس بدلے ہوئے جوآن برابس ایسی نصیحتوں پر مسکرا دیتا تھا۔ کاش یہ کمینہ اس بات کو صرف جان ہی لیتا جس کا اس کی بیوی کو شک شبہ بھی نہیں تھا ——— چودہ سال کی عمر میں چور پھر قاتل اور پھر قزاقوں کا سردار۔ آج اس کی پُرامن زندگی پُرسکون تحفظ سے کنار گیر تھی اور وہ اس قابل تھا کہ اپنی ماضی پر مسکرا دے! آدمی سے کیسی کیسی جنونانہ حرکتیں سرزد ہوا کرتی ہیں! آج وہ محض جوآن ورگاس تھا ـــ ایک نشیبی ملک کے مویشی خانے میں مسرور اور بھولا بسرا۔ اور حکام کو کیا پڑی تھی کہ اس کی تلاش کرتے پھرتے اور لاکھ کی ایک ہی کہیے تو یہ سب کچھ اس کی عورت کی عنایات کی بدولت حاصل ہوا تھا۔

وہ اسے نصیحت کر رہی تھی اور جو بات کہہ رہی تھی اس سے آگاہ بھی تھی۔

"جوان! تم جو کچھ بھی تھے۔ ماضی کو مضی کہہ ڈالو۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم اپنی بیٹی اور اس بچے کے لیے کام کرو کام جسے تعجب ہے کہ تم سے محبت ہے! تمھارا روپیہ گاڑھے پسینے کی کمائی ہے اور یہ تو امیروں کے چونچلے ہیں کہ اپنے نام نکوا اور عزت و شہرت کی فکر کرتے پھرتے ہیں اور جب تھوڑا بہت جمع ہو جائے گا۔ میاں! تو کسی وکیل کی خدمات حاصل کر لیں گے اور وہ تمھاری وکالت کر کے مخلصی کرا دے گا۔ یوں جیل میں سڑنے سے نجات ہو جائے گی۔ اور ہاں! اک بات یقینی جانو کہ تمھیں اپنے طور اطوار بدلنے پڑیں گے!" اور وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اب وہ حد درجے کا ایماندار آدمی بن گیا تھا۔ کیا مجال جو کسی کو اس کی مرضی کے بغیر ہتھیائے۔ خوش قسمتی اس پر مسکرا رہی تھی اور تین روحوں کی ذمہ داری لیے ہوئے تھا۔ جب وہ لیکچر دے رہی تھی تو اس کے لب و لہجہ میں نیم استدلالی رنگ جھلکتا تھا جس سے اس کی دانائی کی اور بھی تصدیق ہوتی تھی۔ جوان متعجب تھا۔

"ہم نے تھوڑا بہت جمع کر رکھا ہے۔ ...... ہر ایک مالک کو اُلّو بنا رہا ہے۔ ہم بھی اتنے کچے ثابت نہیں ہوں گے کہ باقیوں کو وہ کچھ لے جاتے دیں جو ہم خود لے جا سکتے ہیں۔ ہمارا حق زیادہ ہے کہ ہم ہی ہیں جو ان کمینوں سے مویشی خانے کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں! لیکن یہی کافی نہیں! تمھیں تو یہاں داروغے کا کام سنبھالنا چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں شادی کرنی پڑے گی کہ آگے ہی لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کر رکھی ہیں۔"

اس نے بیوی کے اس نامعقول خیال کو رَدّ کر دیا! وہ اور پھر اس کے لیے شادی کے گھنٹے بجیں۔ بالآخر وہ آمادہ ہو گیا۔ یہ جو شیطان کی خالہ ہے اس کی بیوی۔ یقیناً لوگوں کو سمجھتی ہے۔ شادی ہو گئی اور شادی کے بعد جوان مویشی خانے کا داروغہ بن گیا۔ مثالی مویشی خانہ تھا اور مثالی تھا اس کا داروغہ!

انھوں نے مالک کے گلے پر چھری چلا چلا کر اپنے لیے فرنیچر سے آراستہ پیراستہ مکان بنوا لیا۔ بچت میں اضافہ ہو رہا تھا اور کاروبار پھیل رہا تھا، ہاں ہاں واقعی! تمام

گھر کی عزت

مویشی خانے پر نظم و نسق کی حکمرانی تھی اور مالک اپنے مفاد کی کامرانی کے طریقوں سے مسحور ہوگیا تھا۔ وہی تھا جس نے جوزنا سے کہا تھا "اگر تم دوسروں کا مال غصب نہ کرو تو خدا سبھوں کو مالا مال کر دیتا ہے۔" ہمسایہ مویشی خانے والے دوستوں سے ڈینگیں مار کر کہتا تھا۔" وہ بوڑھا تو کمال استاد ہے بھئی! اس کی ایمان داری کی تو پوچھو نہیں اور کیا مجال جو کوئی اسے چکمہ دے جائے!"

یہ تھا بھی سچ! جو ساحلی لوگ وہاں کام کرنے آتے تھے۔ جھگڑالو اور بدنہاد ہوتے تھے اور تادمِ آخر ایسے ہی رہتے تھے اور وہ اپنے قزاقی کے دنوں کے تجربوں سے کام لے کر نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ان سے کام لیتا تھا۔ پہلے پہل تو وہ داروغے کی درشتی کو دیکھ کر بغاوت پر اتر آتے مگر پھر جوآن ورگاس کے جوہرِ ذاتی کو پہچان گئے۔ یا تبراَبس کو لیجیے کہ اسی نام سے دستخط کرتا تھا۔ چرواہوں میں ایک سخت گستاخ تھا۔ جب داروغے نے اپنے خنجر کے ایک ہی وار سے اس کا ہتھیار گرا دیا تو وہ مطیع ہوگیا۔ سبھی مان گئے کہ آٹھ آٹھ میل کے گرد و پیش میں کوئی ایسا نہ تھا جو چاقو اور خنجر چلانے میں استاد کا مدِمقابل ٹھہرتا یا گولی بھر نے اور بندوق کو اپنے منتخب نشانے پر چلانے کی مہارت میں اس سے سبقت لے جاتا! خوف نے اُس عقیدت کو جنم دیا جو ایک آدمی دوسرے کے لیے محسوس کرتا ہے اور ان کا سارا گروہ عقیدت مند ہوگیا اور اڑیل سے اڑیل بھی مغلوب ہو کر رہ گیا۔ ان کی عقیدت میں وہ سادہ اور بے لوث ارادت بھی شامل ہوگئی جو دیہات والوں کے دلوں میں سردار کے لیے جاگزیں ہو جاتی ہے — اک خام مال جس سے "کاڈلو" بناتے ہیں۔

معلوم ہوتا تھا کہ "جناب جوآن" کو جو یہ فوقیت نصیب ہوئی تھی وہ گویا پیدا ہی اس کے لیے ہوا تھا۔ اس کی بیوی سب سے پہلا شخص تھی جس نے اس کے سامنے اس بات کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

"اگر تم اتنے ساکت اور جاہل نہ ہوتے تو تمھارے جرنیل بننے کی راہ صاف تھی۔"

ایک پُرانے چرواہے نے کہا۔ "جرنیل؟ پریذیڈنٹ کھوجی!"۔

جوآن ورگاس کی زندگی پر صرف ایک ہی فکر کی پرچھائیں چھائی ہوئی تھی اور وہ تھی اس کی اپنی بیٹی روسن دا اب وہ پندرہ کے سن کو پہنچ رہی تھی اور کیلنڈروں والی تصویروں کی کوہستانی دوشیزاؤں کا سا حسن وجمال لیے ہوئے تھی اور یہ واقعہ ہے کہ اس پر مالک کی نگاہ پڑتی تھی۔

معاملہ پیچیدہ تو تھا ہی۔ سخت سنگین اس وقت ہو گیا جب ماں نے مالک کی دلالہ کے فرائض ادا کرنے شروع کر دیے۔!

ایک روز جوزفا جوآن ورگاس کے پہلو میں آ بیٹھی اور خلافِ معمول شیرینی و لطف کا اظہار کرنے لگی اور اسے ہمراز بناتے ہوئے اس شیرینی و لطف کی تان اس بات پر توڑی کہ "مالک کو روسن دا سے عشق ہے اور اس عشق کو عشق نہیں خالص سونے کی تہہ سمجھو"۔

"استغفر اللہ!" بوڑھا بدمعاش غرایا تھا۔ "تمہارا اچّہ تو زہر مار ہیں کہ گیا، مگر یہ ہونے سے رہا!"

اور پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دلالہ کو وہ مارا کہ ہڈی پسلی ایک کر دی۔ اتنا پیٹا، اتنا پیٹا کہ خود بے دم ہو گیا اور اسے مکان کے فرش پر روتا پیٹتا۔ زخمی چھوڑ کر چلا گیا۔

دن گزرتے گئے اس نے بہتیرے حیلوں بہانوں سے کام لے کر اور رو رو کر سمجھایا کہ یہاں سے نکلنا پڑ جائیگا۔ مگر جوآن ٹس سے مس نہ ہوا۔

"بیوی! مر جاؤں گا مگر یہ نہیں ہو گا! اگر بے حیائی کا نام ہی عزت ہے تو اپنی سابقہ گداگری اور قزاقی کیوں نہ اختیار کر لوں!"

پھر سوچ بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ "عزت کیا چیز ہوتی ہے۔ یہ بات کسی کے دل و دماغ میں نقش کرنا بڑا مشکل امر ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں قزاق ہوں۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ بدمعاش اور جعل ساز ہوں لیکن میں کہوں کہ جن بُرے افعال کا میں مرتکب ہوا ہوں۔

وہ متصل میری اداسی اور پریشانی کا باعث بنے ہوتے ہیں ۔ تم بتاؤ تم اسے اچھی نظر سے دیکھتی ہو گیا ؟ میں اپنے آپ کو ایک ذلیل انسان سمجھتا ہوں مگر پھر بھی اپنے اور تمھارے گوشت پوست اور خون کو بیچنے کے لیے تیار نہیں ! تم اسے لایعنی کہو ۔ مگر میں ہوں ایسا ہی! میں نے کاہے کے لیے تمھارے کہنے پر صراط مستقیم اختیار کی صرف اس لیے کہ پہلے سے بھی بدتر ہو جاؤں ؟ خدا کے لیے میری نظروں سے دور ہو جاؤ ۔ ورنہ میں اپنے پرانے ہتھیاروں پر اتر آؤں گا۔ مالک اور لڑکی اور تم سب کو چاہیے کہ ذرا سنبھل کے قدم اٹھائیں کہ جوان بر ابس ابھی مرا نہیں !"

جوزفا اپنے آنسوؤں کو پیش بند سے پونچھتے ہوئے منہ بسور بسور کر کہنے لگی :" جب سے تم نے ہماری اصلاح پر کمر باندھی ہے صاحب ! وہ تو کبھی کا مر چکا ہے ۔ واقعی مر چکا ہے ۔ میں سوچتی رہی ہوں جوآن اور اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ جس راہ پر تم چل رہے ہو ۔ اس پر چل کر سجر نیل تو نہیں اولیا ضرور بن جاؤ گے !"

رامون دیل واسلئے انکلان

میری بہن انتونیا

(۱)

کبھی گلیتسیا کا سینتیاگو دنیا بھر کی زیارت گاہ تھا اور آج بھی اس کے بسنے والوں کی روحیں کسی معجزے کی رونمائی کے لیے ہمہ وقت چشم براہ ہیں۔

(۲)

ایک روز شام کو میری بہن انتونیا نے گرجے کو جانے کے لیے مجھے انگلی سے لگا لیا۔ انتونیا مجھ سے کہیں بڑی تھی۔ اس کا قد دراز تھا اور رنگ زرد۔ آنکھیں سیاہ تھیں اور مسکراہٹ میں اداسی کی جھلک تھی۔ میں ابھی بچہ ہی تھا کہ وہ مر گئی۔ لیکن مجھے کتنی اچھی طرح یاد ہے، اس کی آواز، اس کی مسکراہٹ اور اس کے ہاتھوں کی وہ خنکی جو میں اس وقت محسوس کرتا تھا جب وہ مجھے گرجے لے جاتی تھی۔ سب سے بڑھ کر مجھے اس کی وہ آنکھیں یاد ہیں جن کی چمک میں حزن و ملال کی پٹ تھی اور جب وہ اس طالب علم کا تعاقب کرتی تھیں جو نیلے، بے آستین لبادے میں لپٹا ہوا غلام گردش کے چکر لگاتا تھا۔ مجھے اس طالب علم سے ڈر لگتا تھا۔ وہ دراز قامت تانت کی طرح سوکھا ہوا تھا اور اس کا چہرہ مردے کا سا تھا۔ شیر کی سی آنکھیں تھیں ـــــ وحشت ناک اور ان کے اوپر درشت نفیس ساخت کی پیشانی تھی۔ جب وہ چلتا تھا تو گھٹنوں کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز نکلتی تھی جو اسے مُردوں کے اور بھی قریب لے آتی تھی۔ میری ماں کو اسے دیکھنے سے گھن آتی تھی اور اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل رکھنے کی خاطر ان دریچوں کی جھلملیوں کو ہمیشہ بند رکھتی تھی جو پلے تیریا کی غلام گردش

کی طرف کھلتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس شام کو بھی، سدا کی طرح، اپنے نیلے بے آستین لبادے میں اچھی طرح لپٹا ہوا، ٹہل رہا تھا۔ گرجے کے دروازے پر ہماری اُس سے مڈ بھیڑ ہو گئی اور اس نے اپنے ڈھانچہ نما ہاتھ کو نکال کر مقدس پانی لیا اور میری بہن کو پیش کیا جو کانپ رہی تھی۔ انتونیا نے اسے ملتجیانہ دیکھا اور اُس نے تشنج آمیز مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی میں کہا۔" آج میں بیحد خوش ہوں۔"

(۳)

ہم گرجے کے حجرے میں پہنچے جہاں چند معمر عورتیں زیرِلب شام کی دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ یہ حجرہ وسیع اور تاریک تھا۔ اس کے چوبی فرش کی صدا رومی طرزِ تعمیر والی چھت کے گنبد میں گونج جاتی تھی۔ بچپن میں مجھے اسں حجرے میں ایک دہقانی طمانیت محسوس ہوتی تھی۔ اس کے سایوں سے مجھے پتوں والے شاہ بلوط، کنج تاکستان یا کسی راہب کی دامنِ کوہ والی کھوہ کا خیال آجاتا تھا۔ یہاں ہمیشہ شام کو بوڑھی عورتوں کا حلقہ مصروفِ دعا ہوتا تھا۔ ان کی آوازیں۔ جذب و شوق سے معمور جنبش ہائے لب میں ڈوب کر گنبد تلے پھیل جاتی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ شفقِ شام کی طرح انھوں نے دریچوں کے غیر شفاف شیشوں کے گلابوں کو منور کر دیا ہے۔ وہاں مدھم آوازوں میں کہی ہوئی مقدس دعاؤں کی سوئے آسمان پرواز اور چوبی فرش پر بھدے قدموں کی آواز سنی جا سکتی تھی اور جب پادری دعاؤں کی کتاب سے ہولے ہولے دعائیں پڑھتا تھا اور خادم گرجا اس کے کندھوں کے اوپر ایک روشن شمع لیے ہوتا تھا اور ننھی نقرئی گھنٹی کو آگے پیچھے کر کے بجاتا تھا، تو اس کی آواز بھی وہاں سننے میں آسکتی تھی۔

آہ اے کورتیلا کے گرجے! کب میری یہ تھکی ماندی روح تیرے سایوں کی تسکین بخش مرہم میں پھر غرق ہو جائے گی!

(۴)

جب ہم غلام گردش سے ہو کر گھر کو لوٹ رہے تھے تو مطلع تاریک تھا اور نزشح ہو رہا تھا۔ گھر پہنچنے پر میری بہن ۔ میرا ہاتھ چھوڑے بغیر دوڑ کر سیڑھیاں چڑھ گئی اور وسیع ڈیوڑھی کی تاریکی نے اسے ضرور ڈرا دیا ہو گا ۔ اندر آتے تھے کہ ماں دیوان خانے سے گزری اور ایک کھلے دروازے میں سے غائب ہو گئی ۔ نہ جانے کیوں خوف اور تجسس کے مارے مَیں نے نظریں اٹھا کر انتونیا کو دیکھا ۔ اس نے ایک لفظ نہ کہا اور جھک کر مجھے چوم لیا ۔ زندگی کی سوجھ بوجھ کے بغیر بھی میں نے بہن کے راز کو بھانپ لیا ۔ ہال میں میز پر ایک لمپ پڑا تھا جس کی ٹوٹی ہوئی چمنی دھواں دے رہی تھی ۔ جب میں وہاں سے گزرا تو کسی سخت گناہ کے بوجھ کی طرح اس راز کا بار محسوس کر رہا تھا ۔ دھوئیں کی دو شاخیں دو سینگ بن گئی تھیں جن سے مجھے شیطان کا خیال آ گیا ۔ جب بستر پر دراز ہو گیا تو اندھیرے میں مجھے یہ واقعہ یاد آتا رہا اور بہتیری راتیں میری نیند اس سے بیزار ہوتی رہی ۔

(۵)

شام کو کئی دن مینہ برستا رہا طالب علم کے غلام گردش میں ٹہلنے کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا ۔ مگر میری بہن شام کی عبادت کے لیے گرجے نہ گئی ۔ کبھی کبھی جب میں دیوان خانے میں بیٹھا سبق پڑھ رہا ہوتا تو میں اس کو دیکھنے کی خاطر کھڑکی کھول دیتا ۔ مرجھاتے گلابوں کی باس سے گرجے کی فضا بوجھل تھی ۔ وہ تنہا ٹہلتا نظر آتا —— لبوں پر اینٹھی ہوئی مسکراہٹ لیے جب رات ہو گئی تو وہ یوں نعش سا دکھائی دیا کہ میں خوف زدہ ہو گیا ۔ مَیں کانپتے ہوئے کھڑکی سے پرے ہٹ گیا لیکن نظریں وہاں سے نہ ہٹیں اور میرے سبق بن یاد کیے رہتے رہے ۔ خاموش اور شاندار دیوان خانے سے اس کے جوڑوں کی آواز میرے کانوں میں آ جاتی تھی ۔ بلّی نے تین بار میاؤں میاؤں کی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ میاؤں طالب علم کا نام ہو ۔

میک سیمو بر ے تل

(٦)

سینٹ تیاگو کے نزدیک ہی، دامنِ کوہ میں برسے نل ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہاں کے بڑھے نکیلی ٹوپیاں اور گھر کے بُنے ہوئے بے آستین لبادے پہنتے ہیں۔ سردیوں میں بڑی بوڑھیاں اصطبلوں میں بیٹھ کر چرخہ کاتتی ہیں کہ گھروں سے زیادہ یہاں گرمائش ہوتی ہے اور محافظِ گرجا گرجے کے صحن میں بچوں کو پڑھاتا ہے۔ اس کے ڈنڈے کے زور سے بچے صدر بلدیہ اور میونسپلٹی کے منشیوں کی قانونی تحریروں کو پڑھنا سیکھتے ہیں اور سب مل کر کسی ایسے عالی نسب خاندان کے مسودات میں سے پڑھتے ہیں جس کا اب وجود بھی باقی نہیں۔ میک ہیمو ایسے ہی گھرانے کا فرد تھا۔ وہ سینٹ تیاگو میں دینیات کے مطالعے کی خاطر آیا تھا اور شروع شروع میں ایک بڑھیا جو گاؤں سے شہد بیچنے آتی تھی، اس کے لیے رئی کی روٹی اور سؤر کا گوشت لاتی جو اسے ہفتے بھر کے لیے کافی ہوتا! وہ چند دوسرے ساتھیوں سمیت ایک سرائے میں رہتا تھا جہاں انھیں صرف چارپائیوں کا کرایہ دینا پڑتا تھا۔ جب وہ مجھے لاطینی گرائمر، گھر پر پڑھانے پر مامور ہوا تو وہ کم تر درجے کے کلیسائی منصب پر فائز ہو چکا تھا۔ برسے نل کے پادری نے انسانی ہمدردی کی بنا پر میری ماں سے اس کی سفارش کی تھی۔

ایک بوڑھی عورت میری ماں کا شکریہ ادا کرنے آئی اور سیبوں کی ٹوکری تحفتہً دے گئی۔ بعد میں لوگوں کا کہنا ہے کہ جس جادو نے میری بہن کو مسحور کر دیا تھا، وہ انہی سیبوں میں سے ایک سیب میں موجود تھا۔

(٧)

میری ماں نہایت ذہن دار عورت تھی اور اسے سحر و شگون میں کوئی اعتقاد نہ تھا۔ لیکن اُس خیال کے پیشِ نظر جو اس کی بیٹی کو کھائے جا رہا تھا جھوٹ موٹ کہہ دیتی کہ اُسے بھی ان باتوں پر یقین ہے۔

طالب علم کی طرح انتونیا نے اب اس طرح کا رنگ ڈھنگ اختیار کر لیا تھا کہ گویا وہ کسی دوسری دنیا کی ہو۔ اس کا وسیع دیوان خانے کے ایک کونے میں بیٹھے کشیدہ کاڑھنا مجھے یاد ہے۔ اس قدر رفتا و نابود سی نظر آتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ نہیں اس کا عکس ہے جو آئینہ میں نظر آ رہا ہے۔ اس کی حرکتوں سے بیدلی ٹپکتی تھی اور یوں لگتا تھا یہ حرکتیں اک دوسری دنیا کے ترنم سے ہمنوا ہیں۔ اک دور دراز کی مسکراہٹ اُس کے لبوں پہ کھیلتی تھی۔ سفید اور اداس اداس رہتی تھی اور کسی پُر اسرار شفق میں محصور نظر آتی تھی اور اس قدر پیلی پڑ گئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا چاند کی طرح ہالے میں گھر گئی ہے۔ میری ماں پردے ہٹا کر اسے دیکھ لیتی اور چپ چاپ چلی جاتی۔

(۸)

دھوپ والی پیلی سنہری شامیں لوٹ آئیں اور پہلے کی طرح میری بہن نے مجھے انگلی سے لگا کر پھر شام کی عبادت کے لیے کوتیلا حجرے میں جانا شروع کر دیا۔ مجھے خوف کھائے جا رہا تھا کہ پھر طالب علم کا سامنا ہوگا۔ وہ ہڈیوں ہی ہڈیوں والا ہاتھ ہمارے آگے بڑھا دے گا اور اس میں سے مقدس پانی ٹپکتا ہوگا۔ میں نے سہم کر جو اپنی بہن کو دیکھا تو اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میک سیمو برسے تل جو ہمیشہ شام کو غلام گردش میں موجود رہتا تھا، ہمیں دیکھتے ہی غائب ہو گیا اور جب ہم گرجے کے بیچ سے گزر رہے تھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ محرابوں کے سایوں میں سے اُبھر رہا ہے۔ ہم حجرے میں داخل ہوئے تو وہ دروازے کی سیڑھیوں پر دوزانو ہو گیا اور ان سلوں کو چومنے لگ پڑا جن پر میری بہن نے قدم رکھے تھے۔ وہ دوزانو تھا۔ بے آستین لبادہ کندھے سے گر گیا تھا اور اپنے سامنے ہاتھ جوڑے یوں معلوم ہوتا تھا کہ سنگ ترتب پر کسی نے بت تراش رکھا ہے۔ ایک روز شام کو ہم گرجے سے گھر جا رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں سائے کی طرح اس کا ہاتھ بڑھ رہا ہے اور بڑھتے ہی اپنی انگلیوں میں انتونیا کے کرتے کا اک کونا دبوچ بیٹھا ہے۔

"میں جان پر کھیل رہا ہوں ...... میں جو کہوں تمہیں سننا ہی پڑے گا۔ تمہیں بتا رہی رہوں گا کہ کس صدمے سے مر رہا ہوں۔ کیا تمھارا یہی ارادہ ہے کہ آئندہ تم مجھے اک نظر بھی نہ دیکھو گی؟"

انتونیا غنچے کی طرح زرد ہو رہی تھی، سرگوشی کے انداز میں بولی "مجھے جانے دیجیے دان میک سیمو مجھے چھوڑ دیے گا۔"

"میں تمھیں نہیں چھوڑوں گا، تم میری ہو، تمھاری روح میری ہے۔ میں تمھارے جسم کا خواہاں نہیں کہ وہ فرشتۂ موت کی چیز ہے۔ میری طرف دیکھو، اپنی نظروں کو میری نظروں میں ڈال کر انھیں اعتراف کرنے دو! میری طرف دیکھو!"

اس زرد ہاتھ نے اس زور سے میری بہن کا کرتا کھینچا کہ اس کا ایک ٹکڑا اچٹ کر آ رہا اور میری بہن کی معصوم نگاہیں اس کی آنکھوں کی آتشیں اور درخشاں گہرائیوں میں دور تک ڈوبتی چلی گئیں۔ اس رات جب اندھیرے میں مجھے وہ واقع یاد آ گیا تو میں یوں چلا اُٹھا گویا میری بہن گھر سے بھاگ گئی ہے۔

(۹)

دیوان خانے میں مرجھائے ہوئے گلابوں کی بُو چھائی ہوئی تھی۔ میں یہیں اپنی لاطینی گرامر کے سبق پڑھتا رہتا تھا اور کبھی کبھی سہ پہر کو ماں بھی آ جاتی تھی۔ وہ بڑے صوفے کے ایک کونے میں بیٹھ جاتی جس پر قرمزی رنگ کا مشجر کپڑا پڑا تھا اور وہاں بیٹھے بیٹھے آہیں بھرتی اور تسبیح پھیرتی اور بوقت ردِ تسبیح کے دانوں کی حرکتوں کی آواز آہوں کی آواز کے ساتھ ساتھ میرے کانوں میں پہنچتی اور میری ماں بڑی پیاری عورت تھی۔ سرتا سر حسین و سفید۔ ہمیشہ ریشم میں ملبوس رہتی تھی۔ ایک ہاتھ کی دو انگلیاں غائب تھیں اور اسے وہ سیاہ دستانے کے اندر رکھتی تھی۔ دوسرا ہاتھ پھول کی مانند تھا، انگوٹھیوں سے بھرا ہوا۔ اس کو ہم چوما کرتے تھے اور اسی سے وہ ہم کو پیار کرتی تھی۔ دوسرے ہاتھ کو وہ رومال کی جھالر

میں چھپائے رکھتی اور یہ سارے کا سارا اس وقت نظر آتا جب وہ اپنے لیے ہوا میں صلیب کا نشان بناتی۔ اس کے منہ کے گلاب، سفید پیشانی کی درخشانی اور مریم عذرا کے سے سینے کے سامنے یہ ہاتھ کس قدر افسردہ کن اور تاریک تھا!

میری ماں صوفے میں دھنس جاتی اور دعاؤں میں مصروف رہتی اور دوسرے کونے میں جو روشنی نیم وا دریچوں سے اندر آتی تھی اسی روشنی میں میں بیٹھا لاطینی کے سبق یاد کرتا تھا۔ میں اپنی گرامر کی کتاب ان پرانی طرز کی میزوں میں سے ایک پر کھولے رکھتا جن کے اوپر کے تختے پر شطرنج کے خانے کھدے ہوتے ہیں۔ اس وسیع و خاموش دیوان خانے میں مشکل سے کچھ دکھائی دیتا تھا۔ کبھی کبھی میری ماں دعائیں مانگنے کے دوران کہہ دیتی کہ "کھڑکی ذرا اور کھول دو"۔ میں اس اجازت سے فائدہ اٹھاتا اور غلام گردش میں جھانکتا جہاں طالب علم شام کے سایوں بھرے جھٹ پٹے میں ادھر اُدھر ٹہلتا تھا۔ اس سہ پہر کو وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ ابھی میں منہ ہی منہ میں لاطینی یاد کر ہی رہا تھا کہ کسی نے دستک دی۔ یہ شخص فراں سسکی راہب تھا جو حال ہی میں پاک سرزمین سے لوٹ کر آیا تھا۔

(۱۰)

باپ برنر دمیری ماں کا پادری رہ چکا تھا۔ جس کے سامنے وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کیا کرتی تھی اور اپنے سفرِ زیارت کی واپسی پر اس کے لیے ایک تسبیح لایا تھا جو اولی وٹ پہاڑی کے زیتونوں کی گٹھلیوں کی بنی ہوئی تھی۔ جب سے وہ اپنی سنتیاگو والی خانقاہ میں لوٹا تھا، اس شام کو اس کی یہ دوسری ملاقات تھی۔ ادھر وہ اندر آیا، ادھر میں نے گرامر دہیں رکھی اور اس کے ہاتھ چومنے کو دوڑا گیا۔ میں دو زانو ہو گیا اور برکت لینے کے انتظار میں اوپر نظر اٹھا کر اسے تکنے لگا۔ لیکن مجھے یوں معلوم ہوا کہ برکت دینے کی بجائے وہ ہوا میں دو سینگوں کی شکل بنا رہا ہے۔ شیطان کی اس شرارت سے ڈر کر میں نے آنکھیں موند لیں اس فریب

کا مقصد یہ تھا کہ میں گناہ کا ازتکاب کر دں - پادوآ کے سینٹ انیتھنی کی زندگی میں بھی اسی قسم کی بات کا تذکرہ ہے اور ان دلیوں کی کہانیوں میں بھی یہی چیز نظر آتی ہے جنھیں میں بآوازِ بلند اپنی ماں اور انتونیا کو سناتے کو تھا۔ باپ برزدجسے میری دادی کو اپنے زمانے کا ولی کہنے میں تامل نہ ہوتا ۔ جلدی سے مری ماں کو تسلیمات کہنے کے لیے آگے بڑھا ماضی میں میری اس کا میمنا رہ چکی تھی - وہ میرے منڈے ہوئے سر پر صلیب کا نشان بنانا بھول گیا جس میں دو کان یوں نکلے ہوئے تھے کہ اب اڑے کہ اڑے ۔ بچے کا سر بچپن کی اندوہ افزا زنجیروں کے بوجھ سے جھک رہا تھا : لاطینی ذن کو اور مُردوں کے خوف رات کو۔

راہب نے میری ماں سے چند الفاظ زیرلب کہے اور وہ دستانے والا ہاتھ اٹھا کر کہنے لگی۔

"باہر چلے جاؤ ننھے ۔"

(II)

باسی تیسیا میری ماں کی پُرانی اُنّا تھی اور دروازے کے باہر دبکی بیٹھی تھی -میں نے اسے دیکھا ہی تھا کہ اس نے وہیں مجھے کوٹ سے پکڑ لیا اور میرے منہ پر اپنی جھریوں پڑی ہتھیلی رکھ کر کہنے لگی ۔

" خبردار ! جو اک لفظ بھی بولے ۔ شرارتی ۔"

میں اسے گھور رہا تھا کہ اسے دیکھ کر مجھے پتھر کی وہ مضحک صورتیں یاد آ گئیں جو گرجے پر بنی ہوئی تھیں - ایک لمحے بعد اس نے مجھے آرام سے دھکیل کر کہا ۔" دوڑ جاؤ بھیّا ۔"

میں نے اس کے جھریوں والے بوڑھے ہاتھ کو کندھے سے جھٹک دیا اور اس کے پہلو میں بیٹھا رہا ۔

"ایک روح کو بچانے کا سوال ہے ۔" راہب کی آواز میرے کانوں میں آئی ۔

باسی تیسیا نے پھر مجھے دھکیلا۔" بھاگ جاؤ یہاں سے، تمھارے سننے کی باتیں نہیں ہیں۔"

اور ساری کی ساری کبڑی ہو کر اس نے دروازے کی درز کے ساتھ آنکھ لگا دی۔ میں بھی اس کے پہلو میں دبکا رہا۔ اس دفعہ باسی بیسیا نے اتنا ہی کہا "جو کچھ سنو، بھول جائیو۔" میں ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ وہ واقعی پتھر کی مضحک صورت کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اب یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ پتھر کی وہ صورت بلی کی تھی یا کتے، بھیڑیے کی۔ مگر تھی اُن صورتوں میں سے ایک ضرور جو گرجے کی کانس پہ بیٹھی جھانک رہی تھیں۔

(۱۲)

دیوان خانے کی گفتگو ہمارے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ راہب خاصی دیر تک بولتا رہا۔ "آج صبح کا ذکر ہے۔ ایک شیطان کا ورغلایا ہوا نوجوان ہماری خانقاہ میں آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ وہ اک نامبارک محبت میں گرفتار ہے اور اس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں شیطان سے بھی امداد طلب کر لی ہے۔ اس کو رات کے پچھلے پہر زوال پذیر فرشتہ راکھ کے بادلوں میں اپنے چمگادڑوں والے پروں کے ساتھ دکھائی دیا۔ جو اک بے پناہ شور مچائے ہوئے تھے۔"

"اف خدایا!" میری ماں نے آہ بھر کر کہا۔

راہب نے بات جاری رکھی۔ "شیطان نے اس سے کہا ہے کہ اگر وہ معاہدے پر دستخط کر دے تو یہ محبت کے معاملے میں اس کی امداد کے لیے تیار ہے۔ لڑکا چونکہ بپتسمہ شدہ عیسائی تھا۔ اس لیے ہچکچا گیا اور صلیب سے اسے بھگا ڈالا۔ آج سویرے اس نے اقرارِ گناہ کی نشست گاہ میں میرے سامنے ان سب باتوں کا اعتراف کیا ہے۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ اپنی شیطانی حرکتوں سے توبہ کر لے۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ میری تمام نصیحتیں اس پہ کچھ اثر نہ کر سکیں۔ اس کی روح کھو جائے گی۔"

میری ماں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میں یہ زیادہ بہتر سمجھوں گی کہ بچی میری آنکھوں کے سامنے مر جائے۔"

راہب کی آواز پُر اسرار طور پر ہیبت ناک ہو گئی تھی۔ بولے گیا۔

"اگر وہ مر گئی تو شاید لڑکا جہنم پر فتح یاب ہو جائے۔ اور جو زندہ رہی تو شاید دونوں ہی کھو جائیں ..... اور پھر تم سی بے چاری عورت کس طرح اس کم بخت دانائی کا مقابلہ کر سکتی ہے؟"

"اللہ کی عنایت سے۔"

گفتگو میں ایک طویل وقفہ آپڑا جس میں راہب جواب سوچنے میں محوِ نظر آتا تھا۔ باسی لیسیا نے مجھے سینے سے چمٹا رکھا تھا اور جب ہم نے راہب کے چپلوں کی آواز سنی تو بڑھیا نے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کر دی کہ اٹھ کر بھاگ جائے۔ لیکن اس کی آواز سنائی دیتے پر وہ بیٹھ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"بیٹی! اللہ کی عنایت سدا ہمارے ساتھ نہیں ہُوا کرتی۔ یہ تو چشمے کی طرح بہتی ہے اور پھر خشک بھی ہو جاتی ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف اپنی نجات کی بابت سوچتے ہیں اور اپنے بھائی بندوں کے لیے کچھ پیار محسوس نہیں کرتے یہی ہیں خشک چشمے۔ جب تم نے یہ سنا کہ ایک مسیحی کی روح خطرے میں ہے تو بتاؤ بھلا تمھارے دل پر کیا گزری؟ تم نے اسے جہنم کی قوتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کیا کچھ کیا؟ کیا اس لیے لڑکی کو دینے سے انکار کر رہی ہو کہ وہ اسے شیطان کے ہاتھوں سے حاصل کرے ....."

میری ماں چلا اٹھی "یسوع میری امداد کرے گا۔"

راہب کی آواز انتقام سے کانپ گئی۔ "پیار سب کے لیے یکساں ہونا چاہیے۔ صرف اپنے باپ، خاوند، یا بیٹے کو پیار کرنا تو مٹی کے بتوں کے سامنے جھک جانے کے مترادف ہے۔ اگر تمھیں اس بات کی سوجھ نہیں ہے تو تم بھی طالبِ علم برتنل کی طرح صلیب کو پاؤں تلے روند رہی ہو۔"

اک آواز سی آئی گویا وہ باہر آ رہا ہے۔ جب میں اور باسی لیسیا جلدی سے چلنے تو ایک

کالی بلّی ہمارے سامنے سے بھاگ کر نکل گئی اور کسی نے نہ دیکھا کہ باپ بر نرد کب رخصت ہوا ہے۔

سہ پہر کو باسی لیسیا خانقاہ میں گئی تو اسے پتا چلا کہ وہ میلوں دور کسی کام کو چلا گیا ہے۔

(۱۳)

مینہ کے تھپیڑے کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکرا رہے تھے اور سہ پہر کی اداس اداس روشنی کمروں میں بکھری ہوئی تھی۔

انتونیا دریچے کے پاس بیٹھی کشیدہ کا کام کر رہی تھی اور ماں آرام سے صوفے میں بیٹھی تھی۔ وہ انتونیا کو تک رہی تھی اور اس کی آنکھیں اس پر یوں جم گئی تھیں گویا کسی بت کی ہوں۔ ہم پر گہری خاموشی مسلط تھی اور گھڑی کی ٹک ٹک کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایک دفعہ بیٹھے بیٹھے انتونیا پر خواب کی کیفیت طاری ہو گئی اور اس نے سوئی کو فضا میں متوازن کر دیا۔ ماں نے بلند آواز سے سرد آہ کھینچی اور بہن کی آنکھوں کے پپوٹے یوں پھڑکے جیسے وہ نیند سے بیدار ہو رہی ہو۔ بہت سے گرجوں کے گھنٹے بجنا شروع ہو گئے۔ باسی لیسیا روشنیاں لیے اندر آئی۔ سب دروازوں کے آگے پیچھے دیکھا بھالا اور کھڑکیوں کی آگل چڑھا دی۔ انتونیا پھر کشیدے پر جھکے محوِ خواب تھی۔ مجھے ماں نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بازو کو میرے گرد حمائل کر دیا۔ باسی لیسیا اپنی تکلی لے آئی اور صوفے کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔ ماں کے دانت بج رہے تھے۔ ان کے کٹکٹانے کی آواز میں نے بھی سنی اور باسی لیسیا نے بھی۔ باسی لیسیا نے اوپر نگاہ کی تو میری ماں نے کراہ کر کہا۔

"صوفے کے نیچے سے بلّی کو بھگا دو۔"

باسی لیسیا جھک گئی "بلّی ہے کہاں ؟"

"جب تو روشنیاں لائی تھی، تو یہ بھی تمھارے ساتھ آ گئی تھی۔"

"مجھے تو نظر نہیں آ رہی ہے۔"

"تو سن بھی نہیں سکتی اسے۔"

بڑھیا نے اپنی تکلی کو صوفے کے نیچے ادھر ادھر اور آگے پیچھے پھیر کر کہا۔

"نا۔ کچھ بھی نہیں۔"

"انتونیا، انتونیا!" ماں نے چلا کر کہا۔

"جی ہاں!"

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں ماں!"

"بلی کا نوچنا سنتی ہو؟"

انتونیا نے ایک منٹ کان لگائے رکھا۔" اب تو نہیں نوچ رہی ہے۔"

میری ماں ساری کی ساری لرز گئی۔

"یہ عین یہاں فرش پر میرے سامنے نوچ رہی ہے، لیکن نظر مجھے بھی تو نہیں آتی۔"

اس نے میرے کندھوں پہ رکھی ہوئی انگلیوں کو بند کر لیا۔ باسی بیسیا روشنی لانے چلی گئی لیکن ہوا کے جھونکے نے جس سے سارے دروازے کھڑکھڑا اٹھے تھے اسے بجھا دیا۔

میری ماں نے چیخیں مارتے ہوئے بہن کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ بڑھیا نے آبِ مقدس میں ڈوبی ہوئی زیتون کی شاخ سے سارے کونوں میں پانی چھڑک دیا۔

(۱۴)

ماں اپنے کمرے میں اٹھ آئی۔ گھنٹہ بجنے پر باسی بیسیا جلدی سے نکل گئی۔ انتونیا نے کھڑکی کھولی اور چوک کو خواب میں چلنے پھرنے والے شخص کی نظروں سے تکنے لگی۔ وہ ہولے ہولے پیچھے ہٹی اور پھر فوراً باہر چلی گئی۔ میں تن تنہا رہ گیا۔ میں نے دریچے کے

شیشے کے ساتھ پیشانی لگا رکھی تھی اور روشنی کی آخری شعاع کا غائب ہونا دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہُوا جیسے میرے کانوں میں گھر کے اندر سے چیخوں کی آوازیں آ رہی ہیں لیکن اتنی ہمت نہ تھی کہ ہل سکوں۔ مجھے مبہم سا خیال ہے کہ وہ لوگ تھے کچھ ضرور۔ مگر میں بچہ تھا۔ مناسب یہی سمجھا کہ ان سے محترز رہوں۔ مَیں کھڑکی کے پاس کھڑا تھا اور ڈراؤنے اور پریشان خیالوں سے دماغ بھنّا رہا تھا۔ مجھے اس وقت کی دھندلی سی یاد آ رہی تھی جب میں کالی کوٹھری میں زجر و توبیخ کے بعد بند کر دیا گیا تھا۔ ناخوشگوار یادیں جاگ اٹھی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا میری روح کا احاطہ کر رہی ہیں۔ مَیں اپنی عمر کے لحاظ سے کہیں ہوشیار اور محتاط بچّہ تھا اور ان میں تھا جو کھلی آنکھوں کے ساتھ، کھیل کو چھوڑ کر بڑی بوڑھیوں کی گپوں میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ شور ختم ہو گیا اور جب گھر پر قطعی خاموشی طاری ہو گئی تو میں دیوان خانے سے بھاگ نکلا۔ آگے سے باسی تیسیا مل گئی جو دوسرے کمرے سے نکل ہی رہی تھی۔ جاتے جاتے مجھ سے زیرِلب کہنے لگی۔

"شور نہ مچائیو۔ شرارتی۔"

میں ماں کے کمرے کے باہر پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ دروازہ نیم وا تھا۔ اندر سے خشم آلودہ بڑبڑاہٹ کی آواز اور خوشبودار سرکے کی تیز بُو باہر آ رہی تھی۔ میں نے ذرا بھی شور نہ کیا اور اندر کو کھسک آیا۔ ماں بستر پر دراز تھی اور سر پہ کپڑے پڑے تھے۔ سیاہ دستانے والا ہاتھ برف سی سفید چادروں کے سامنے صاف نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں اور پھٹی پھٹی نظر آتی تھیں۔ جب میں اندر آیا تو اس نے سر ہلائے بغیر آنکھیں دروازے کی طرف پھیر دیا۔

"بیٹے! اس بلّی کو میرے پاؤں کے پاس سے بھگا دو۔"

مَیں اس کے پاس گیا تو ایک کالی بلّی اچھل کر فرش پر آ رہی اور باہر کو نکل بھاگی۔ باسی تیسیا دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے سارا ماجرا دیکھ لیا تھا۔ کہنے لگی "تمھارا دل

معصوم تھا۔ اس لیے تم نے اسے بھگا دیا۔"

(۱۵)

مجھے وہ طویل اور بے کیف دن یاد ہے جب میری ماں کمرے میں بیٹھی تھی۔ جس میں بند جھلملیوں کی وجہ سے بصد مشکل روشنی اندر آ رہی تھی۔ ہاتھ ایک دوسرے کے اوپر رکھے تھے۔ سر رومالوں میں لپٹا ہُوا تھا اور چہرہ بے آب و رنگ تھا۔ وہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہتی تھی اور جب اور لوگ باتیں کرتے تھے تو اپنی جامد آنکھوں کو ادھر پھیر دیتی گویا ان پہ خاموشی عائد کر رہی ہو۔ یہ ایسا دن تھا جب شفق پھولی ہوئی تھی اور وقت کا تعین نہ ہو سکتا تھا۔ جب نوکر روشنیاں لے کر اندر آئے تو معاً دن کی روشنی ختم ہو گئی۔
ماں چلائی۔ "ارے بلی کو دیکھو۔ میری پیٹھ پر ہے۔ کھینچ بھگاؤ اسے۔"
باسی تیبیا میری طرف آئی اور اک رازدارانہ انداز کے ساتھ مجھے ماں کی سمت دھکیل کر لے گئی۔ وہ مجھ پہ جھک گئی۔ اس کی ٹھڈی میں لرزش تھی اور مسے کے بال میرے منہ کو چھو رہے تھے۔ اس نے کان میں دھیمے سے کہا "ہاتھوں کی صلیب بناؤ۔"
میں نے ہاتھوں کی صلیب بنائی اور باسی تیبیا نے انھیں میری ماں کی پیٹھ پر رکھ دیا اور پھر سرگوشی میں بولی "بھیّا! کچھ معلوم بھی ہو رہا ہے؟"
میں سہما ہُوا تھا۔ اسی آواز اور لہجے میں بولا۔ "کچھ بھی معلوم نہیں ہو رہا ہے، باسی تیبیا۔"

"کوئی شئے گرم نہیں معلوم ہو رہی ہے کیا؟"

"مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم ہو رہا ہے، باسی تیبیا!"

"بلّی کے بال نہیں لگ رہے ہاتھوں کو؟"

"بالکل نہیں!"

ماں کی چیخوں سے میں اتنا ڈر گیا کہ زار زار رونے لگ پڑا۔

باسی لیسیا نے مجھے اٹھا لیا اور ہال میں لے آئی -

" او شرارتی! آج تم نے کوئی خراب بات کی ہے ۔ تبھی تو دشمن کو بھگا نہیں سکے ۔"

وہ پھر سونے کے کمرے میں چلی گئی اور میں اپنے گناہوں کے خیال سے افسردہ اور خوفزدہ ہو کر ہال میں ٹھہرا ہوا تھا ۔

چیخوں کی آوازیں آتی رہیں اور نوکر روشنیاں لیے سارے گھر میں گھومتے رہے!

اس طویل اور بے حد طویل دن کے بعد ایک رات آئی اسی دن کی طرح طویل اور بے حد طویل دلیوں کے مجسموں کے سامنے شمعیں فروزاں تھیں - نوکر دروازوں سے باہر سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے اور دروازوں میں کھلتے وقت چرچر ہوتی تھی - میں باہر ہال میں ایک میز کے پاس بیٹھا تھا جس پر دو موم بتیاں جل رہی تھیں - بیٹھے بیٹھے میں نے گوبی لاتھ جن کی کہانی کی بابت سوچنا شروع کر دیا - انتونیا قریب سے گزری اور خوابناک آواز میں پوچھنے لگی ،

"کیا کر رہے ہو یہاں ؟"

"کچھ بھی نہیں -"

" تو سبق کیوں نہیں یاد کرتے ؟"

میں نے اسے گھور کر دیکھا مجھے اس بات پر تعجب تھا کہ بھلا ماں کے بیمار ہوتے ہوئے وہ مجھ سے پڑھنے کی توقع کیسے کر رہی ہے ؟ وہ ہال سے گزر کر ادھر کو چلی گئی اور میں بے دین جن کے پاس چلا آیا - جو ایک ہی پتھر سے ہلاک ہو گیا تھا - داؤد لڑکے نے اسے اپنی غلیل سے ہلاک کر ڈالا تھا اور جس طرح وہ غلیل کو استعمال میں لایا تھا ، اس وقت اس سے زیادہ حملے کی بات مجھے اور کوئی نظر نہ آئی - میں نے ارادہ کر لیا کہ اب کے جو دریا کنارے سیر کو جاؤں گا تو غلیل بازی کی مشق کروں گا - مجھے اک مبہم - پریشان سا خیال آیا کہ طالعلم برتے ل کے ماتھے کو پتھروں کا نشانہ بنا دوں گا - انتونیا معطرے وںڈر کی نشانیں اور پتے قاب

میں لیے لوٹ آئی۔

"تم سوتے کیوں نہیں جاتے، بھیّا؟"

اور پھر وہ جلدی سے چلی گئی۔ میں نے میز پر سر رکھا اور سو گیا۔

(۱۷)

مجھے یہ معلوم نہیں کہ یوں صرف آج رات ہی ہوا کہ اور راتوں کو بھی ہوتا رہا کہ گھر پر سدا تاریکی چھائی رہتی تھی اور شمعیں سدا دیویوں کے آگے روشن رہتی تھیں۔ میں سویا ہوا تھا کہ ماں کی چیخیں، نوکروں کی پُراسرار سرگوشیاں اور دروازوں کی چرچر کی آوازیں کانوں میں پڑیں اور گھنٹی کی آواز بھی سنائی دی۔ گھنٹی بازار تک جاتی تھی۔

باسی لیسیا شمعدان لے گئی اور دو نئی موم بتیاں لے کر آ گئی جو مشکل سے روشنی دے رہی تھیں۔ ایک دفعہ جو میں نے میز سے سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے اس پار ایک آدمی کوٹ کے بغیر بیٹھا ہوا ہے اور سینے پردنے کا کام کر رہا ہے۔ اس کا قد بہت چھوٹا تھا اور سر گنجا تھا۔ سرخ صدری پہن رکھی تھی۔ اس نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔

"سوئے ہوئے تھے پڑھاکو میاں؟"

باسی لیسیا شمعوں کی گل گیری کر رہی تھی۔ "میرا بھائی یاد نہیں رہا تمھیں؟"

میرے دماغ پر نیند کا خمار چھایا ہوا تھا مگر پھر بھی مجھے جوآن دی البرت کی صورت یاد تھی۔ جب میں بڑھیا کے ساتھ گرجے کے میناروں کو جاتا تھا تو کئی دفعہ اُسے دیکھا تھا۔ باسی لیسیا کا بھائی چبارے میں بیٹھ کر پادریوں کے لبادوں کی درستی اور سینے پردنے کا کام کرتا تھا۔

باسی لیسیا نے آہ بھر کر کہا "وہ یہاں اس لیے آیا ہے کہ کاتبیلا کے لوگوں کو اطلاع دے کہ وہ کب یہاں آ کر آخری رسمیں ادا کریں۔"

میں نے رونا چیخنا شروع کیا تو سبھوں نے شور کرنے سے ممانعت کر دی۔

ماں چلا رہی تھی۔ "بھگاؤ اس بلی کو۔ بھگاؤ۔"

(۱۸)

جو سیڑھیاں چبارے کو جاتی تھیں ان کے قریب سونے کا کمرہ تھا۔ باسی لیسیا اس کے اندر گئی اور ایک لکڑی کی سیاہ صلیب نکال لائی۔ اس نے چند الفاظ منہ ہی منہ میں کہے جنہیں میں سمجھ نہ سکا۔ پھر اس نے میری پیٹھ، سینے اور پہلوؤں پر صلیب کے نشان بناتے اور صلیب مجھے دے دی اور اپنے بھائی کی قینچی اُٹھا کر کہنے لگی "وہ آزاد ہونے کو کہہ رہی ہے تو اسے آزاد ہی کر دینا چاہیے۔"

وہ مجھے ہاتھ سے پکڑ ماں کے کمرے کی طرف لے گئی جو ابھی تک چلا رہی تھی "بھگا دو اس بلی کو۔ بھگا دو!"

دروازے پر مجھے کہنے لگی "چپ چاپ جا کر صلیب کو تکیے پر رکھ دو۔ دیکھو ذرا شور نہ ہونے پائے۔ میں یہیں کھڑی ہوں۔"

میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ ماں بیٹھی ہوئی تھی۔ بال پریشان تھے اور ہاتھ بھنچے بن گئے تھے۔ ایک ہاتھ سفید تھا اور دوسرا کالا۔ انتونیا اسے تک رہی تھی۔ زرد رُو اور ملتجیانہ میں پنجوں کے بل دوسری طرف کو نکل گیا اور بہن کی آنکھوں پر نگاہ کی جو سیاہ تھیں۔ گہری اور خشک۔ میں چپ چاپ پلنگ پر چڑھ گیا اور صلیب کو تکیوں پر رکھ دیا۔ دروازے پر باسی لیسیا جھکی ہوئی دبکی بیٹھی تھی۔ جب میں ماں کی طرف آ رہا تھا تو اسے بھی اک نظر دیکھ لیا۔ ابھی میں نے صلیب رکھی ہی تھی کہ ماں تڑپ اٹھی اور اسی وقت ایک کالی بلی بستر کی چادروں میں سے نکل کر فرش پر آ کودی اور دروازے کی طرف دوڑ گئی۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ آنکھیں بند ہی تھیں کہ میں نے قینچی کی کھٹ کی آواز سنی۔ پھر بڑھیا پلنگ کی جانب بڑھی اور مجھے باہر لے گئی۔ ہال میں میز کے نیچے درزی کا تھکنا سایہ پڑ رہا تھا۔ وہیں اس نے مجھے دو ٹکڑے دکھائے جن کے لہو سے اس کے ہاتھ سنے ہوئے تھے۔ کہنے لگی "یہ بلی کے کان ہیں۔"

(۱۹)

غلط ملط دعاؤں کی زیرِ لب آوازوں اور موم کی بوڈں سے گھر معمور تھا۔ ایک پادری منصبی لباس پہنے ہوئے لب پر انگلی رکھے جلدی جلدی آیا۔ جوآن ڈی البرٹ اسے راستہ دکھا رہا تھا۔ درزی پھدک پھدک کر چل رہا تھا۔ سر کو ایک طرف کندھے پر جھکا رکھا تھا۔ ٹوپی کو دو انگلیوں کے درمیان، گھما رہا تھا اور اس کا بے آستین لبادہ پیچھے پیچھے گھسٹتا آتا تھا ان کے بعد ایک نیم سا گروہ ہونے ہوئے آ رہا تھا۔ جس کی دعائیں مدہم آواز میں جاری تھیں۔ اس گروہ کے آدمی ایک قطار میں کھڑے ہو گئے جو میری ماں کے دروازے تک پہنچتی تھی۔ کمرے میں باسی تیسیا اور انتونیا دو زانو تھیں، انھوں نے نقاب پہنے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں موم بتیاں اٹھا رکھی تھیں۔

غلام گردش کی دیوار کے ساتھ ساتھ بوڑھی عورتیں قطار باندھے کھڑی تھیں۔ ان کے سائے ان کے جسموں سے پیوست ہو رہے تھے۔ ان کے خمیدہ ہاتھوں نے مجھے آگے کو بڑھا دیا۔ ماں کے کمرے میں ایک خاتون چلا چلا کر رو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں معطّر رومال تھا۔ اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑا اور میرے ساتھ دو زانو ہو گئی۔ وہ موم بتی کو سنبھالنے میں میری امداد کر رہی تھی۔ پادری ماں کے پلنگ، کا طواف کر رہا تھا اور کتاب سے لاطینی دعائیں پڑھتا جاتا تھا۔ جب انھوں نے چادریں ہٹائیں تو مجھے ماں کے پاؤں دکھائی دیے۔ اینٹھے ہوئے اور زرد۔ اب میں سمجھا کہ ماں مر گئی ہے۔ میں حسین خاتون کے گرم گرم بازوؤں میں سمٹا ہوا تھا۔ خوفزدہ اور ساکن و جامد! مجھے چیخنے یا حرکت کرنے سے خوف معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھکی ہوئی تھی اور اپنے چہرے کی اک طرف کو میرے گال کے ساتھ لگا رکھا تھا اور ماتمی شمع کو اٹھائے رکھنے کے لیے سہارا دے رہی تھی۔

(۲۰)

باسی تیسیا نے مجھے خاتون کے بازوؤں سے جدا کیا اور ماں کی چارپائی کے پاس

لے آئی ۔ ماں کا جسم پیلا تھا اور اکڑا ہوا ۔ اس کے ہاتھ چادروں کی تہوں میں پوشیدہ تھے۔
بابی بیسیا نے مجھے اوپر اٹھایا کہ ماں کا چہرہ دیکھ لوں جس پہ زردی کھنڈ رہی تھی ۔
"میرے بھیئے! انہیں خدا حافظ کہو! اور کہو "خدا حافظ ماں! اب تمھیں ملنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔"

اس نے آرام کے لیے ذرا مجھے فرش پہ کھڑا کر دیا اور ایک سرد لمبی آہ کھینچ کر اپنے جھریوں والے بوڑھے ہاتھوں کو میری بغل میں دیتے ہوئے پھر اوپر اٹھا لیا۔" اچھی طرح دیکھ لو ننھے! خوب اچھی طرح کہ جب تم بڑے سے لڑکے ہو جاؤ گے تو انھیں بھولو گے نہیں۔ بھیئے! چوم لو انہیں۔"

میں مردہ چہرہ پر جھک گیا ۔ ابھی اس کے جامد پپوٹوں کو چھونے بھی نہ پایا تھا کہ میں نے بابی بیسیا کے بازوؤں میں چیخنا چلانا اور تڑپنا شروع کر دیا۔

معاً انتونیا پلنگ کی دوسری طرف وارد ہوئی ۔ اس کے بال بُری طرح بکھرے ہوئے تھے ۔ وہ مجھے بڑھیا کے بازوؤں سے چھین کر لے گئی اور زور سے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا ۔ وہ سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی ، روتے روتے اس کی گھگھی بندھ گئی تھی ۔ آنکھیں سوج گئی تھیں ۔ اس کے چومنے نے مجھے اور اداس کر دیا اور اس کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر میرا دل دکھ کر رہ گیا ۔ انتونیا کھنچی کھنچی تھی اور اس کے چہرے سے حزن و ملال کا اک عجیب اور کرخت اظہار ہو رہا تھا ۔ ہم ایک اور کمرے میں چلے گئے ۔ وہاں وہ ایک نیچی کرسی پر بیٹھ گئی اور مجھے گود میں لے لیا ۔ وہ مجھے چوم رہی تھی ۔ پیار کر رہی تھی اور زور زور سے سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی ۔ اس نے میرے ہاتھ کو مڑوڑنا اور ساتھ ہی ہنسنا شروع کر دیا اور اتنا ہنسی اتنا ہنسی کہ اللہ کی پناہ! ایک عورت اسے رومال سے ہوا دینے لگی ۔ دوسری کی آنکھیں خوفزدہ تھیں اس نے بوتل سے لخلخہ سنگھایا اور ایک اور پانی کا گلاس لانے کے لیے دوڑ پڑی ۔

(۲۱)

میں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ پریشان کن غم واندوہ سے میری کنپٹیاں درد کے مارے پھڑک پھڑک گئیں۔ میں تھوڑی دیر روتا اور پھر چپ ہو جاتا تھا کہ دوسروں کا رونا سنوں۔ آدھی رات کا عمل ہو گا کہ انھوں نے دروازے چوپٹ کھول دیے اور مجھے چار شمعوں کی لرزاں روشنی نظر آئی۔ میری ماں کی نعش کو کالے صندوق میں لٹا دیا گیا تھا۔ میں چپکے سے اندر داخل ہوا اور دریچے کے تختے پر بیٹھ گیا۔ باسی لیسیا کا بھائی اور زنین اور عورتیں تابوت کے گرد بیٹھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد درزی اُٹھ کھڑا ہوتا اور اپنی انگلیوں پر تھوکتے ہوئے شمعوں کی بتیاں درست کرتا۔ جب وہ ننھا با شتیا سیاہ بتیوں کو چٹکیوں میں مروڑ کر توڑتا اور گال پھلا کر انگلیوں پر پھونکیں مارتا تو اس سے اک مسخروں کی سی شان ٹپکتی تھی۔

جب میں نے عورتوں کی باتوں پر کان دھرے تو ہولے ہولے رونا بند کر دیا۔ وہ زندہ دفن کر دیے جانے والوں کی کہانیاں اور بھوتوں کے قصے بیان کر رہی تھیں۔

(۲۲)

جب صبح نمودار ہونا شروع ہوئی تو ایک کافی لمبے قد کی عورت کمرے میں آئی۔ اس کی آنکھیں سیاہ تھیں اور بال سفید۔ نعش کی خنکی سے ذرا نہ گھبرائی اور میری ماں کی نیم وا آنکھوں کو چوم لیا۔ لیکن اپنی آنکھوں میں آنسو نام کو بھی نہ تھا۔ اس کے بعد دو شمعوں کے درمیان دو زانو ہو گئی اور زیتون کی شاخ کو مقدس پانی میں ڈبو کر نعش پر چھڑکا۔ باسی لیسیا مجھے تلاش کرتے ہوئے آئی اور ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔

"اپنی نانی کو دیکھا، بھیا!"

سو یہ تھی میری نانی۔ اس کا گھر سینتیاگو سے سات فرسخ دور پہاڑوں میں واقع تھا۔ وہاں سے خچر پر سوار ہو کر آئی تھی۔ خچر صحن میں بندھا ہوا تھا اور پتھروں پر سم مار رہا تھا اور سموں کے مارنے کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ اس روتے دھوتے والے گھر کے خلا میں یہ آواز گونج رہی ہے۔

انتونیا نے مجھے دروازے سے پکارا۔ "بھیا! بھیا"۔
پاسی تیسیا کے کہے کے مطابق میں ہولے ہولے اس کے پاس گیا اور وہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک کونے میں لے گئی۔
"یہ جو عورت ہے نا۔ یہ ہماری نانی ہے اور اب ہم اسی کے ساتھ رہیں گے"۔
"نانی ہے! تو پھر اس نے مجھے چوما کیوں نہیں؟"
انتونیا اس لمحے سوچ میں پڑ گئی اور آنسو پونچھ کر بولی۔
"ارے میرے بدھو بھیا! کیا تجھے خبر نہیں کہ اسے پہلے ماں کے لیے دعا مانگنی ہے"۔
وہ دیر تک دعائیں مانگتی رہی۔ آخرکار اٹھی اور ہماری بابت پوچھنے لگی۔ انتونیا مجھے اس کے پاس لے گئی۔ اس نے اپنے چاندی کے سے گھنگھریالے بالوں پر سیاہ ماتمی رومال لپیٹ رکھا تھا۔ جس سے اس کی سیاہ آنکھیں اور بھی چمکیلی نظر آتی تھیں اور مجھے اس کے درشت ہاتھ کا لمس آج بھی یاد ہے جس میں پیار کا شائبہ تک نہ تھا۔
وہ اپنے یہاں کی بولی ٹھولی میں باتیں کرتی تھی۔
"تمہاری ماں گئی ہے مر، اور میں ہوں اب تمہاری ماں۔ تمہارے کئے اس دنیا میں اور کوئی نہیں، میں ساتھ لیتی جاؤں گی اور گھر کو بند کر دیں گے۔ عشائے ربانی کی نماز کے بعد کل چلنا ہوگا"۔
کام کر کر کے اس کے ہاتھ کھردرے ہو گئے تھے۔ انہی سے اس نے پھر میرے گال تھپتھپائے۔

(۲۳)

دوسرے روز میری نانی نے گھر میں تالا ڈالا اور ہم نُاں کل ملتے دی براں دی سو کو چل پڑے۔ ایک پہاڑی آدمی نے مجھے اپنے پیچھے خچر پر بٹھا کر لے جانا تھا۔ میں اس کے ساتھ سوار ہو کر پہلے ہی بازار میں پہنچ گیا تھا۔ نوکر انتونیا کو بلا رہے تھے اور دروازوں کے زور زور سے بند ہونے کی آوازیں میرے کان میں آ رہی تھیں۔ اس کا کہیں اتا پتا نہ تھا۔ نوکر خوفزدہ بشرے لیے دریچوں کو کھولتے تھے اور خالی کمروں میں پھر چکر لگا لگا کر اسے پکارتے تھے۔ گرجے کے دروازے

پر ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی ۔ آخر اس نے اسے چھت پر پہچان لیا۔ وہ وہاں بے ہوش ہو گئی تھی ۔ ہم نے پکارا تو صبح کی دھوپ میں اس نے یوں آنکھیں کھولیں گویا نیند میں برسے برسے خواب دیکھ چکی ہو۔ محافظ گرجا کوٹ پہنے بغیر آ گیا اور اس کے اترنے کے لیے ایک سیڑھی باہر لے آیا۔ جب ہم چل نکلے تو طالب علم برے تل غلام گردش میں نظر آیا۔ ہوا سے اس کا سارا ایسے آستین لبادہ اک طرف کو اُڑ رہا تھا۔ چہرے پر سیاہ پٹی باندھ رکھی تھی اور مجھے یوں محسوس ہُوا کہ جہاں اس کا سر بھی اڑ گیا تھا اور کان بھی وہیں پٹی تلے مجھے وہ خون آلودہ گھاؤ نظر آ رہے ہیں ۔

(۲۴)

کبھی گلیسیا کا سنتیتیا گو دنیا بھر کی زیارت گاہ تھا اور آج بھی اس کے بسنے والوں کی روحیں کسی معجزے کی رونمائی کے لیے ہمہ وقت چشم براہ ہیں ۔

میگوئل دے سیروانتیس

خون کی کشش

موسم گرما کی ایک تپتی رات کا ذکر ہے، ایک معمر شریف النفس ہسپالوزی اپنی بیوی چھوٹے لڑکے سولہ سالہ لڑکی اور خادمہ کے ساتھ تولدو میں دریا کی سیر سے لوٹ رہا تھا۔ رات درخشاں تھی اور گیارہ کا عمل تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ چونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُس آسودگی کو تکان اتارنے کی خاطر برباد کر ڈالیں جو انہیں تولدو کے زیریں حصوں کے مرغزاروں میں آرام کرتے وقت نصیب ہوئی تھی۔ اس لیے خراماں خراماں بڑھتے ہی چلے آ رہے تھے۔ شہر کے سرگرم عمل انصاف اور نیک طور اطوار پر بھروسہ کرتے ہوئے نیک خو ہسپالوزی اور اس کا موقر کنبہ اپنے گھر کی راہ پر گامزن تھا۔ اور کسی حادثے سے دوچار ہونے کے گمان نہ رکھتا تھا۔ حادثوں کا قاعدہ ہے کہ اطلاع کے بغیر ہی آ ٹوٹتے ہیں۔ انہیں بھی ایک ایسا سانحہ پیش آیا جس کا انہیں وہم تک نہ تھا۔ اور جس نے ان کی موجودہ خوشی کو مبدل بہ غم کر دیا اور آنے والے بہتیرے سالوں تک سوگوار بنائے رکھا۔

اس شہر میں ایک رئیس نوجوان رہتا تھا جس کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ کچھ اپنی دولت، مرتبے اور بے انداز آزادی کے سبب اور کچھ آوارہ مزاج دوستوں اور عیش پسندانہ میلان کی وجہ سے ایسی ایسی حرکتوں اور فعلوں کا ارتکاب کرتا تھا جو اُس کے شایانِ شان نہ تھے اور جن کے باعث وہ غنڈے کے نام سے مشہور تھا۔ یہی نوجوان جسے اس کے حسب نسب کی خاطر ہم فی الحال رودلفو کے نام سے یاد کریں گے اپنے چار دوستوں کی معیت میں جو سبھی

بے فکرے اور گستاخانہ طور پر بے باک واقع ہوئے تھے اُس پہاڑی سے نیچے اتر رہا تھا جس پر ہسپانوی چڑھ رہا تھا - دونوں گروہ دوچار ہوئے - بھیڑوں اور بھیڑیوں کی ٹڈ بھیڑ - اور رودلفو اور اس کے ساتھیوں نے بے حیاؤں کی دیدہ دلیری سے کام لے کر اپنے چہرے ڈھانپتے ہوئے ماں بیٹی اور خادمہ کے چہروں کے نقاب الٹ ڈالے -

بوڑھے کی جو ہتک عزت ہوئی تو اس نے جی بھر کے انھیں اس حرکت پر زجر و توبیخ اور طعن و تشنیع کی اور وہ جواباً اور کسی زیادتی سے اجتناب کرتے ہوئے منہ چڑاتے اور ٹھٹھول اڑاتے اپنی راہ ہو لیے - لیکن ہسپانوی کی لڑکی لوسادیا نام کے چہرے کے غیر معمولی حسن کا نقش رودلفو کے ذہن میں اس قدر گہرا ہوتا جا رہا تھا کہ آخر وہ دل ہار بیٹھا اور اب اس کی یہی آرزو تھی کہ نتائج سے بے نیاز ہو کر اس سے اپنی سی کر گزرے - جب دولتمند ہاتھ کے غنی ہوں تو انہیں کوئی نہ کوئی ایسا ضرور مل جاتا ہے جو ان کے افعالِ شنیعہ کو جائز قرار دے اور ان کی مذموم آرزوؤں کو نیک خواہشات کا نام دے کر ان کی تعریف کرے - چنانچہ جونہی رودلفو نے دوستوں کو اپنے خیال سے عین مین آگاہ کیا انھوں نے اسی گھڑی اس کی خوشی کی خاطر واپس لوٹ کر اسے اغوا کرنے کا ارادہ کر لیا - اس مذموم تجویز کا تصور - توثیق اور شراکت اور لوسادیا کا اغوا گویا یوں کہیے ایک ہی چیز تھے -

انھوں نے رومالوں سے چہرے ڈھانپ لیے - تلواریں سونت لیں اور پیچھے کو چل کر چندہی قدموں پر اُن کو جا لیا جو ان بدمعاشوں کے ہاتھوں سے مخلصی پانے پر ابھی ابھی خدا کا شکر ادا کر چکے تھے رودلفو - لوسادیا پر جا جھپٹا اور اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے کر اڑ گیا - اس میں نہ اتنی طاقت رہی تھی کہ مقابلہ کرتی اور نہ ہی آواز تھی کہ چیختی چلاتی ، فوری صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی اور غش کھانے سے دیکھ نہ سکتی تھی کہ اسے کون کہاں لے جا رہا تھا -

اس کا باپ چلایا ، ماں چیخی ، بھائی رویا اور خادمہ نے سر کے بال نوچ ڈالے مگر چلانے کو نظر انداز کر دیا گیا - چیخیں ناشنیدہ رہیں - آنسو ترحم پیدا نہ کر سکے - بالوں کا نوچنا بیکار گیا کہ

سب کچھ جائے وقوعہ کی ویرانی، رات کی خاموشی اور بد ذاتوں کے بے رحم دلوں میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ وہ ان کو اتھاہ غم میں غرق چھوڑ کر آپ ہنسی خوشی سدھار گئے۔

رودلفو آرام سے اپنے گھر آگیا اور لوسادیا کے والدین اپنے یہاں پہنچ گئے ——— پامال۔ مایوس اور لٹے پٹے وہ نابینا تھے کہ ان کی بیٹی کی آنکھیں اُن کی آنکھوں کا نور تھیں۔ وہ تنہا تھے کہ لوسادیا کی ذات ان کے لیے مرغوب اور شیریں ترین رفاقت تھی۔ پراگندہ ذہن ہو رہے تھے کہ فیصلہ نہ کر سکتے تھے کہ آیا حکام کو اپنی بدنصیبی کی اِطلاع دیں یا نہ دیں اور جو دیں تو اس میں ان کی اپنی ہی بدنامی کا اشتہار تو نہیں تھا۔ بیچارے شریف النفس ہسپانوی تو تھے ہی اور شریف النفس ہسپانیوں ہی کی مانند انھیں امداد کی ضرورت تھی، لیکن وہ شکایت کرتے ہیں تو اپنی بدقسمتی کے علاوہ اور کس کے خلاف کر سکتے تھے۔ دریں اثنا عیّار و فریب کار رودلفو اس وقت تک لوسادیا کو اپنے گھر کے کمرے میں لے آیا تھا۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ وہ اس کے بازوؤں میں بے ہوش پڑی ہے۔ پھر بھی اس کی آنکھوں پر رومال باندھ رکھا تھا کہ جن راہوں سے آیا تھا نہ تو انھیں دیکھ سکے اور نہ اس گھر اور کمرے کو جس میں موجود تھی۔ اس کے والد حیات تھے اور انہی کے مکان میں ایک علیحدہ حصّہ اس کے لیے وقف تھا اپنے اس حصے اور کمرے کی چابی اس کے پاس تھی۔ اس علیحدگی نے انھیں سب کی نگاہ سے اوجھل رکھا اور یہ ایک ایسی بے احتیاطی تھی جس کا ارتکاب ان والدین سے نہیں ہو گا، جو چاہتے ہوں کہ بچے ان کی نگہداشت میں رہیں۔ لوسادیا کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی رودلفو کو جو کچھ اس سے کرنا تھا کر ڈالا کہ جوانی کی بے مہار گرسنگیاں شاذ شاذ کیا قطعی موقع محل اور صورتِ حال کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ بلکہ اُلٹا ان سے برانگیختہ ہو کر شعلہ بداماں ہو جاتی ہیں۔

اس کی سمجھ بوجھ کی روشنی مدھم پڑ گئی اور تاریکی میں اس نے لوسادیا کو اس کے گوہرِ گراں مایہ سے محروم کر دیا۔ عموماً ہوس کے گناہوں کے پیشِ نظر اپنی آرزو کی تحصیل و تکمیل

کے واحد مقصد کے سوا اور کوئی شئے نہیں ہوتی ۔ اب رودلفو کے دل میں صرف ایک ہی سوچ تھی کہ اس سے نجات حاصل کرے ۔ وہ بے ہوش پڑی تھی ۔ اسے سوجھا کہ اُسے اس عالم میں راہ پر ڈال آئے ۔ وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کو ہی تھا کہ اس نے دیکھا لوسادیا کو ہوش آ رہا ہے ۔ وہ کہہ رہی تھی :

"آہ ! میں کہاں ہوں ۔ یہ کس طرح کا اندھیرا ہے ۔ یہ مرے گرد و پیش کس قسم کے سائے ہیں ۔ میں اپنی معصومیوں کے اعراف میں ہوں یا گناہوں کے جہنم میں ۔ یہ مجھ پر کس کا ہاتھ پڑا ہے ۔ یہ میں پلنگ پہ کیوں ؟ یہ درد کیوں ؟ اے محترم ماں مریم ۔ سن رہی ہو مجھے ؟ ہائے خوب سمجھی کہ میرے والدین مجھے نہیں سن سکتے اور میں دشمنوں کے ہاتھوں میں ہوں ۔ اے کاش یہ اندھیرا ابدی ہو جائے اور میری ان آنکھوں کو کبھی بھی دن کا اجالا دیکھنا نصیب نہ ہو ! اور یہ جو بھی جگہ ہے کاش میری بے آبروئی کی قبر ثابت ہوتی کہ چھپی ڈھکی بے عزتی اُس عزت سے بہتر ہے جو لوگوں کی زبانوں پر افسانہ بن جائے ۔ اب مجھے یاد آیا ۔ اور کاش میں بھلاتے ہی رہتی کہ کچھ عرصہ ہُوا میں اپنے والدین کے ساتھ تھی ۔ اب یاد آیا کہ مجھ پر کوئی حملہ آور ہُوا تھا ۔ اب سارا واقعہ آنکھوں کے سامنے ہے اور سمجھتی ہوں کہ لوگوں کے حق میں بہتر ہو گا جو میری شکل بھی نہ دیکھیں"۔ اس نے رودلفو کو پکڑ کر کہا ۔ " اے تم جو کوئی بھی مرے پاس ہو اگر تمھاری روح کسی التماس سے متاثر ہو سکتی ہے تو میری التماس یہ ہے کہ اب جو تم نے مجھے میری نیک نامی سے محروم کر ڈالا ہے زندگی سے بھی محروم کر ڈالو ۔ اسے فوراً ہی ختم کر ڈالو کہ عزت کے بغیر یہ بے معنی شئے ہے ۔ ظلم کی جو زودستیاں تم نے مجھے آزردہ کرنے میں روا رکھی ہیں اس رحم سے گوارا ہو جائیں گی جس کا اظہار تم مجھے قتل کرنے میں کر دگے ۔ یوں بیک ذلت تم بے درد بھی نظر آؤ گے" اور دردمند بھی ۔

لوسادیا کی آہ و زاری سے رودلفو متعجب و پریشان تھا کہ اس کے شباب کے تجربے

ہیں اس قسم کی چیزیں کم ہی آئی تھیں۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے اور کہے۔ لوسادیا اس کی خاموشی سے اور متحیر ہو رہی تھی اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس کے پہلو میں بھوت تھا یا سایہ۔ اس نے ہاتھ بڑھائے۔ جب اسے محسوس ہوا کہ اس نے انسانی جسم کو چھوا ہے اسے اس کی وہ قوت بھی یاد آگئی جس سے وہ اپنے ماں باپ کے پہلو سے جھپٹ کر جدا کر دی گئی تھی۔ اسے اپنی بدقسمتی کا پورا پورا اندازہ ہو گیا۔ اس نے اپنی التجاؤں کو از سرِ نو سرگرم نوا کر دیا۔ جن کا تسلسل اس کی ہچکیوں اور آہوں سے کبھی کبھی ٹوٹ جاتا تھا۔ وہ کہنے لگی "اے بیدھڑک نوجوان! چونکہ تمہارے فعل مجھے تمہاری نوعمری کا پتا دے رہے ہیں۔ اس لیے میں تمہارے جرم کو جس کا تم نے مجھے تختۂ مشق بنایا ہے اس شرط پر معاف کرنے کو تیار ہوں کہ تم حلفیہ وعدہ کرو کہ جس طرح تم نے اس کا ارتکاب پردۂ تاریکی میں کیا ہے اسے قیامت تک پردۂ راز میں رہنے دو گے اور کسی سے اس کا ذکر تک نہ کرو گے۔ اتنے بڑے جرم کا میں چھوٹا سا معاوضہ مانگ رہی ہوں، لیکن میرے نزدیک یہ سب سے بڑا معاوضہ ہے جسے میں مانگ سکتی ہوں اور تم دے سکنے کے قابل ہو۔ خیال رہے کہ نہ تو میں نے تمہارا چہرہ دیکھا ہے اور نہ اس کی آرزو ہے۔ جب میرے لیے جرم کی یاد ہی کافی ہو تو مجرم کو کیوں یاد کروں؟ یا اس کے تصور کو اپنے ذہن میں کیوں لاؤں جو میری تباہی و بربادی کا بانی مبانی ٹھہر ہے۔ میری آہ و زاری کا علم مجھے ہے یا مرے خدا کو۔ دنیا کو کچھ پتا نہیں اور دنیا کی بلا سے کہ واقعات کس طرح ظہور پذیر ہوئے۔ ان کے متعلق اس کا فیصلہ محض اپنی رائے زنی پر منحصر ہوتا ہے۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں ایسی قابل کیسے ہو گئی کہ ایسی ایسی باتیں تم سے اس طرح کہہ رہی ہوں۔ ایسی حقیقتیں عموماً تجربے اور عمر کا حاصل ہوا کرتی ہیں اور میری عمر ابھی سترہ سال کی بھی نہیں۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ مصائب مصیبت زدہ کو مائلِ فغاں بھی کر سکتے ہیں اور مائلِ خاموشی بھی۔ بعض اوقات وہ ان مصائب کے متعلق مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے کہ دوسرے یقین کر جائیں اور بعض دفعہ اس لیے انھیں سینے سے چمٹائے رکھتا ہے

کہ ان کی شدت میں کمی نہ ہو۔ بہر حال میں چپ رہوں۔ بولوں، اتنا جانتی ہوں کہ تم کو اس بات پر آمادہ کرسکتی ہوں کہ تم مجھ پر اعتبار کر دیا میری امداد کرد کہ مجھ پر عدم اعتبار کا مطلب جہالت ہوگا اور امداد سے پہلو تہی کا مطلب تمام تدابیر کو ناممکنات میں بدلنا ہوگا۔ میں اُمید کا سہارا نہیں چھوڑنا چاہتی کہ اس کے دینے میں تمھارا کچھ بھی خرچ نہیں ہوگا۔ اور یہ ہے میری عرض : چونکہ تم مجھ سے یہ امید اور توقع نہیں کرسکتے کہ مرورِ وقت کے ساتھ تمھارے خلاف میرا حق بجانب غم وغصہ مدھم پڑجائے گا اور چونکہ تمھارے دل میں میری آرزو بھی اب مرچکی ہے اور تمھیں جو کچھ مجھ سے کرنا تھا وہ بھی کرچکے ہو جس سے تمھاری بدکاری کے جذبات بھی کم ہی برانگیخت ہوں گے اس لیے جو ظلم تم نے مجھ پر توڑا ہے، اس کی سعیٔ معذرت نہ کرتے ہوئے دل کو یہی سمجھاؤ کہ وہ اتفاقی بات تھی اور میں یہ سمجھوں گی کہ میں پیدا ہی نہیں ہوئی تھی اور جو ہوئی بھی تو شب وستم سہنے کے لیے۔ مجھے فوراً ہی بازار میں یا بہتر ہو کہ گرجا گھر کے پاس لا ڈالو کہ مجھے وہاں سے اپنے گھر کا راستہ معلوم ہے مگر اس بات کی بھی قسم کھانی ہوگی کہ تم میرا پیچھا نہیں کروگے۔ میری جائے رہائش کے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کروگے اور نہ یہ کوشش کروگے کہ میرے نام کا پتا کرو یا میرے والدین یا عزیز و اقارب کے ناموں کی ٹوہ لگاؤ جو صاحبان شرافت و نجابتِ نسبی کے ساتھ ساتھ کاش صاحبانِ زر بھی ہوتے تو میرے ہاتھوں یہ روزِ بد دیکھنا کا ہے کو نصیب ہوتا۔ اب قسم کھاؤ اور اگر تمھیں یہ خوف ہو کہ میں تمھیں تمھاری آواز سے پہچان لوں گی تو تم جانو کہ میں نے عمر بھر میں اپنے باپ اور اعترافِ گناہ سننے والے پادری کے سوا کسی اور مرد سے بات تک نہیں کی اور چند ایک بھی ایسے نہ ہوں گے جو مجھ سے اتنی بہت دیر محوِ گفتگو رہے ہوں کہ ان کے الفاظ و آواز سے انھیں پہچان جاؤں۔"

رودولفو نے مظلوم لوسادیا کے پُرزور استدلال کا ایک ہی جواب دیا۔ اُس نے اس

پر پھیر ہاتھ ڈالا۔ اس کی تذلیل اور اپنی عیاشی پہ مہر ثبت کرنے کا ثبوت دے رہا تھا۔ جب لوسادیا نے یہ دیکھا تو اس نے اک ایسی بڑھتی ہوئی قوت کے ساتھ جو اس کی کم سنی سے متوقع نہیں تھی۔ ہاتھوں، پیروں، دانتوں اور بیان سے کام لیتے ہوئے اپنی مدافعت کی، وہ کہنے لگی :

" تم جو بھی ہو اے نمک حرامی خدائی خوار سنگ دل، یاد رکھ کہ جو کچھ تم نے مجھ سے حاصل کیا ہے وہ تم اک درخت یا اک جامد ٹھنٹھ سے بھی چھین جھپٹ سکتے ہو اور یہ فتح وظفر تمھاری روسیاہی اور ذات کی دلیل ہے۔ اب جس بات کی تم کوشش کر رہے ہو وہ میری موت کے بغیر پورا ہونے سے رہی۔ جب میں بے ہوش تھی، تم مجھ پر چھا گئے اور مجھے برباد کر ڈالا، لیکن اب کہ مجھ میں قوت موجود ہے پہلے میری موت ہوگی اور پھر تمھاری فتح۔ اب اگر جاگتے دیکھتے ہوئے بھی میں تمھاری مکروہ مرضی کے آگے حیل و حجت کے بغیر جھک جاؤں تو تم خیال کرو گے کہ جس وقت تم نے مجھے تباہ کیا تھا، میری بے ہوشی مکارانہ تھی۔"

لوسادیا کی مدافعت اس قدر سخت اور جرأت مندانہ تھی کہ رودلفو کی خواہش اور قوت ٹھنڈی پڑ گئی۔ چونکہ لوسادیا کی آبروریزی کا خیال حرامکاری کی خواہش کے سوا اور کسی بات کا مرہونِ منت نہ تھا اور ایسا خیال کبھی بھی سچی محبت کا سرچشمہ نہیں ہوا کرتا۔ اب، اس کے دل میں اس عارضی تخیال کی جگہ اگر ندامت و پشیمانی کا احساس نہیں تھا تو کم از کم امداد کی موہوم آرزو موجود تھی۔

رودلفو پژمردہ اور تھکا ہوا تھا۔ اک لفظ تک منہ سے نہ نکالا اور لوسادیا کو اپنے بستر اور گھر میں چھوڑتے ہوئے دروازے میں تالا ڈال دیا اور اپنے دوستوں کی تلاش میں چل نکلا کہ ان سے مشورہ کرے کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

جب لوسادیا کو محسوس ہوا کہ وہ مقفل کمرے میں اکیلی ہے تو پلنگ سے اٹھی اور ادھر

اُدھر پھرنے لگی۔ ہاتھوں سے دیواروں کو چھو رہی تھی کہ باہر جانے کا کوئی دروازہ مل جائے یا کوئی کھڑکی ہو کہ اس سے کود پڑے۔ دروازہ اسے مل تو گیا مگر بُری طرح مقفل تھا۔ اک کھڑکی بھی پالی جسے کھولا تو چاند کی روشنی اس درخشانی سے اندر آگئی کہ لوسا دیا ان چیزوں کے رنگوں کو دیکھ سکتی تھی جو دیواروں سے لٹکتی ہوئی زینت آرائی کر رہی تھیں۔ اس نے پلنگ کو دیکھا جس پر سونے کا ملمع ہو رہا تھا اور اتنے ٹھاٹھ سے آراستہ تھا کہ شریف شہری کے ہونے کے بجائے کسی شہزادے کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کرسیوں اور میزوں کی گنتی کی۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ دروازہ کون سے رُخ پر ہے اور اگرچہ بہتیری تصویریں دیواروں سے آویزاں دیکھیں مگر ان کے موضوع اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ کھڑکی وسیع تھی اور اس کے تحفظ اور سجاوٹ کا کام لوہے کی بھاری جالی کر رہی تھی۔ یہ باغ میں کھلتی تھی جسے اونچی اونچی دیواروں نے گھیر رکھا تھا۔ ———————————

———————————۔ گویا اس کے کود کر بازار میں پہنچنے کی تدبیر میں اک اور رکاوٹ کھڑی تھی۔ کمرے کے سائز اور اس کے بیش قیمت آرائشی ساز و سامان سے وہ سمجھ گئی کہ اس کا مالک کوئی صاحب منصب وزیر ہے اور صرف متوسط ہی نہیں بلکہ امیر آدمی ہے کھڑکی کے پاس لکھنے پڑھنے کی میز پڑی تھی جس پر چاندی کی مجسمے دار صلیب رکھی تھی اسے اس نے چوری یا خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں بلکہ اک دانشمندانہ منصوبے کے ماتحت اٹھا کر اپنے جامے کی آستینوں میں چھپا لیا۔ اس کے بعد دریچہ پہلے کی طرح بند کر دیا اور پلنگ پر آ کر انتظار کرنے لگی کہ دیکھیے اپنی بدقسمتی کے اس آغازِ بد کا کیا انجام ہوتا ہے۔

اس کے خیال کے مطابق ابھی ایک آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا ہو گا کہ اتنے میں دروازے کو کھلتے سنا۔ ایک شخص اس کے پاس آیا اور اس نے منہ سے اک لفظ کہے بغیر اس کی آنکھوں پر رومال باندھ دیا اور بازو پکڑ کر باہر لے آیا۔ ایک دفعہ اور اس کے کانوں میں دروازے کے مقفل ہونے کی آواز آئی۔ یہ شخص رودلفو تھا جو گیا تھا دوستوں کی تلاش میں مگر بعد میں ارادے کو بدل ڈالا کہ یہ

اس کے حق میں بہتر نہیں تھا کہ جو کچھ لڑکی کو پیش آیا تھا، انھیں اس کا گواہ بننا پڑے۔ اس کے برعکس اس نے یہ ٹھان لیا کہ ان سے کہے گا کہ اپنی کرتوت سے شرمندہ ہوکر اور اس کے آنسوؤں کی تاب نہ لاتے ہوئے اسے سڑک پر چھوڑ آیا ہوں۔

اس ارادے کے پیشِ نظر وہ جلد لوٹ آیا کہ پو پھٹنے سے پہلے پہلے جہاں لوسادیا نے کہا تھا اسے وہیں گرجے کے پاس چھوڑ آئے۔ ورنہ دن کے اجالے میں اسے باہر نکالنا دشوار ہو جائے گا اور اسے مجبوراً لڑکی کو آئندہ شب تک اپنے کمرے میں ہی ٹھہرانا پڑ جائے گا اور اس قیام کے دوران وہ نہ تو اس سے اور متمتع ہونے کا آرزومند تھا اور نہ ہی موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ اسے پہچان لے۔ وہ اسے 'این تامی انتو' نامی مشہور چوک میں لے آیا۔ یہاں اس نے اک نقلی آواز نکالی اور پرتگالی اور ہسپانوی زبانوں کو مخلوط کر کے بولا۔ "اب خوف ڈر کے بغیر اپنے گھر کو جا سکتی ہو کہ کوئی تمھارا پیچھا نہیں کرے گا۔" ابھی وہ رومال کو آنکھوں سے ہٹانے بھی نہ پائی تھی کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

لوسادیا تن تنہا چھوڑ دی گئی تھی۔ اس نے پٹی اتاری، جس مقام پر تھی اسے پہچان لیا اور چاروں طرف دیکھا پر کوئی نظر نہ آیا، لیکن شک ہی تھا کہ کوئی نہ کوئی دور رہتے ہوئے، اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اس لیے اگرچہ گھر نزدیک ہی تھا ادھر کو ہر ہر قدم اٹھاتے ہوئے ٹھہر ٹھہر جاتی تھی۔ اگر کچھ جاسوس اس کا پیچھا کر بھی رہے ہوں تو ان کو گمراہ کرنے کی غرض سے وہ ایک گھر میں داخل ہو گئی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور چند ثانیوں کے بعد اپنے گھر کو چل نکلی جہاں اس نے والدین کو حیران اور ششدر پایا۔ انھوں نے کپڑے بھی نہ اتارے تھے کہ انھیں آرام کرنے کا خیال تک نہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس کی طرف دوڑے آئے اور با چشمِ نم سینے سے لگایا۔

لوسادیا سراسر خوفزدہ اور لرزاں تھی۔ وہ اپنے والدین کو ایک طرف لے گئی اور مختصر الفاظ میں تمام متعلقہ واقعات کے ساتھ اپنا تباہ کن تجربہ بیان کر دیا۔ اس نے اپنی عزت کے چور، بالجبر کرنے والے کی شناخت سے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ جو جو کچھ اس نے اس تھیٹر کی سٹیج پر جہاں اس کی

بدقسمتی کا المیہ کھیلا گیا تھا، دیکھا تھا وہ بھی بتایا۔ دریچہ، باغ، لوہے کی جالی، میزیں، پلنگ، دیواروں کے معلقات اور بالآخر وہ مجسمے وار صلیب بھی دکھائی جسے وہ اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اس مقدس مجسمے کا دیکھنا تھا کہ ان کے آنسو پھر رواں ہو گئے، وہ اپنی بدنصیبی کو رو رہے تھے۔ وہ ظالم کے لیے انتقام اور ربّانی سزا کی دعا مانگ رہے تھے، وہ کہنے لگی: "مجھے تو اس بات کی خواہش نہیں ہے کہ میں معلوم کروں وہ ظالم کون تھا۔ اگر آپ اس کے متعلق جاننا بہتر سمجھیں تو یہ اس مجسمہ کے ذریعے ہو سکتا ہے وہ یوں کہ آپ شہر بھر کے گرجوں کے محافظوں سے منبر پر اعلان کروا دیں کہ جو بھی متعلقہ مجسمہ کھو بیٹھے ہیں اسے اپنے منتخب پادری سے وصول کر لیں۔ اس طرح مالک کا پتا لگنے کے بعد اس دشمن کے حلیے اور خاندان کا بھی پتا چل جائے گا۔"

اس کے باپ نے جواباً کہا: "بیٹی تو نے جو کچھ کہا ہے وہ تو جبھی ٹھیک رہے گا اگر لوگوں کا بغض و عناد تیرے الفاظ کی دانشمندی کو جھٹلا نہ دے۔ کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ آج فوری طور پر یہ مجسمہ اس کمرے سے غائب ہو رہا ہو گا جس کے متعلق تم نے ابھی بیان کیا ہے اور صاحبِ خانہ کو بھی اس بات کا یقین ہو گا کہ اسے وہی لے گیا ہے جو اس کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ یہ مجسمہ فلاں پادری کے پاس ہے تو اس کے بجائے کہ ہم مالک کا کھوج لگائیں، اُلٹا وہی کسی اور کو مجسمے کا پورا پورا آتا پتا دیکر پادری کے پاس وصولی کے لیے بھیج دے گا اور یہ بھی معلوم کرے گا کہ پادری کو مجسمہ دینے والا کون تھا۔ یہی چال ہم بھی چل سکتے ہیں کہ کسی اور شخص کے ذریعے مجسمے کو پادری کے حوالے کر دیں مگر اس طرح صحیح اطلاع حاصل کرنے کی بجائے اور بھی الجھاؤ میں پڑ جائیں گے۔ سو بیٹی! نہیں چاہیے کہ اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دو کہ جس طرح یہ تمھاری تذلیل کا گواہ ہے، تم سے انصاف بھی کرے گا۔ اور تم جانو میری بیٹی! کہ اعلانیہ تشہیر کا ایک تولہ سیروں ڈھکی چھپی رسوائی سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ چونکہ تم خدا کے حضور علی الاعلان عزت سے بسر کرو گی اس لیے غم نہ کھانا کہ تم اپنی نگاہوں میں باطناً اپنی عزت لٹا چکی ہو۔ گناہ — اصل بے عزتی ہے اور نیکی — سچی عزت۔ یہ تو قول فعل

اور خیال ہی میں جن سے خدا ناخوش ہوتا ہے اور چونکہ تم نے اپنے قول فعل اور خیال سے اُسے ناخوش نہیں کیا - اس لیے اپنے آپ کو راستباز سمجھو اور میں بھی تمھیں ایسا ہی سمجھتا ہوں اور ایک سچے اور پیارے باپ کی طرح ہی تمھیں دیکھوں گا۔"

دانش مندی کے ان الفاظ کے ساتھ لوساڈیا کے باپ نے اس کو تسلی دی - اور ماں نے اپنے بازو اک بار پھر اس کے گرد حمائل کر کے اپنے بس بھر تسکین بخشی جس سے اس کی آہ و زاری اور آنسوؤں کا بند پھر ٹوٹ گیا - اب لے دے کے وہ یہی کر سکتی تھی کہ جیسا کہتے ہیں، سر چھپائے اور شریفانہ طور پر والدین کے زیر سایہ شائستگی کے ساتھ غریبانہ زندگی بسر کرے۔

اس اثنا میں جب رودلفو گھر لوٹا تو مجسّمے دار صلیب کو غائب پایا مگر اسے سوجھ گئی کہ لے جانا والا کون تھا - امیر آدمی تھا - ذرا بھی اہمیت نہ دی - تین روز بعد جب وہ اٹلی کے سفر پر تیار ہوا تو اس نے کمرے کی سب اشیا کی فہرست اپنی والدہ کی خادماؤں میں سے ایک کے سپرد کر دی - اس میں صلیب کا ذکر نہیں تھا اور نہ ہی اس کے والدین نے اس کے متعلق اس سے پوچھ گچھ کی -

کئی دنوں سے رودلفو کے دل میں اٹلی جانے کی سمائی ہوئی تھی - اس کا باپ وہاں سے ہو آیا تھا - اور اس سے جانے کے لیے اصرار کر رہا تھا - کہتا تھا اگر کوئی رئیس زادہ اپنے یہاں ہی یوں بنا بیٹھا ہے تو وہ اصل رئیس زادہ نہیں، جب تک کہ وہ خود کو غیر ممالک میں بھی ایسا ہی ثابت نہ کر دکھائے - یہ ایک اور کئی اور وجوہات کی بنا پر رودلفو کا رجحانِ طبع باپ کی مرضی سے صاد تھا جس نے بارسیلونا، جینوا، روم اور نیپلز کے لیے بڑی بڑی رقموں کی ہنڈیاں اس کے حوالے کیں - فوجیوں کی اٹلی اور فرانس کی بھری پُری سراؤں کی باتیں اور اہلِ ہسپانیہ کی آزادی کے قصے جس سے وہ وہاں متمتع ہوئے تھے، اس کے شوق کو مہمیز ثابت ہوئے - وہ فوراً اپنے دو دوستوں سمیت روانہ ہو گیا - "آئیے نفیس آختہ مرغے - کبوتر کے چوزے - سؤر کی سبزی والی خستہ ران - اور گوشت بھری آنتیں کھائیے - آئیے!" یہ آواز

اسے پسند تھی - ان لذائذ کے علاوہ اسی طرح کی اور بھی اشیائے خوردنی کی بانکیں فوجی اپنی مراجعتِ وطن پر برباد کیا کرتے تھے اور ہسپانیہ کی سراؤں اور اقامت گاہوں کی جز رسیاں اور زحمتیں انھیں تکلیف دہ محسوس ہوتی تھیں - بآخر وہ چل پڑا اور لوسادیا کے ساتھ جو واقع پیش آیا تھا اس کی یاد اس کے دل میں اتنی تھی کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

ادھر تو یہ ہو رہا تھا اور ادھر لوسادیا اپنے والدین کے گھر زندگی کے دن بسر کر رہی تھی۔ حتی الامکان دور دور رہتی۔ کسی سے ملتی جلتی بھی نہیں تھی کہ مبادا کوئی اس کے بشرے سے اس کی بدقسمتی کو پڑھ لے۔ بہت مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ اسے معلوم ہوا کہ اب تک جو کچھ اس نے اپنے ارادے سے کر رکھا تھا، وہی اُسے مجبوراً کرنا پڑے گا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ جو وہ الگ تھلگ اور چھپتی چھپاتی رہا کرتی تھی یہ اس کے حق میں مناسب رہا کہ وہ اُمید سے تھی اور نتیجتہً وہ آنسو جو کچھ عرصے سے تھمے ہوئے تھے پھر سے اس کی آنکھوں میں ابل پڑے اور اس کی آہ و زاری نے پھر سے فضا کو چھلنی چھلنی کر دیا۔ ماں کی سعیٔ تسکین اس کے لیے لاحاصل رہی۔

وقت اڑتا گیا اور بچے کی پیدائش کی گھڑی آ گئی۔ اس قدر رازداری سے کام لیا کہ دایہ تک نہ بلائی۔ ماں نے اس منصب کو اپنے لیے وقف کر لیا۔ لوسادیا نے چاند سے بچے کو جنم دیا۔ اتنا خوب صورت کہ اس سے بڑھ کر حسین بچہ تصور میں نہیں آ سکتا۔ جس رازداری اور حزم کو پیدائش کے وقت بروئے کار لایا گیا تھا، اسی سے پھر کام لے کر بچے کو گاؤں میں بھیج دیا۔ جب چار سال کا ہوا تو نانا اسے اپنے گھر لے آیا اور مشہور کر دیا کہ یہ اس کا بھانجا ہے۔ اس کی تربیت اگر امیرانہ نہیں تو کم از کم دیندارانہ ضرور ہو رہی تھی۔

بچے کا نام نانا کے نام پر لُوِاِتس رکھا گیا۔ بچہ چہرے مہرے کا حسین۔ مزاج کا نرم۔ سمجھ کا تیز تھا۔ اس صغر سنی میں اس کے جتنے بھی کام تھے صاف گواہی دے رہے تھے کہ کسی عالی نسب باپ کا بچہ ہے۔ بچے کے حسن، فہم و ذکا اور طور اطوار نے نانا نانی کے دلوں میں اس

قدر محبت بھر دی کہ وہ سمجھنے لگے کہ ہماری بیٹی کی بدقسمتی نے ایک رحمت کی صورت اختیار کر لی ہے جو یہ نبیرہ نصیب ہو گیا۔ جب وہ گلیوں سے گزرتا تو دعائیں اس پر نچھاور ہوتیں۔ کوئی اس کے حسن کی خاطر دعا دیتا۔ کوئی اس کی ماں کو دعا دیتا جس نے اسے جنا اور کوئی اس کے باپ کو جو اسے دنیا میں لانے کا باعث ہوا اور کوئی انھیں دعائیں دیتا جنھوں نے اس کی اتنی اچھی تربیت کی ہے۔

اپنے جاننے والوں کی تعریف و تحسین کے درمیان بچّہ سات سال کی عمر کو پہنچ گیا اور اس وقت تک وہ لاطینی اور ہسپانوی زبانیں پڑھ لیتا تھا اور اس کی املا صاف اور اچھی تھی۔ اس کے نانا نانی کا ارادہ تھا کہ چونکہ وہ اسے دولت مند نہیں بنا سکتے۔ عالم فاضل اور راست باز بنا دیں گے۔ گویا دانشمندی اور راستبازی ایسے خزانے نہیں ہیں جن پر نہ تو چوروں کو اور نہ ہی نام نہاد دولت کو دسترس حاصل ہو۔

ایک دن یوں ہوا کہ بچّہ اپنی نانی کا پیغام کسی رشتہ دار کے ہاں لے جا رہا تھا کہ اتفاقاً اس کا گزر ایسے بازار سے ہوا جہاں گھڑ دوڑ ہو رہی تھی۔ وہ دیکھنے کو ٹھہر گیا اور بہتر جگہ حاصل کرنے کے خیال سے سڑک کے اس پار اس لمحے جانے لگا جب اس کے لیے یہ ناممکن تھا کہ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی ٹکّر سے بچ نکلے۔ سوار بھی گھوڑے کو تھام نہ سکا۔ گھوڑا اس کے اوپر سے گزر گیا اور مرا ہوا سمجھ کر بڑھ گیا۔ خون کی تلیاں سر سے بہ رہی تھیں۔ حادثے کا وقوعہ ہوا ہی ہو گا کہ اتنے میں ایک معمر رئیس جو گھوڑ دوڑ دیکھ رہا تھا اپنے گھوڑے سے کودا اور ایک ناقابلِ یقین پھرتیلے پن کے ساتھ بچّے کے پاس آ رہا اور اس شخص کے بازوؤں سے لے لیا جس نے اسے اٹھا لیا تھا۔ نہ تو اس نے اپنے بڑھاپے کا خیال کیا اور نہ ہی اپنے رتبے کا جو بلند و عالی تھا۔ اور تیز قدمی سے گھر کو چل نکلا اور نوکروں کو حکم دیا گیا کہ اس کے ساتھ نہ آئیں بلکہ جا کر کسی ڈاکٹر کو بلا لائیں جو بچّے کی مرہم پٹی کرے۔ بہت سے شرفا اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے اور اس قدر حسین بچے کی بدقسمتی پر متاسف تھے۔

خبر پھیل گئی تھی کہ زخمی بچہ اپنے نانے کا ہم نام لی ای سی کو ہے اور کسی شریف آدمی کا بھانجا ہے۔ اس واقعہ کی خبر ایک سے دوسرے تک جو پہنچی تو شدہ شدہ اس کے نانا نانی اور پس پردہ راز ماں کے کانوں میں بھی جا پہنچی اور جب انھیں اصل حقیقت کا پتا چلا تو وہ ان لوگوں کی مانند دوڑ نکلے جو اپنے محبوب کی تلاش میں ہوش و حواس کھو بیٹھے ہوں۔ چونکہ جو رئیس بچے کو اٹھا کر لے گیا تھا، خاصا مشہور اور اہم شخص تھا اس لیے وہ جن سے بھی ملے انھوں نے جائے رہائش کا پتا بتا دیا اور وہ عین اس وقت پہنچے جب سرجن بچے کا معالجہ کر رہا تھا۔

صاحبِ خانہ اور اس کی بیگم نے ان سے جنھیں وہ بچے کے والدین سمجھتے تھے التماس کی کہ روئیں نہیں اور نہ ہی واویلا کریں کہ اس سے بچے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ لائق سرجن نے زخموں کی مرہم پٹی بڑی احتیاط اور قابلیت سے کی اور کہنے لگا۔ "پہلے مجھے اندیشہ تھا کہ زخم کاری ہوں گے مگر کچھ ایسے کاری نہیں۔" مرہم پٹی کے دوران تو اس کو ہوش آگیا اور اسے اپنے معزوضہ ماموں مامی کو دیکھ کر بڑی تسکین ہوئی۔ انھوں نے باچشم نم اس کی کیفیت پوچھی۔ اس نے جواب دیا۔ "اچھا ہوں۔ مگر بدن اور سر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔" ڈاکٹر نے حکم دیا۔ "اس سے باتیں نہ کیجیے بلکہ آرام کرنے دیجیے۔" اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔ بچے کے نانا نے صاحبِ خانہ کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اس کے بھانجے سے اتنی مہربانی سے پیش آیا ہے۔ اس نے جواباً کہا۔ "شکریہ ادا کرنے کی تو کوئی بات نہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ گھوڑے نے بچہ دے پٹخا اور کچل ڈالا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوا گویا میری آنکھوں کے سامنے میرے اپنے اس بچے کا چہرہ آگیا ہے جو مجھے بہت محبوب ہے۔ یہ بات تھی جس نے انگیخت کیا اور میں اسے بازوؤں میں لے کر اپنے گھر اٹھا لایا۔ تندرست ہونے تک اب یہیں ٹھہرے گا اور یہاں اسے کسی چیز کی حاجت نہ رہے گی۔" اس کی بیگم اونچے گھرانے کی بی بی تھی اس نے صرف خاوند کے کہے ہی کا ساتھ نہ دیا بلکہ اور بھی بڑھ چڑھ کر تسلی آمیز الفاظ کہے دونوں بزرگ ان کے مسیحی کردار سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور ماں کی تو پوچھو نہیں۔

خون کی کشش

سر جن کے الفاظ نے اس کی دکھی روح کو قدرے تسکین بخشی - جب اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا جہاں اس کا بچہ پڑا تھا تو بہت سی جزئیات کے ماتحت پہچان گئی کہ یہ وہی کمرہ تھا جس میں اس کی عزت کا خاتمہ اور بدقسمتی کا آغاز ہوا تھا - گو اس کی آرائستگی اندنوں کے مشقی مشجر معلفات سے نہیں ہو رہی تھی - اس کی چیزوں کی ترتیب اور وہ جالی دار غرفہ جو باغ میں کھلتا تھا اس کی نظر میں تھا - چونکہ بیمار بچے کی وجہ سے بند پڑا تھا اس نے پوچھا کہ اس کا رخ باغ ہی کی طرف ہے تو جواب مثبت تھا - لیکن جو چیز اس نے سرجاً پہچان لی وہ پلنگ تھا جو اس کا سنگ مزار ثابت ہوا تھا - اس کے علاوہ وہ لکھنے پڑھنے کی میز بھی اپنی جگہ پر قائم تھی جس پر مجسمہ دار صلیب پڑی تھی اور جسے وہ اپنے ساتھ اٹھالے گئی تھی - سب سے آخر میں اس کے شبہات کی حقیقت کی تصدیق سیڑھیوں نے کر دی جن سے وہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جائی گئی تھی یعنی وہی سیڑھیاں جو بازار کو جاتی تھیں اور جن کو اس نے دور اندیشانہ طور پر گن لیا تھا اور جب وہ بچے سے رخصت ہو کر اپنے گھر کو لوٹی تو پھر ان سیڑھیوں کو گنا اور تعداد کو یکساں پایا - اس نے کئی اور نشانیوں کو ایک دوسرے سے ملایا اور قطعی یقین ہو گیا کہ اس کے نتائج مبنی بر حقیقت تھے -
اس نے تفصیل کے ساتھ ماں کو آگاہ راز کر دیا - ماں نے حزم و احتیاط سے اس بات کی ٹوہ لگانی شروع کر دی کہ جن صاحب کے ہاں اس کا دوپٹا پڑا ہوا ہے - ان کے ہاں اب یا جب کوئی بیٹا بھی ہوا ہے - اسے معلوم ہو گیا کہ رودلفو (جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں) انہی کا بیٹا ہے اور اٹلی میں موجود ہے - رودلفو کے سپین سے باہر جانے کے وقت سے حساب جو لگایا تو اس کے دوپٹے کی عمر کے سات سال نکلے -

اس نے ان سب باتوں کا ذکر اپنے خاوند سے کر دیا اور میاں بیوی اور بیٹی کے مابین یہی صلاح ہوئی کہ منتظر رہیں اور دیکھیں خدا زخمی بچے سے کیا کرتا ہے - بچہ پندرہ روز کے بعد خطرے سے باہر تھا - تیس دنوں کے بعد اس نے چارپائی چھوڑ دی - اس سارے عرصے میں اس کی ماں اور نانی اسے دیکھنے آتی رہیں اور صاحب خانہ اس سے یوں پیار کرتے رہے گویا وہ ان کا اپنا بیٹا

ہے ۔ اکثرا وقات ۔ دونا ایس تی فی نی آ ۔ کہ معزز آدمی کی بیوی کا نام تھا۔ لوسادیا سے باتوں باتوں میں کہہ بھی چکی تھی ۔" اللہ ! یہ بچہ میرے اپنے بچے سے جو اٹلی میں ہے ، کس قدر مشابہت رکھتا ہے اور میں جب بھی اس پر نگاہ کرتی ہوں ہمیشہ میرا اپنا بچہ میری نظروں تلے آجاتا ہے ۔"

ان باتوں سے لوسادیا کی حوصلہ افزائی ہوئی اور ایک دفعہ جب وہ بیگم کے ساتھ تنہا بیٹھی تھی ۔ اس نے موقع کا فائدہ اٹھا کر چند ایسی باتیں کہہ دیں جو سوچ بچار کے بعد لوسادیا اور اس کے والدین کے درمیان طے ہو گئی تھیں ۔ وہ کم و بیش کچھ اس طرح پر تھیں ۔

" بیگم صاحبہ ! جس روز میرے والدین نے سنا کہ ان کا بھانجا اس بری طرح زخمی ہو گیا ہے تو انہیں یہی محسوس ہوا کہ آسمان نے ان سے نگاہیں پھیر لی ہیں اور اک جہانِ ستم ان پر ٹوٹ پڑا ہے ۔ انہیں معلوم ہو رہا تھا کہ اس بچے کے کھو جانے سے ان کی آنکھوں کا نور اور عمر کا سہارا چھن رہا ہے کہ وہ اس سے وہ محبت کرتے ہیں کہ اور والدین کی محبتِ اولاد بھلا ان کی محبت کا کیا مقابلہ کرے گی ۔ وہ جو کہتے ہیں ۔" جب خدا زخم دیتا ہے تو مرہم بھی بخشتا ہے ۔" تو اس بچے کی مرہم اس گھر میں مل گئی ۔ اس بچے میں چند ایسی باتوں کی یادیں دیکھ رہی ہوں جنہیں میں تا دمِ مرگ نہیں بھول سکتی اور میں معزز گھرانے کی بیٹی ہوں کہ میرے والدین عزت مند ہیں اور میرے سب آباؤ جد معزز ۔ اور گو بیگم صاحبہ دولت ان کے یہاں فراوانی سے نہیں تھی مگر جہاں بھی رہے عزت پر حرف نہیں آنے دیا ۔"

دونا ایس تی فی نی آ جب لوسادیا کی باتیں سنتی تھی تو اس کا دل حیرت و توصیف سے معمور ہو جاتا تھا اس کا خیال تھا اس کی عمر بیس بائیس کے لگ بھگ ہوگی اور اگرچہ سب کچھ اس کے سامنے تھا پھر بھی اسے مشکل سے یقین آ رہا تھا کہ کوئی اتنی چھوٹی عمر میں اس قدر دانش مند ہو سکتا ہے ۔ وہ چپ چاپ بغور سن رہی تھی اور لڑکی دل کھول کر بیان کر رہی تھی ۔ ـــــ اس کے بیٹے کا ظالمانہ مذاق ۔ اس کی آنکھیں باندھ کر اٹھالے جانا اور اس کمرے میں لے آنا اور نشانیوں سے پتا چلنا کہ یہی وہ کمرہ ہے جس کا اسے شک تھا اور اپنے الفاظ کی

تصدیق کے لیے اس نے سینے سے اس صلیب کو نکال لیا جسے یہاں سے اٹھا لے گئی تھی۔ اسے مخاطب کر کے کہنے لگی "اے خداوند خدا! تو کہ میرے جوہر عصمت کے لٹنے کا گواہ ہے اب اس معاوضے کا بھی منصف ہو جیو جس کی میں مستحق ہوں۔ میں نے تجھے لکھنے پڑھنے کی میز سے اسی لیے اٹھایا تھا کہ اس زیادتی کی یاد دہانی کراؤں جو مجھ سے روا رکھی گئی تھی۔ میں تجھ سے انتقام کی منت نہیں کرتی کہ اس چیز کی مجھے جستجو نہیں۔ لیکن تجھ سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے اتنی تشفی بخش کہ میں اپنی بدنصیبی کو صبر سے برداشت کر دوں۔ یہ بچہ بیگم صاحبہ! جس پر آپ نے اتنی عنایات کی ہیں، آپ کا حقیقتاً پوتا ہے۔ یہ خدا کی مرضی تھی کہ وہ یوں گھوڑے تلے آئے اور یہاں لایا جائے اور اس کے یہاں لائے جانے میں، میری آرزو ہے کہ یہیں مجھے وہ بہترین مداوا مل جائے جو میری بدقسمتی کا نعم البدل ہو اور اگر یہ نہیں تو کم از کم کوئی ایسا چارۂ کار نصیب ہو جس کے سہارے میں اپنی بدنصیبی کو برداشت کرتی چلی جاؤں۔"

ان الفاظ کے کہنے کے ساتھ ہی اس نے صلیب کو سینے سے لگا لیا اور بے ہوشی کے عالم میں "ڈونا ایس ٹی فی نی آ" کی بانہوں میں گر گئی۔ ڈونا ایک عالی نسب خاتون تھی جس کے دل میں درد اور رحم بالطبع یوں جاگزیں تھے جس طرح مردوں کے دلوں میں ظلم۔ اس نے ایک عالی نسب خاتون ہی کی مانند اپنے گال بے ہوش لوسادیا کے چہرے کے ساتھ پیوست کر دیئے اور آنسوؤں کا اک دریا بہا دیا جن کے ہوتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کے لیے کسی اور پانی کی ضرورت نہ رہی۔

جب وہ اس عالم میں تھیں تو اتفاقاً ڈونا کا خاوند لی ای سی کو کو انگلی سے پکڑے اس کمرے میں آنکلا۔ بیوی کو گریہ کناں اور لوسادیا کو بیہوش دیکھ کر اس نے فوراً معاملے کی وجہ دریافت کی۔

بچہ ماں کو خالہ سمجھتا تھا لہٰذہ ماں اور اپنی مربی دادی سے لپٹ کر پوچھنے لگا کہ وہ کیوں رو رہی ہیں۔ بیگم نے جواب دیا۔ "باتیں بہت اہم ہیں میرے سرتاج! جو آپ کے گوش گزار ہونا

ضروری ہیں۔ مختصراً یوں عرض ہے کہ یہ لڑکی جو بے ہوش پڑی ہے آپ کی بیٹی ہے اور یہ لڑکا آپ کا پوتا۔ یہ حقیقت جو عرضِ خدمت ہے مجھے اسی بچی نے بتائی ہے اور اس کی تصدیق بچے کا چہرہ کر رہا ہے جو ہم دونوں کو اپنے بیٹے کا چہرہ معلوم ہوتا ہے۔"

"بیگم! جب تک تم اور وضاحت سے کام نہ لو گی میں تمھاری بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

اس لمحے لوسادیا کو ہوش آگیا اور اس نے صلیب کو گرفت میں لے کر یوں رونا شروع کر دیا گویا لوسادیا، لوسادیا نہیں آنسوؤں کا سمندر ہے۔ اس تمام مشاہدے نے رئیس آدمی کو بھونچکا کر رکھا تھا۔ خدا کے فضل و کرم سے اس نے ان باتوں کو یوں حق الیقین سمجھا گویا بہت سی سچی گواہیوں نے اس کے سامنے ان کی تصدیق کر دی ہے۔

اس نے لوسادیا کو تسلیاں دیں۔ سینے سے لگایا، پوتے کو چوما اور اسی روز نیپلز کو خط روانہ کر دیا جس میں اس نے بیٹے کو فوراً پلٹنے کی ہدایت کی تھی۔ لکھا تھا "ہم تمھاری شادی اس عورت سے رچا رہے ہیں جس کا حسن الفاظ بیان نہیں کر سکتے اور جو قطعاً تمھارا مناسب جوڑ ہے۔"

جب لوسادیا نے اپنے بچے کے ساتھ والدین کے یہاں جانے کی اجازت چاہی تو اس نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ لوسادیا کے والدین اپنی بچی کی خوش بختی پر مسرور و نازاں تھے اور خدا کا لامتناہی شکر ادا کر رہے تھے۔

خط نیپلز میں پہنچ گیا۔ رودلفو اس دلہن کو اپنانے کے لیے بے چین تھا جو اس کے باپ نے اس کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ چار جہاز ہسپانیہ جانے کے لیے تیار کھڑے تھے اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور دو روز بعد ہی اپنے دو دوستوں کے ساتھ سوار ہو گیا جو لمحہ بھر کے لیے بھی اس سے جدا نہ ہوئے تھے۔ خوشگوار موسم نے بارہ روز میں انھیں بارسلونا پہنچا دیا اور وہاں سے ڈاک گاڑی میں اور سات روز بعد تولدو پہنچ گئے۔ وہ جب اپنے والدین کے گھر داخل ہوا تو اس قدر حسین اور بانکا دکھائی دے رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا نئے فیشن کا

خون کی کشش

بلوریں مجسمہ ہے جسم رعنا سانچے میں ڈھل رہا تھا۔

اس کے والدین اپنے بیٹے کی کامل صحت اور آمد پر بے حد مسرور تھے۔

لوساد یا نے دونا ایس تی فی نی آ۔ کے حکم اور اشارے کے اتباع میں اپنے آپ کو چھپا رکھا تھا۔ وہ اسے جذبات اور حیرت کی نظر سے تک رہی تھی۔ رودلفو کے ساتھی اپنے گھروں کو جانے کے لیے مضطرب تھے مگر دونا نے ان کی ایک نہ سنی کہ وہ اس کے منصوبے کے لیے لابدی تھے۔

جب رودلفو پہنچا تو رات ہو رہی تھی۔ ادھر کھانا تیار ہو رہا تھا اور ادھر دونا ایس تی فی نی آ ان دو کو ایک طرف لے گئی۔ لوساد یا نے اسے بتا دیا تھا کہ جس رات ان کا بیٹا اسے اٹھا لے گیا تھا۔ اس کے ساتھ تین اور شخص بھی تھے اور ایس تی فی نی آ" کو یقین تھا کہ ان تینوں میں سے دو تو یہ ضرور ہوں گے۔ وہ ان کو ایک طرف لے جا کر بڑے خلوص سے تفتیش کر کر کے پوچھنے لگی "برسوں ادھر کی بات ہے میرا بیٹا ایک لڑکی فلاں رات اٹھا لایا تھا۔ کیا تمہیں یاد ہے؟ اور اگر یاد ہے تو مجھے بتاؤ کہ اس بات کی حقیقت کی آگاہی میرے خاندان اور عزیز و اقارب کی توقیر اور سکونِ دل کے لیے نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے۔" اس نے انہیں یقین دلایا کہ واقعے کی سچائی کے اظہار سے انہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا اور اتنے موثر انداز سے منتیں کرتی چلی گئی کہ انھیں اقبال کرتے ہی بنی کہ "گرمیوں کی ایک رات کا ذکر ہے۔ ہم اور ایک اور دوست رودلفو کی معیت میں جا رہے تھے۔ جو ہم نے ایک لڑکی کو قابو کر لیا۔ رودلفو اسے اٹھا لے گیا اور ہم نے خاندان کے دوسرے افراد کو روکے رکھا جو اپنی چیخ پکار سے اسے بچانا چاہتے تھے۔ دوسرے روز رودلفو نے ہمیں بتایا کہ وہ اسے اپنے گھر لے گیا تھا۔ اس کے سوا ہمیں اور کچھ معلوم نہیں۔"

اگر اس معاملے کے متعلق اس کے دل میں کچھ شبہے تھے تو ان دو کے اعتراف نے دور کر دیئے۔

اب اس نے اپنے نیک منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عزم کر لیا۔ جو یوں تھا:
وہ ابھی کھانے کے لیے بیٹھنے کو ہی تھے کہ وہ روڈلفو کو تنہا ایک کمرے میں لے گئی اور اس کے ہاتھوں میں ایک تصویر دے کر کہنے لگی "میرے بیٹے روڈلفو! میں تمھیں تمھاری بیوی دکھا کر تمھارے شوق کی اشتہا کو تیز کردوں گی۔ یہ عین بہ عین اس کی تصویر ہے لیکن میں مزید کہوں گی کہ وہ اپنے حسن کی کوتاہی کو اپنی نیکی سے پورا کر دے گی۔ وہ عالی منش، محتاط اور آسودہ حال ہے اور چونکہ تمھارے والد نے اور میں نے اسے تمھارے لیے منتخب کیا ہے یقین جانو وہ تمھارے لیے موزوں ہوگی۔"

روڈلفو نے تصویر کو بغور دیکھا اور کہا:

"عموماً مصور جن چہروں کی تصویریں کھینچتے ہیں ان پر حسن کی دولت لٹا دیتے ہیں۔ اگر یہاں بھی انھوں نے یہی کیا ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ جس کی یہ تصویر ہے، وہ مجسم زشت روئی ہوگی! میں ایمان سے کہتا ہوں مادر محترم! یہ درست و مناسب ہے کہ والدین جو حکم بھی بچوں کو دیں وہ کماحقہٗ اسے بجا لائیں لیکن یہ بھی بہتر و مطبوع شئے ہو گی جو والدین بھی بچوں کو اس سے شادی کرنے دیں جو ان کے حسب پسند ہو۔ چونکہ شادی وہ گرہ ہے جسے موت ہی کھول سکتی ہے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ اس بندش کی ڈوری دونوں طرف سے برابر برابر ہو اور ایک سے دھاگوں سے بٹ رہی ہو۔ اگر مقدر ایک خاوند کو نیک، عالی نسب محتاط اور دنیاوی ساز و سامان والی بیوی بخشے تو وہ اس کے حسب طبیعت تو ہو گی مگر اس کی کم روئی، مجھے ڈر ہے خاوند کی آنکھوں کو مسرت نہیں بخش سکتی۔ اگرچہ میں نوعمر ہوں لیکن اتنی بات صاف سمجھتا ہوں کہ شادی کا مقدس عہد و پیمان میاں بیوی کو ایک دوسرے سے جائز اور مناسب طور پر محظوظ ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ اگر یوں نہیں تو شادی بے جان ہو جائے گی اور اپنے مقصدِ ثانی کے حصول میں ناکام۔ مجھے تو قریباً قریباً یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ آٹھوں پہر، کھانے سونے میں نظروں کے سامنے رہنے والا بدصورت چہرہ مسرت بخش بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

خون کی کشش

اماں! میں تمہیں تمہارے سر کا واسطہ دے کر ملتجی ہوں کہ میرے لیے ایسا ساتھی ڈھونڈنا جسے دیکھ کر مجھے کراہیت نہ ہو، خوشی ہو تاکہ پیچھے ہٹنے اور تعلقات توڑنے کے بغیر بطوع و رغبت اور ہمسری کے ساتھ اس جوئے کا بار اٹھائیں جس کے لیے خدا نے ہمیں متمد کیا ہے۔ اور جو یہ آپ نے کہا ہے کہ یہ خاتون عالی نسب باشعور اور دولت مند ہے تو اسے ایسے خاوندوں کی کمی نہ ہوگی جن کے نکتہ ہائے نظر مجھ سے مختلف ہوں۔ چند ایسے ہیں جو مرتبے کے خواہاں ہیں۔ چند سلیقہ و شعور کے متلاشی ہیں۔ چند دولت کے آرزومند ہیں اور چند حسن کے جویا اور میں آخری زمرے کا آدمی ہوں۔ خدا کا سپاس گزار ہوں اور اپنے آب جد اور والدین کا شکر گزار کہ عالی نسبی مجھے ورثے میں ملی ہے۔ رہی سلیقہ مندی تو عورت نہ تو احمق ہو اور نہ کوڑھ مغز۔ اتنا ہی کافی ہے کہ وہ لوگوں کی توجہ کو اپنی ہمانتروائی سے منعطف نہ کرتی پھرے اور اتنی ہوتق بھی نہ ہو کہ ناکارہ ہو کر رہ جائے۔ جہاں تک دولت کا تعلق ہے والدین کا زر و مال مجھے غریب ہو جانے کی فکر و غم سے آزاد رکھے ہوئے ہے۔ یہ حسن ہی ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔ حسن ہی کی مجھے آرزو ہے۔ جہیز میں تیغہ پاک بازی اور سادگی کردار کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔ اگر میری بیوی یہ کچھ لے آئے تو میں خدا کے احکام خوشی خوشی بجا لایا کروں گا اور والدین کو شاد کام بڑھاپے کا مالک بنا دوں گا۔"

اس کی رائے زنی سے رودلفو کی ماں دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی اور اس کی باتوں سے سمجھ گئی تھی کہ اس کا منصوبہ ٹھیک کام کر رہا ہے۔ ماں نے جواب دیا کہ وہ اس کی شادی اس کی خواہشات کے مطابق رچانے کی کوشش کرے گی اور اسے بیزار اور متفکر ہونے کی ضرورت نہیں کہ تصویر والی خاتون سے شادی کرنے کا جو بندوبست ہو چکا ہے وہ ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس پر رودلفو نے اپنی ممنونیت کا اظہار کیا اور چونکہ کھانے کا وقت ہو چکا تھا وہ اندر آ کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ جب ماں باپ، رودلفو اور اس کے ساتھی براج گئے تو "دونا ایس تی فی نی آ" نے یوں کہا گویا اپنی لاپروائی کو کوس رہی ہو۔ "اف خدایا!

مَیں بھی کیا مہمان داری کر رہی ہوں" اور ایک خادم سے مڑ کر کہنے لگی "فوراً جاؤ اور دونا لوسادیا سے عرض کرو کہ وہ تشریف لا کر ہمارے دسترخوان کو عزت بخشیں اور ہلا پیس و پینش تشریف لائیں کہ جو بھی یہاں حاضر ہیں، میرے بچے ہیں اور ان کے خادم" یہ سب کچھ منصوبے کا ایک حصّہ تھا۔ جس کے متعلق۔ لوسادیا کو پوری طرح آگاہ و تیار کر رکھا تھا۔ تھوڑے ہی وقفے کے بعد لوسادیا موجود ہو گئی۔ اس کے قدرتی حسن کو اور بھی دلربا بنایا گیا تھا اور بناؤ سنگار کی جملہ ترکیبوں سے اس میں اضافے ہو رہے تھے، سردیوں کا موسم تھا۔ اس نے سیاہ مخمل کا حلہ پہن رکھا تھا جس پر بیٹی۔ جواہرات کی زنجیر موتیوں اور سونے کے بٹن اپنی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اس کے لمبے نیم سنہری بال کنٹوپ کا کام دے رہے تھے۔ بالوں کے گھونگھر اور انہیں آراستہ کرنے والے ربن اور تابدار جواہر تماشائیوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ اس کے خامت میں دلربائی تھی اور سراپا میں پن۔ وہ اپنے بچے کو ہاتھ سے پکڑے آئی۔ اس کے آگے آگے دو خادمائیں چاندی کے شمع دانوں میں دو موم بتیاں اٹھائے راہ میں روشنی کرتی آ رہی تھیں۔ سب اسے سلام کرنے کے لیے یوں اٹھ کھڑے ہوئے گویا وہ آسمانی مخلوق تھی جو معاً ان میں آ موجود ہوئی ہو۔ سب کی نظریں اس پر گڑی ہوئی تھیں اور اتنے مبہوت تھے کہ کسی کو بات تک کرنے کا ہوش نہ رہا۔ لوسادیا نے جمیل بشرے اور لطیف انداز سے سب کو آداب کہا اور دونا ایس تی فی نی آ نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ اور رودلفو کے روبرو بٹھالیا۔ بچے کو اپنے دادا کے پاس نشست دی گئی۔

رودلفو کی نگاہیں لوسادیا کے حسنِ بے نظیر پر جمی ہوئی تھیں، دل میں کہنے لگا "اگر میری ماں مرے لیے ایسی بیوی منتخب کرے جو اس سے نصف تر ہی حسین ہو تو میں اپنے آپ کو دنیا کا مسرور ترین انسان سمجھوں گا۔ اے آسمانی باپ! یہ میں اپنے سامنے کیا دیکھ رہا ہوں۔ انسانی روپ میں کوئی حور تو نہیں کیا؟"

خون کی کشش

اور یوں لوسادیا کا تصور آنکھوں کی راہ سے اس کی روح پر قابض ہو چکا تھا اور لوسادیا کھانے کے دوران میں اس شخص کو اپنے اس قدر قریب پاکر جسے وہ اپنے نور دیدہ سے بھی زیادہ چاہ رہی تھی۔ بار بار دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ رودلفو پر کیا گزر رہی ہوگی۔

اگرچہ رودلفو کی ماں نے اسے یقین دلا رکھا تھا کہ وہی اس کا خاوند ہوگا مگر بیگم کا یقین اور اُمیدیں اسے ڈوبتی نظر آرہی تھیں۔ اس بات کا خوف طاری تھا کہ بیگم کے وعدے اس کی بدنصیبی کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کس قدر نازک مرحلے میں داخل ہوگئی ہے کہ یا تو مسرت سے ہمکنار ہوگی یا دائمی مایوسی میں گرفتار۔ اس کے ذہن میں اندیشے اس قدر بڑھ گئے اور خیالات پر اس قدر پریشانی چھاگئی کہ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ پسینہ چھوٹنے لگا اور رنگ اڑنا شروع ہوگیا۔ بالآخر اس پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی اور اس نے سر کو دونا ایس تی فی نی آ کے بازوؤں میں ٹکا دیا جو اُس نے سراسیمگی کے عالم میں اس کی طرف پھیلا دیئے۔ سبھی اس کی امداد کے لیے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن سب سے زیادہ ہوائیاں جس کے چہرے پر اڑ رہی تھیں وہ رودلفو تھا۔ جو اس تک پہنچنے کی عجلت میں ٹھوکر کھا کر دو دفعہ گرا لیکن نہ تو سینے کے کھولنے سے اسے ہوش آیا نہ پانی کے چھینٹوں سے بلکہ اس کے بسلنے کا مدوجزر اور چھٹتی نبض اس کی موت کا اعلان کرتے معلوم ہوتے تھے۔ خادموں اور خادماؤں نے بدحواس ہوکر چلانا شروع کر دیا " وہ مرگئی، مرگئی۔"

دونا ایس تی فی نی آ نے لوسادیا کے والدین کو اک زیادہ مسرت بخش تقریب کے سلسلے میں کمرے میں چھپا رکھا تھا۔ جب یہ افسوسناک خبر ان کے کانوں تک پہنچی اور انھوں نے چیخ پکار کی آوازیں سنیں تو بیگم کے احکام کے علی الرغم وہ اس پادری کے سمیت لوسادیا کے کمرے میں آپہنچے جو ان کے ساتھ موجود تھا۔ پادری دوڑ کر اس کے پاس آگیا کہ دیکھے کہیں وہ توبہ و استغفار کا اشارہ تو نہیں کر رہی تاکہ اس کے گناہوں کا اعتراف سن لے۔ اسے خیال تھا کہ ایک ہی بے ہوش

ہوگا مگر وہاں دو بے ہوش ہو رہے تھے۔ رودلفو کی کیفیت بھی لوسادیا کی طرح دیگر تھی جس کے سینے پر اس نے اپنا منہ رکھا ہوا تھا۔ ماں نے تو اسے اس خیال سے لوسادیا کے پاس آنے دیا کہ ہونا تو اسے اسی کا ہے مگر جب اسے بھی ہوش وحواس سے محروم ہوتے دیکھا تو اس کے اپنے چھکے بھی چھوٹ ہی جانے تھے اگر رودلفو کو ہوش نہ آ جاتا۔ وہ اس حد تک متاثر ہونے سے شرما رہا تھا۔

اس کی ماں یوں بولی گویا اس نے رودلفو کے خیالات پڑھ لیے ہیں: "جن جذبات کا تم نے اظہار کیا ہے، بیٹے! ان پر شرمندہ کیوں ہو بھلا؟ اک بات تھی جسے میں ایک خوشی کی تقریب تک ٹال رکھنا چاہتی تھی۔ اب اسے تم سے اور کیا چھپاؤں اس لیے بتائے دیتی ہوں اور ہاں اگر اسے سن کر تم شرمائے نہیں تو عجب ہوگی شرمندگی کی بات۔ سو میرے عزیز از جان بیٹے، جان لو کہ یہ لڑکی جو میرے بازوؤں میں پڑی ہے۔ حقیقتاً میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تمھارے والد نے اور میں نے اسے تمھارے لیے منتخب کیا ہے۔ وہ تصویر والی تو جھوٹ موٹ تھی۔"

رودلفو اپنی والہانہ اور سرگرم شوق آرزو کے ہاتھوں مجبور ہو رہا تھا اور جب خاوند کے لفظ نے ان تمام بندشوں کو دور کر دیا جو ماحول کی تہذیب اور وقار کے نام پر اس کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی تھیں تو ماں کی باتیں سنتے ہی وہ لوسادیا کے چہرے پر جھک گیا اور اپنے منہ کو اس کے منہ سے یوں پیوست کر دیا گویا منتظر ہے کہ کب اس کی رُوح سانس کی راہ سے آئے اور وہ اسے اپنی روح میں جذب کرے۔

جب لوسادیا کے والدین یوں اپنے سر کے بال نوچ رہے تھے کہ چند سے یہی کیفیت اور رہتی تو اک بال بھی نظر نہیں آنے کا تھا۔ جب آنسوؤں کے ساتھ ساتھ سب کا غم اور زیادہ ہو رہا تھا۔ نالہ و شیون کی آوازیں اور بلند ہو رہی تھیں۔ بچے کی چیخ پکار نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا تو اس کہرام میں لوسادیا کو ہوش آ گیا اور اس ہوش کے آنے سے وہ مسرت و بہجت بھی لوٹ آئی جس نے حاضرین کے دلوں کو الوداع کہہ رکھی تھی۔

خون کی کشش

لوسادیا نے جب اپنے آپ کو رودلفو کی بانہوں میں پایا تو مارے حیا کے ان سے آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ " نہ میری محبوب! یوں تو نہ ہونا چاہیے۔ یہ مناسب تو نہیں کہ تم اس شخص کی بانہوں سے دور ہونے کی کوشش کرو جس کی روح میں بس رہی ہو۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ پورے طور پر ہوش میں آگئی۔ 'دونا ایس تی فی نی آ' نے اپنے منصوبے سے اور کام لینے کا ارادہ ترک کر دیا اور پادری سے کہا کہ فوراً اس کے بیٹے کا عقد لوسادیا سے کر دے۔

پادری نے نکاح پڑھ دیا کہ جن دنوں کی یہ بات ہے متعلقہ فریقین کی رضامندی ہی کافی ہوا کرتی تھی اور آج کل کے بجائے معتدبہ اعلاناتِ نکاح و شادی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ کسی دشواری کے بغیر شادی طے پا گئی۔

اس تقریب کے ختم کے بعد حاضرین باغ باغ تھے۔ لوسادیا کے والدین رودلفو کو سینے سے لگا رہے تھے اور خدا کا شکر اور سمدھیوں کا شکریہ بجا لا رہے تھے۔ آپس میں دوستی کی قسمیں کھائی جا رہی تھیں اور رودلفو کے دوست متحیر تھے کہ وہ اپنی آمد آمد کی شب ہی کو غیر متوقع طور پر کس طرح پُر لطف شادی کے گواہ بن گئے تھے۔ مجھے چاہیے کہ اس منظر کی عکاسی کسی اور قلم کے سپرد کر دوں اور کسی اپنے سے ارفع مشاق ادیب کو اسے معرضِ تحریر میں لانے کے لیے کہوں۔ اس کے دوستوں کی حیرت اور بھی بڑھ گئی جب 'دونا ایس تی فی نی آ' نے اس امر کا اظہار بر سرِ عام کر دیا کہ لوسادیا ہی وہ لڑکی ہے جسے اس کا بیٹا ان کی امداد کے ساتھ اٹھا بھاگا تھا۔ رودلفو بھی اپنے دوستوں کی طرح سخت متعجب تھا۔ گو اسے یقین تھا کہ اس کے والدین اس معاملے کی خود ہی تصدیق کر چکے ہوں گے۔ پھر بھی اس نے لوسادیا سے پوچھ لیا کہ اس کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت یا نشانی ہے؟ اس نے جواب دیا۔ "جب مجھے غشی کے پہلے دورے کے بعد ہوش آیا تو آقا! میری عزت لٹ چکی تھی اور میں نے اپنے آپ کو آپ کی انہی بانہوں میں موجود پایا تھا لیکن میں اب سمجھتی ہوں کہ اس کا کھو جانا

ہسپانوی افسانے

اچھا ہی رہا کہ غشی کے حالیہ دورے کے بعد میں پھر آپ کی باہنوں میں موجود ہوں مگر عزتِ باز یافتہ کے ساتھ! اگر یہ ثبوت ناکافی ہے تو صلیب کی نشانی آپ کو یقین دلانے کے لیے کافی ہوگی بشرطیکہ جو صلیب آپ کی والدہ محترمہ کے قبضے میں ہے وہ وہی ہے جو دوسرے روز صبح سویرے ہی گم تھی اور جسے میرے سوا وہاں سے اور کون چرا سکتا تھا۔"

"تم میری روح کی رانی ہو جو مہ و سال خدا ہمیں عطا فرمائے گا۔ ان تمام میں تمہیں اپنی روح کی رانی ہی بنائے رکھوں گا۔ میری محبوب!"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے پھر اسے سینے سے لگا لیا اور دعاؤں اور نیک تمناؤں کا اک مینھ ان پر برس پڑا۔

دعوت ہوئی اور جن موسیقاروں کو بلایا گیا تھا، وہ بھی آ گئے۔

رودلفو اپنے بیٹے کی شکل کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ چاروں بزرگواروں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہ نکلے۔ گھر کا کوئی کونا کھدرا ایسا نہ تھا جو مسرت، شادمانی اور شگفتگی سے منوّر نہ ہو رہا ہو۔ اگرچہ رات اپنے سیک سیاہ بازوؤں کے ساتھ اڑی جا رہی تھی، لیکن ردولفو کے دل میں اپنی محبوب بیوی کی خلوت کی آرزو اس قدر شدید تھی کہ اسے معلوم ہو رہا تھا رات بازوؤں کے ساتھ اڑ نہیں رہی بلکہ رینگ رہی ہے۔

جس ملنے کی آرزو تھی آخر وہ آ گیا کہ آخر ہر چیز کا آخر ہے۔ سب سونے کے لیے چلے گئے۔ گھر پر خاموشی چھا گئی لیکن اس کہانی کی حقیقت پر خاموشی نہیں چھائی کہ اس مسرور جوڑے کی عالی نسب اولاد اور بے شمار بچے جنہیں وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے اور جو اب بھی تولدو میں رہائش پذیر ہیں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ کہانی پر خاموشی چھا گئی ہے۔ وہ بہتیرے طویل اور مسرت سے معمور سالوں تک اپنے بچوں

اور پوتوں کے ساتھ خوش خوش زندگی بسر کرتے رہے ۔ یہ سب خدا کی مہربانی تھی اور اس خوُن کی کشش کی برکت جسے بی ای سی کو کے شیمیع ، عالی نژاد اور پاکباز دادا نے زمین پر بہتے دیکھا تھا ۔

ہین خایئن سد ہیر کاسُو

بحری نمک

کپتان جہاز کے دیدبان سے ادھر آ رہا تھا کہ چلا اٹھا "یہ کس کم بخت کے حکم سے راستے کا تختہ اوپر اُٹھ رہا ہے ؟ جہاز کی دستاویزات کے بغیر ہم کیسے سفر پہ جا سکتے ہیں ؟" لہجے میں اک خشونت، اک تحکم تھا۔ مگر افسر اول کے متین اور معمر چہرے پہ نظر پڑتے ہی سب کچھ ماند پڑ گیا۔

افسر بولا۔ "کپتان صاحب! دمکلا سے دن بھر کا کام تو لیا جا چکا ہے۔ ساری سہ پہر بھی مصروفیت ہی میں کٹی ہے۔ اب اگر کام کرنے والے یہ لوگ جہاز کے ملازم نہیں ہیں تو سات تیس کے بعد آپ انہیں مزید ٹھہرا نہیں سکتے۔"

دمکلے کے اوپر کے حصے کا عظیم حجم خوفناک نظر آتا تھا۔ اس لمحے اس کے سرے پر کی تیز روشنی کے اجالے میں راستے کا تختہ۔ جہاز اور بندرگاہ کے درمیان لٹکا ہوا۔ بےحد خطرناک معلوم ہوتا تھا۔

"جہنم رسید کر دو انہیں حضرت! جہاز سرمایہ داروں کی سیاحت کا کوئی سفینۂ عیش نہیں ہے۔" کپتان نے لال پیلا ہو کر لب کاٹتے ہوئے کہا "اگر یہ لوگ اتنے ہی ناکارہ ہیں کہ ہمارا مال ٹھکانے پر نہیں لگا سکتے تو انہیں حاضر کرو میرے دفتر میں — مجھے بھی تو کچھ معلوم ہو!"

افسر اوّل سایوں میں غائب ہو گیا اور ساری گودی پہ خاموشی چھا گئی۔ میل آلودہ جہاز پر مزدوروں کی ہائے وہو ختم ہو گئی تھی۔ اس کی غیر مختتم جنبش پس و پیش اتنی جانی پہچانی چیز تھی کہ ادھر دھیان نہیں جاتا تھا۔ جب دمکلے نے راستے کے تختے کو اپنی جگہ پر رکھتے ہوئے جہاز اور بندرگاہ کو متحد کر دیا تو اسکی زوردار گھن گرج اور کپتان کی کرخت آواز سے چھائے ہوئے سکوت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

مجھ میں کچھ ایسی استعداد اور قابلیت تھی کہ مال کپتان کے عہدے کے لیے خاصی سفارش ثابت ہوئی۔ چنانچہ اسی حیثیت میں مَیں نے اپنے دوسرے بحری سفر کو بھی ختم کر لیا تھا۔ اب کچھ اچھی طرح یاد نہیں آتا کہ وہ کون سی مبہم آرزو تھی جو مجھے سمندر کی طرف کھینچ لائی۔ دور دور کے ملکوں کی سیر اور اجنبی سرزمینوں کے باسیوں سے ملنے کی آرزو تھی ؛ بحری میلان تھا ؛ یا ان کند ذہن اور غبی ہم جنسوں کی لامتناہی صحبت سے بیزاری تھی جو میرے عہدِ طفولیت کا جزو لاینفک بن گئے تھے ؟ ممکن ہے آخری دونوں چیزیں ہی صحیح وجہ ٹھہریں مگر میرے نکتہ خیال سے اک اور بات زیادہ معقول وجہ ہوگی اور شاید اسی بات کو آپ بے وزن سی سمجھیں !

ایک صبح کا ذکر ہے کہ میں آئینے کے سامنے بیٹھا شیو کر رہا تھا۔ مجھے خیال سا آیا۔ شکل و صورت کے لحاظ سے میں مال کپتان معلوم ہو رہا ہوں۔ بیسیوں تجارت پیشہ لوگوں سے مجھے آشنائی تھی۔ وہ سبھی میری طرح غیر اہم تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا میں خصوصیت سے اس لیے پیدا ہوئے ہیں کہ معادن پر سسر بن جائیں۔ وہ اُس مرنجاں مرنج اور ہم آہنگ افتاد طبع سے متصف تھے جو کائنات کی حقیقی اور یکسانیت نواز قوت ہے ! جو نفسیاتی مشترک نسب نما ہے اور انتہائی متباین اور متنوع طبیعتوں کو جنھیں ستم ظریفیٔ قدرت نے سمندر یا زمین پر یکجا کر دیا ہو، دوستی کی ہموار سطح پر لے آتی ہے۔ ہماری زبان میں ایسی طبیعتوں کے اجتماع کو جہازی ملازم کہتے ہیں۔ بہرکیف بلاشک وشبہ عرض کروں گا کہ میں پیدا ہی اس لیے ہُوا تھا کہ مال کپتان بنوں۔

مگر واقعات کچھ اور ہی ثابت کرتے پرتلے ہوئے تھے۔

ادھر ادھر کی بھاگ دوڑ۔ لعنتوں ملامتوں کی بوچھاڑ اور چند ے تعویق کے بعد ہمارا جہاز آگے کو چل نکلا۔ ساڑھے نو بجے ڈال پارسے زرد کی روشنیاں اس کے اگلے حصے پر پڑ رہی تھیں۔ ہلکے ہلکے پیلے رنگ تھے جو جہاز کے پچھلے حصے کی زرد بتیوں کے اوپر اوپر واضح

نظر آتے تھے۔

تبھی پیچھے سے اک مشفقانہ ہاتھ کندھے پر رکھتے ہی کوئی خوش آئند اور طمانیت بھری آواز میں بولا۔ "اتنے گم سم کیوں ہو بیٹے ؟ کسی دوست لڑکی کو تو ساحل پر نہیں چھوڑ آئے ؟ تو خیر محبوبہ کی یاد میں فکرِ شعر کے لیے دنبالۂ جہاز پر رات بھر تو کھڑا نہیں رہا جا سکتا!"

مَیں نے تیزی سے گھوم کر زور سے کہا۔ "اجی فکرِ شعر! مَیں تو اپنی ہی فکر میں غرق ہوں پر سر صاحب! دن بھر کی گھٹن اور نچلی کوٹھڑی کی حبس کے بعد تازہ ہوا کی ضرورت ادھر لے آئی۔ اب بھوک بھی سخت لگ رہی ہے۔ دستر خوان بچھا نہیں اور مَیں بلا خور ہوا نہیں۔ اس کا کیا کیجیے کہ ساڑھے نو بجے تک ایک کھیل بھی منہ میں اڑ کر نہ آئے گی کہ کپتان صاحب دیدبان میں ہیں اور جہاز راں مصروفِ کار! اس میں شک نہیں کہ ہم ابھی ابھی چلے ہیں۔ مگر میں تو سارا دن کام میں لگا رہا ہوں اور اب ہمیں بخشش کیا ہوئی ہے۔ اک وقفۂ آرام! بس یہی انھیں کام کرتے دیکھتے جاؤ اور اس حرامی آدم خور کپتان کی ملحدانہ بے ہنگم سُر تال سنتے جاؤ جو خالی پیٹ ہضم نہ ہوا اور جسے شعر و شاعری سے عاری دل قبول نہ کرے!"

"مجھے تم سے پورا پورا اتفاق ہے حضرتِ عشق باز! لیکن ہم کھانے کی میز کے گرد بیٹھے ہی تھے کہ مجھے کپتان نے تمھیں بلا بھیجنے کو نیچے بھیجا! میں تمھارے کمرے میں گیا۔ وہاں روشنی ہو رہی تھی اور ایک شعر و شاعری کی کتاب نشست پر کھلی پڑی تھی! میں نے تمھیں بہتیری آوازیں دیں اور کر بھی کیا سکتا تھا میں؟ آخر مجھے تمھارے محبوب مقام کا خیال آ گیا۔ یہی دنبالۂ جہاز اور یہ رہے حضرت!"

"میں عرض کر چکا ہوں کہ خاصا بیزار ہوں اور بھوک لگ رہی ہے مجھے!۔ تو کہئے اس حرامی آدم خور سے کہ ہمیں کھانے دے یا ہمیں کھا جائے! اور کوئی ٹھٹھول نہ سمجھا اسے!"

نابدان تک پہنچتے پہنچتے پر سر اچنبا جا کہنے لگا۔ "اجی نہیں! ذرا اس کے نکتۂ خیال

کو بھی تو دیکھو! وہ تبھی گرم ہوتا ہے جب اہلِ دفتر اسے خاطر میں نہ لائیں یا جب کوئی قسمت کا مارا، چوری چھپے جہاز میں آ دبکے اور ایسا شخص تو کپتان کے لیے مستقل کراہیت ہے، بیاہو تو اس بات پر بصد شوق شرط لگا لو! وہ دیکھو! حضرت میز کے سرے پر بیٹھے قانون بگھار رہے ہیں!"

ہم کھسک کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ افسر اول اور پرسر کپتان کے بائیں براجے تھے۔ چیف انجینئر، افسر دوم اور ڈاکٹر دائیں۔ ہم باقی کے سبھی حسبِ مراتب میز کے آخر تک پہنچ گئے تھے!

خاموشی مسلط تھی اور میں نے افسر سوم پر نگاہ کی جو سانولی رنگت، کشادہ سینے کا نوجوان تھا۔ منفرد سا نام تھا اس کا۔ اندرمی لی اد، یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے نظر چرالی ہے۔ گفتگو میں جو چپ آ پڑی تھی، میں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور شوربے کو ایک ہی سانس میں ختم کر ڈالا۔

معاً کپتان مڑ پڑا۔

"اندڑ یوز صاحب۔"

مجھے سنائی نہ دیا کہ میں میز کے آخری سرے پر بیٹھا تھا اور ذہن شوربے میں ڈوبا ہوا تھا۔ افسر سوم نے موقعے کی اہمیت کو بھانپتے ہوئے کہنی ماری اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔" ارے! کپتان کچھ کہہ رہا ہے۔"

"معاف کیجیے صاحب! مجھے سنائی نہیں دیا تھا"۔ اور اپنی بے توجہی کے لیے سرزنش کا منتظر تھا۔

" اندڑ یوز صاحب! آپ نے پوری طرح تسلی کر لی تھی نا کہ سب اسباب ٹھیک طور پر اپنے ٹھکانے پر لگ گیا ہے۔ میں نے جہاز کی دائیں سمت خاصا الار دیکھا تھا۔"

افسر اول مداخلت کرتے ہوئے بولا" جناب! میں اس کی وجہ عرض کرتا ہوں۔ ہم نے

جہاز کی دائیں سمت کے حوضوں کو تازہ پانی سے بھر دیا ہے۔ مگر باقی ماندہ کو خالی کر کے صاف کر ڈالا ہے اور اس طرح الارد اقع ہوا ہے۔"

کپتان کی آنکھیں ناراضی کی وجہ سے شعلہ ریز تھیں۔ پھر بھی اس نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ اور افسر اوّل کے الفاظ کا تاثر معلوم کرنے کے لیے ایک ایک کے چہرے کو دیکھا۔ چیف انجینئر جذبات سے عاری تھا۔ ڈاکٹر ذرا کی ذرا سٹپٹایا سا مگر اس کی زود دار کوشش یہی رہی کہ اپنے آپ کو غیر متعلق ظاہر کرے۔ افسر اول کا سر ذرا اوپر کو اٹھا اور اس کی نظریں جرأت مندانہ طور پر کپتان کی نظروں سے چار ہوئیں۔ پرسر کے چہرے پر بیزاری کے آثار نہایت واضح تھے۔ ہم باقیوں کی توجہ کھانے پر مبذول رہی جس میں میں سب سے پیش پیش تھا۔ اور اس بات کو ذرا بھی خاطر میں نہ لایا کہ میری ذات ہی افسر اول کی بوچھاڑ کا مرکز تھی ۔۔۔ وہ بوچھاڑ جسے سب سامعین نے سخت بے دلی سے سننا گوارا کیا۔

کپتان نے ترش رو ہو کر کہا۔ " اینڈریوز صاحب! دھیان رکھئے کہ اگلی بندرگاہ پر سب مال ٹھیک طور پر ٹھکانے پر لگنے ورنہ اس ملعون الارکے ہوتے ہوئے پلیٹوں میں شوربا بھی نہیں رہنے کا!"

یہ درست تھا کہ حوضوں کو خالی کر دیا گیا تھا۔ مگر اس میں میرا قصور؟ میانی پیچانی نظریں ایک دوسرے سے ملیں اور پرسر عیارانہ بشرہ لیے ہوئے، پانی کا بھرا ہوا گلاس جوں کا توں چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔

جہاز کی روانگی سے پیشتر میں اپنے فرائض کے سرانجام دینے میں منہمک رہا اور اس دوران، اِدھر اُدھر کی باتوں کے اشارے کنائے۔ کبھی کبھار اُڑتے اُڑتے کانوں میں پڑتے رہے۔ جب ہم گھر کا سفر اختیار کیے ہوئے وال پارے زو پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک لاش اندر اغلب یہی ہے کہ کسی چوری چھپے آ دبکنے والے کی لاش، تازہ پانی والے حوضوں سے نکلی ہے۔ جہاز کا مال بردار انجن گرم ہونا شروع ہو گیا اور ابتدائی کاوے کاٹنے لگا۔ مال

کوٹھڑیوں کے پھاٹ کھول دیے گئے اور اسباب کمروں میں پھیلایا جانے لگا۔ اتفاقیہ اس وقت چند باتوں کی بھنک کانوں میں ایسی پڑی کہ میں متاثر ہوئے بغیر رہ نہ سکا۔ اس لمحے وہ باتیں مجھے تعجب ناک سی معلوم ہوئیں۔ کام کی مصروفیت کی وجہ سے میں نے ان کا خیال چھوڑ دیا مگر اب، چونکہ یہ موضوع تازگی اور دلچسپی اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میری بھی دلی آرزو یہی تھی کہ کھانا ختم ہو جائے اور میں اس کے متعلق اپنے آپ کو پوری طرح آگاہ کر دوں۔ وثوق یہی تھا کہ میک لین صاحب اس سے بتمام و کمال واقف ہوں گے!

اسے اتفاق کہیے یا عمداً گھڑی گھڑائی تجویز کہ پیر صاحب سرِ شام ہی اپنے کمرے میں مقید ہو بیٹھے اور قرائن سے صاف اعلان کر دیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی کسی کے مخل ہونے کو برداشت نہیں کریں گے۔

میں عرشے پر تنہا ٹہل رہا تھا اور چوکیداروں کے سوا اور کسی سے سامنا نہ ہو رہا تھا۔ آدھ گھنٹے کے بعد انڈرحی لی اور ہماری بھرکم سرمئی رنگ مفلر میں ڈوبے ہوئے آیا اور اپنے معمول کے مطابق سر کی جنبش سے سلام کرتے ہوئے پائلاٹ گھر کی طرف چلا گیا۔ جلد ہی روشنیاں بجھ گئیں اور میں اندھیرے میں کھو گیا اور تاروں بھرے گنبد کے مقابل مستولوں کی کاہلانہ حرکت کو دیکھنے لگا۔ دور ــــ سرے کی سفید روشنی نظر آ رہی تھی جو اٹھتے ہوئے دھوئیں کے دل بادلوں میں سے چشمک زنی کر رہی تھی۔ بادِ جنوب کے نرم رو جھونکوں کے ساتھ ساتھ مال بردار جہاز کے انجر پنجر میں دھنس کر اسے رات بھر چلانے والے مٹھی بھر آدمیوں کی بے بضاعتی اور اپنی قطعی تنہائی مجھ پر آپ ہی آپ، تنزیلِ الہام کی کیفیت طاری کر رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس انتہائی سکوت کو محسوس کر رہا تھا۔ جس میں ہم میں سے ہر ایک اپنے رفیقوں کے ساتھ بس رہا تھا اور ہر ایک دوسرے سے کیا اپنے آپ سے بھی بیگانہ بنا ہوا تھا۔ مگر افسوس کہ ہمارے دلوں میں انتہائی خودسری نا منصفی اور گناہ و جرم کے لیے کوئی بیگانگی موجود نہیں!

آٹھ گھنٹوں کی آواز گونجی ۔ ہوا کے جھونکے تازہ اور شوخ و تُند ہوتے جا رہے تھے اور ان سے پناہ ڈھونڈنے کو میں اپنے کمرے میں چلا آیا ۔ میں خوابوں کے پُر سکون مامن میں بھی اس رات کی سیت کو جلد نہ بھُلا سکا ۔

کئی دنوں کے بعد میک لین صاحب سے بات کرنے کا موقع ملا لیکن میں تجسس سے گریزاں رہا کہ مال کپتانی میں تجسس کی عادت گستاخی پر محمول کی جاتی ہے ۔ لیکن ایک روز سہ پہر کو میں کٹہرے سے لگا سنگ ماہی کے کرتب دیکھ رہا تھا جو جہاز کے پیچھے پیچھے اچھلتے کودتے چلے آ رہے تھے کہ پرسر صاحب ٹہلتے ٹہلتے وہاں آ موجود ہوئے ۔ "کیسے گزر رہی ہے مال کپتان صاحب ! تو آپ نے الارکو درست کر دیا گیا ؟ نہ صاحب، اب کپتان کو حوضوں کے پانی سے کوئی شکایت نہ ہو گی آئندہ !"

"حوضوں کے پانی سے ؟" میں نے شریکِ راز بننے کی توقع کو لیے ہوئے جواب دیا ۔

"ہاں حوضوں کے پانی سے ۔" وہ کہے گیا ۔ اس کی بھویں جٹی ہوئی تھیں گویا ذہنی کرب میں مبتلا ہے ۔ "اب ان میں پانی کے سوا کچھ اور بھی ہو گا، لیکن اُسے کیا ؟ تمھارے پاس آگ بھی ہے پانی بھی ہے، دونوں ہی موجود ہیں ۔ تو جس سے جی چاہے کام لو ! اور اب کے ہوا بھی یہی کہ انھوں نے اس کی لاش کو بھٹی میں جلا کر راکھ کر ڈالا ۔ آہ ! اس پر کیا بیتی ہو گی !"

کوئلوں کے چند بھرپور بیلچے اور پھر مسافر تیرا اللہ بیلی !

مجھے اس فسانے پر یقین نہ آیا ۔

" میک لین صاحب ! فسانہ طرازی خوب کر لیتے ہو ! لیکن یہ ۱۹۳۶ ہے آج کل کے زمانے میں ایسی باتیں واقع نہیں ہو سکتیں ۔"

اس نے کہا اور وہ سراپا خلوص تھا ۔ " اندریاس ! اگر تمھیں یہ وہم ہے کہ ہم مہذب ہیں تو اُسے تم اس معصومیت کا شائبہ سمجھو جسے دنیا میں آنے کے وقت ساتھ لائے تھے ! تم خوبرو اور ذہین نوجوان ہو اور زندگی تمھارے لیے چند خوش آئند اچنبھے لیے ہوئے

ہے، لیکن جوانی پھر جوانی ہے۔ ۲۵ کی عمر میں تمھارا ایمان تازہ ہوتا ہے۔ تم اچھوں پر اعتماد کرتے ہو اور بروں سے نفرت اور انتہائی نیک شعار لوگوں کی اتھاہ قوتِ شیطنت کو نظر انداز کر دیتے ہو۔ ہمیں ماحول، خاندان، قوانین اور مقامی حالات کے بندھنوں نے جکڑ رکھا ہے۔ ذرا کسی آدمی کے بندھن ڈھیلے کر دو اور اسے ماحول سے دور لے جاؤ تو پھر تم خود دیکھ لوگے کہ اس کی ذہنیت متعین کرنے میں کس قدر دشواری پیش آتی ہے۔ ابھی تم اتنے کافی پختہ عمر نہیں ہوئے کہ دل کی تمام قوتوں کو کرید ڈالو! سبھی جہازوں میں کپتان کیا اور میں اور تم کیا یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم اس حقیقت سے بغاوت کرنے کی ٹھان لیں اور میں نشدہ مدسے بغاوت کر بھی رہا ہوں۔ لیکن چند وہ بھی ہیں جنھیں ابھی اس سے آشنا ہونا ہے۔ مگر ایسے بھی ہیں جو پورے درندے ہیں اور درندگی کو بروئے کار لانے میں ذرا حجاب اور نفرت محسوس نہیں کرتے! ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں انسان، انسان کا شکاری ہے اور اسے اپنے فرائض میں داخل سمجھتا ہے۔ تمھارے فرائض میں ہے کہ تم احکام جاری کرو۔ اس وقت رسّا مہیا کرو جب کشتیاں جہاز کی بغل میں آ رہی ہوں۔ قبلہ نما کی سوئی کی درستی کرتے رہو کہ وہ صحیح طور پر شمال کی جانب رہنمائی کرے اور ہاں پھر اس قسمت کے مارے کو جلا ڈالو۔ ڈبو دو، دفن کر دو جو جہاز میں مجبوری حالات سے تنگ آ کر چوری چوری آ چھپا ہو! یہ سب کچھ فرائض میں داخل ہے اور انسان اپنا فرض ادا کرتا ہے! یہ علیحدہ بات رہی کہ حفظانِ صحت کے اصولوں کے لحاظ سے آدمیوں کو پینے کے پانی میں ڈبونا قابلِ اعتراض ہے کسی نے کپتان پہ اسی کا مذاق دے پٹخا۔ حضرت وہ جنس ہیں کہ خواہ ہم ذرا سی دیر کے بعد ہی کیوں نہ بندرگاہ پر نظر آئیں۔ مگر جب تک اسے نظر آنہ جائیں کبھی ہمارے لیے انتظار کرنا گوارا نہ کرے۔

"میں کپتان کو سمجھتا ہوں۔ اس بات کو تین مہینے بیت گئے ہیں اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم آئی کوبک سے ذرا آگے بڑھے ہی تھے کہ منہ اندھیرے ایک لڑکی کو ہم نے جہاز پر سوار کرا لیا کہ جہاز والوں نے غریب کو بے حد گالیاں دی تھیں۔ یاد ہے تمھیں وہ لڑکی؟ لیکن تمھارا وہ

پہلا سفر تھا۔ مگر وہ واقعہ تو یاد ہوگا جب ہم انتوفے گاسٹا پر چیل کے منہ میں جاتے جاتے بچ گئے تھے کہ ڈاکٹر کی سکیم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے افیم کے ڈھیر کو سمگل کرنا چاہتے تھے! جہاز کی بابت اک بات تو ضرور کہوں گا بھیّا کہ ہے یہ درسگاہ! جہاز کے سفر اسفار سے تم سیکھ بہت کچھ جاتے ہو!"

میں بیزار ہو گیا تھا۔ میرے افسر نے ضرورت سے زیادہ پی رکھی تھی۔ میں اس سے نجات حاصل کرنے کو تھا اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور شراب کی بدبو سے بھرپور تنفس کو براہِ راست مرے کان پر چھوڑتے ہوئے خود اپنی وداعی نصیحت سے خلاصی حاصل کر رہا تھا۔ شراب کا کشفِ اسرار ہوتی ہے، کہنے لگا "بیٹے یہ سمندر کی پرانی کہانی ہے اور اسے جیتے جاگتے انسان پر آزمانے کا حوصلہ نہ کر بیٹھنا!" وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور لغزیدہ لغزیدہ چلنے لگے تک پہنچ کر یوں سہارا لیا کہ چمنی کا خاصہ منظر نظر کے سامنے تھا۔" دھوئیں کے دل بادل دیکھ رہے ہو، اٹھتے ہوئے! اچھا تو اب یہ سیاہ ہیں مگر جب چوری چھپے سوار ہونے والے کی انسانی لاش جل رہی ہو تو یہی دھواں ــــ آسمانی ہوگا! صرف تمہاری آگاہی کے لیے کہا ہے میں نے اتنا!"

جب میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور اپنے آپ کو دیوار گیر شبِ خوابی نشست پر اس آرزو میں دے پٹکا کہ اپنے بے چین خیالات پر قابو پا جاؤں جو چھت والے روغن کے آرائشی نقش و نگار اور چھینٹوں کی طرح منتشر اور پریشان تھے تو عرشے پر اس کے شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے قہقہے کی گونج باقی تھی!

جب میری آنکھ کھلی تو سارا کمرہ دھوپ میں نہایا ہوا تھا۔ اگرچہ میں کل سہ پہر سے بستر پر دراز تھا مگر کچھ اندازہ نہ کر سکا کہ میں کتنا عرصہ محوِ خواب رہا ہوں، ممکن ہے چند گھنٹے ہی سویا ہوں۔ چونکہ مجھے کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ اس لیے کپتان کو معذرت کہلا بھیجی۔ جہازی ساتھیوں کی صحبت مجھے بہت غیر مرغوب ہو گئی تھی۔ تمام رات بے حد بے چینی سے کاٹی۔ میں بڑا اضطراب

کے مارے پہلو بدل رہا تھا اور جہاز کا انجن دھک دھک مسلسل چلتا چلا جا رہا تھا۔ جہاز پس وپیش ہچکولے کھا رہا تھا اور موجیں آ آ کر اس کے پہلوؤں سے سر پھوڑ رہی تھیں۔ لے دے کر اک میں ہی تنہا تھا جو دکھ درد کے مارے ماندہ پڑا تھا اور اس کی ذمہ داری پر سر کی مدہوشانہ گفتگو پڑتی۔ کچھ عجیب سی باتیں کر رہا تھا وہ! شاید اس نے مجھے ہونق سمجھا جو یہ رات بخشی! معاً مجھے محسوس ہوا کہ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے کل دوپہر سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ کھانے پلانے کی خدمت انجام دینے کے لیے جہاز کا نعمت خانہ مرے کمرے کے سامنے تھا۔ میں نے آواز دی "خدمت گار!"

ایک راہ جاتے شخص نے اندر دیکھا۔ "اخاہ تو اندریاس ابھی تک لیٹے ہی پڑے ہو۔ بھئی مال کپتان کو کیا پڑی ہے کہ کام کرے! میں ہوں آپ کا خاکسار اندرومی لی او۔"

"بس کچھ تھکا ماندہ سا تھا۔"

اس نے خوشگوار طور پر اثبات میں سر ہلایا۔

"اندرومی لی او! ذرا اندر آ کر بیٹھ نہیں جاؤ گے۔ غالباً تم نے ناشتہ نہیں کیا اور اب ذقفۂ راحت بھی نصیب ہے؟ اور افسر کے لیے چند ساعتیں ہیں ہی کیا؟"

"خدمتگار! دو کے لیے ناشتہ لاؤ!"

اندرومی لی او نے وہی مفلر لپیٹ رکھا تھا جسے پہنے ہوئے وہ کل رات عرشے پر بھیس بدلا ہُوا نظر آتا تھا۔ جب بیحد سانولے رنگ چہروں والے لوگ نڈھال ہو جائیں تو ان کے خدوخال پر اک خاکستری رنگ کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ یہی جھلک اس کے چہرے پر ہویدا تھی۔ اس کی درخشاں آنکھیں اور چہرے کی عجیب سی دلآویز کیفیت اس کے موٹے موٹے لبوں اور ہوسناک دہن کے عیب کو چھپائے ہوئے تھی۔ وہ بیٹھ گیا، اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، پوچھنے لگا "تو کیا یہی معلوم ہوتا ہے کہ ساری رات سویا نہیں ہوں میں؟ بہرحال کسی گناہ سے ملوث نہ سمجھیو مجھے۔"

"کیا خبر اندرومی لی او! میری تو یہی آرزو تھی کہ تمہیں اک نظر دیکھوں اور یہ دیکھوں کہ انسان

کی شکل وشباہت کیا ہوتی ہے۔ اس جہاز پر تو وہ نہیں آتے اندرومی لی او! تم مجھے شروع ہی سے پسند ہو مگر تمھیں تو یاد نہیں ہوگا۔ جب میں جہاز پر آیا تھا تو تم نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا مجھے۔"

"سب مجھے خوب یاد ہے! بُرا نہ مانو گے جو کہوں کہ بڑے نوابانہ ٹھاٹھ سے آئے تھے تم! تم نے پوچھا تھا کہ نیچے بیگ کون لے جائے گا۔ میں نے سر جھکا کر سلام کیا تھا اور تمھارا بیگ اٹھا کر لے گیا تھا یہ کہتے ہوئے۔"ادھر امیرالبحر۔ حضور ادھر" اور باہر چلا آیا تھا اور پھر بیگ کے ساتھ ساتھ دو قلی بھی تمھارے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ یہ کہو یہ جہاز رانوں کی سی شان کہاں سے سیکھی تھی اختیار کرتی ؟"

"یہ کچھ طبعی طور پر ہو رہا تھا اندرومی لی او۔ ہم تند و تیز ابلیانہ بادِ جنوب کے سہارے چل رہے تھے۔ میں اس رات اس قدر بیمار تھا کہ نیلہ ہی قائم کردی ہوگی میں نے۔"

"تم جانو جو سنترے خدمتگار تمھارے پاس لایا تھا وہ میں نے ہی بھیجے تھے۔ جب میں تمھارے دروازے کے پاس سے گزرا تھا تو جبھی جان گیا تھا کہ تم علیل ہو۔"

"نوازش! وہ بڑے کام آئے!"

"دستک ہوئی ہے؟"

"آجائیے"

ایک جہاز راں آگیا "ری کارڈو صاحب! پرسر صاحب کہتے ہیں کہ ہم چار بجے کلاّو مقام کریں گے۔ اس لیے مہربانی کر کے کاغذات تیار رکھیے۔"

"اچھا۔ تو ان سے کہہ دو کہ کاغذات تیار ہیں۔ میں آیا کہ آیا۔ اندرومی لی او۔ اس جہاز پر یہ میرا آخری سفر ہوگا۔ ایسے لوگ کبھی دیکھنے میں نہ آتے تھے۔ تمھاری جدائی مجھے محسوس ہوتی رہے گی مگر تم اسے سہ جاؤ گے اندرومی لی او! تم اک فرشتہ نفس آدمی ہو ان شیطانوں کی صحبت میں!"

"اجی جانے دو! وہ دیکھو وہ رہا افسر اول!"

"اس نے کبھی اپنے انسان ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے!"

" بس ! یہ ایک ہی کام جانتا ہے ۔ تابعداری "۔

" لیکن اس وقت تو نہیں ناجب ایسی باتیں وقوع پذیر ہوں جن کا ارتکاب فانی انسان کبھی گوارا بھی نہ کرے "

" یہ مسئلہ اس کے ضمیر سے تعلق رکھتا ہے اور کون جانے اس کا جواب ۔ ہمیں بردباری سے کام لینا چاہیے ۔ مان لیا کہ کپتان دہریہ ہے اور پرسرایک سڑی شرابی یا جو کچھ بھی تم سمجھو مگر یہ تمھارے سادہ پانی والے اُن سے بھی گئے گزرے ہیں ۔ اب چیف انجینئر اور ڈاکٹر ہی کو لو! ایک جلاد ہے تو دوسرا کوکین کا رسیا جسے وہ سمگل کر کے جہاز میں لانے سے بھی گریز نہیں کرتا! بھلا مجھے کیا سمجھتے ہو تم!"

" اندر رومی لی او ! تمھیں تو خوب جانتا ہوں ! میں اس بات کے ماننے سے قطعاً انکار کرتا ہوں کہ جو کچھ جہاز میں ہو رہا ہے تم اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہو!"

اندر رومی لی او نے اوپر کی تختیوں پر نگاہ کی اور اس کی مسکراہٹ افسردگی میں بدل گئی ۔ واقعی میرے سوالوں کی وجہ سے اس نے اک جھرجھری سی محسوس کی ۔

اس نے احتجاجاً کہا ۔" اندریاس ! میں جہاز راں ہوں اور جہاز راں کی زندگی سے تم واقف ہی ہو نگہبانی کی ۔ سو لیا ، مال اسباب کے سلسلے میں مصروف ہوئے ۔ پھر سو لیا اور پھر نگہبانی ! چونکہ میں تمھیں واقعی عزیز سمجھتا ہوں اس لیے اک بات بتائے دیتا ہوں ، میں نے جو کچھ دیکھا ہے سو دیکھا ہے ۔ مگر اپنے شعبے میں نہیں اور دوسروں کے ہاں کی باتوں میں دخل دینا میرا کام نہیں تھا کہ میں حاکم اعلیٰ نہیں ، یوں بھی میرا دخل سود مند نہ ہوتا ۔ گو یہ باتیں مجھے پسند نہیں تھیں مگر میں نے اپنی زبان کو تھام رکھا تھا اور اگر کوئی قدم اٹھانا بھی چاہتا تو اٹھا نہ سکتا تھا ۔ اب تمھارے ہونے سے بات اور ہے ۔ ہم آپس میں تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں ۔ تم ذہین اور دانا ہو ! تمھاری موجودگی نے مجھے اپنے انسان ہونے کا احساس دلایا ہے ۔ اندریاس ! میں دیانتدار بھی ہوں اور معصوم بھی !"

اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور لمبی سرد آہ بھری جسے اس نے جلدی سے ضبط کر لیا مگر مجھے یقین تھا کہ یہ اس کے دل سے اٹھی ہے۔

وہ بیحد مضطرب تھا۔ اچھل کھڑا ہوا اور کہنے لگا "اندریاس! بھول جاؤ ان باتوں کو! مجھے خاصی نیند کی ضرورت ہے کہ تھکا ہوا ہوں۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔ بھول جاؤ ان باتوں کو۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھا مگر میں نے روک لیا "میں تو بھلاؤں گا ہی ان باتوں کو تم بھی بھلا دینا! پر سر کی مطعون گفتگو نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ میں رات بھر سو نہ سکا۔ اندرمی لی او سا تم نے بھی کبھی آسمانی رنگ کا دھواں دیکھا ہے۔ توبہ توبہ! آسمان تک اس کی بو پہنچتی ہو گی! تمھاری معصومیت پر مجھے یقین ہے اب ہم متفق ہیں۔ اچھا بھائی اب جتنا عرصہ سو سکتے ہو سو لو! جاؤ، بھاگو کہ چار بجے ہم کو پیاز کی منڈی کلاڈ پہ پڑاؤ کرتا ہے۔ تفکرات سے نجات ہو گی۔ کلاڈ، بہشت!"

وہ مجھ سے بغیر اٹھ کھڑا ہوا — سوچ میں ڈوبا ہوا اور بے چین۔!

آں جناب میک لین بہادر کی حاضری کے لیے میرے پاس بہت قلیل وقت تھا۔ میں نے سینے تک کپڑے اتار دیے اور گئی تھکے اندیے دنوں کے بعد نصیب ہونے والے مسرت آمیز لاابالی پن سے پانی کے چھینٹوں پر چھینٹے مارے!

"اس کمرے کو کھولنا میں نیچے مال کی بلٹی چھوڑ آیا ہوں۔"

بارہ بجے کا عمل تھا۔ ساری سہ پہر ہم جہاز پہ مال اسباب لدواتے رہے۔ یہ امر ایک ہندوستانیوں کے قبیلے اور چند دوغلے لوگوں کے لیے باعثِ خوشنودی تھا جو ابھی تک روشنیوں کے نیچے منتخب نشستوں پر براجمان تھے۔ جیکر کمپنی کے پاس کام کرنے والے متواتر آٹھ گھنٹے سے مصروفِ کار تھے اور انھیں کوئی وقفۂ آرام نہ ملا تھا۔ جہاز پہ افراتفری کا عالم تھا۔ کوئی نیچے جا رہا تھا، کوئی اوپر آ رہا تھا۔ اسباب ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا گویا اک غیر مختتم ریلا تھا۔ کمرے دھر تک بھر چکے تھے۔ بے شمار اور عظیم گانٹھوں اور بکسوں کی پہاڑیوں

کی گہرائیوں میں نہ جانے مجھے کتنی بار راستہ ٹٹول ٹٹول کر آنا جانا پڑا تھا۔ انھوں نے لوہے کے تنے ہوئے رسّوں کی قوت کو بُری طرح آزما ڈالا تھا، سخت اور مضبوط تختے بھی چیں کر اُٹھے تھے۔ نہ جانے مجھے کتنی بار اوپر آنا پڑا تھا۔ پیاز کی بو سے معطر! لاتعداد لکڑی کی پیٹیاں اِدھر اُدھر پڑی تھیں اور گانٹھوں اور بوریوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ نمبر تک نہ لگ رہے تھے! میرے ہاتھ کالے کلوٹے ہو رہے تھے اور چہرہ گرد و غبار سے اَٹا پڑا تھا لیکن رات راحت کا پیغام لے کر آگئی! ہولے ہولے افراتفری مدھم پڑ گئی اور شور و غل تمام ہوگیا! ہم گجر کی آواز آنے پر چل پڑے! دیدبان سے انجن کے کمرے میں گھنٹی کے ذریعے اطلاع ہوئی اور اس آگاہی کے عمل کو نیچے دہرایا گیا۔ کل پرزے گھومنا شروع ہو گئے۔ پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیز رفتاری کے ساتھ اپنے اَن تھک ترنم کو بارِ دیگر اختیار کر گئے۔ سمندر سے ہوائیں آ آ کر ہماری پسینے سے معمور پیشانیوں کو فرحت بخش رہی تھیں۔ جہاز نے ہمارے پاؤں تلے ہلنا شروع کر دیا۔ ہم سمندر پر رواں دواں تھے!

جب تک مجھے خیال بھی نہ آیا تھا کہ میں اپنے کاغذات کھو بیٹھا ہوں۔ انھیں ہر جگہ تلاش کیا مگر بے سود! نیچے کوٹھڑیوں کے کواڑوں کو لکڑیوں کی پٹیوں سے بند کر دیا تھا اور ان تک رسائی کا سوال پیدا ہونا حماقت تھی۔ اب کیا کروں! صبح کے وقت رجسٹروں کی خانہ پُری ضروری تھی۔

منہ پھُلائے سوئے ہوئے جہاز رانوں نے ڈانڈوں کو اپنی جگہ سے ہٹایا۔ ترپال کو اٹھایا، اور کواڑ کو ذرا کھولا کہ میں سیڑھی کے ذریعے قعرِ حبس میں اُتر جاؤں۔ ٹارچ کی مدھم لو میں بورے اور بکس بے اندازہ حجم اختیار کیے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور میں ان میں کاغذات کو تلاش کر رہا تھا۔ سمندر کی عظیم لہروں کے زبردست ریلوں نے جہاز کو جھولا بنا رکھا تھا اور اس کا ہلنا تکلیف دہ ہوگیا تھا۔ سمندر کے جو جید تھپیڑے جہاز کے ڈھلے پنجے سے آ آ کر ٹکراتے تھے اگر ایک عفریت کو ان کے عادی ہونے کا حوصلہ نہیں تھا تو ان کی مہیب ٹکروں سے اس کا لرزہ بر اندام ہو جانا واقعی امر تھا۔ اس بلاخیز طوفان سے لوہے کے بھاری شہتیر چیں چیں اور لوہے کی زنجیریں چھن چھن

کراہتی تھیں اور یہ آوازیں میرے کانوں میں برابر پہنچ رہی تھیں۔

واقعہ یہ ہے کہ میں ڈر گیا تھا اور مارے ڈر کے کانپ رہا تھا۔ وہ تھی کیا شے؟ اُس بوری کے پیچھے سے جس پر میں نے اپنے فراموش شدہ کاغذات کی جھلک دیکھی تھی۔ اک دبی گھٹی آواز آ رہی تھی۔ اک کھانسی کے مریض کی آواز جو کھل کر کھانس نہ سکتا ہو۔ سائیں سائیں! میرے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، سکتے کا یہ عالم تھا کہ مجھے اس گھڑی گمان ہو رہا تھا کہ اینٹھ کے ارتعاش کی بھی ٹوہ لگا لوں گا۔ وہاں کوئی نہ کوئی چیز ضرور تھی۔ اٹھ بھاگنے کی صلاح سے میں نے کاغذات جیب میں گھسیٹ لیے۔ مجھے اعوجاج سا ہو رہا تھا۔ میری دلی آرزو تھی کہ اُٹھ بھاگوں۔ میرا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ مگر اس پر بھی میں بڑھے جا رہا تھا۔ میں اس چھپی ہوئی بلا کے قریب تر ہوا جاتا تھا۔ میں بوروں اور بکسوں کے عظیم پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں یوں سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا گویا دریافت میری زندگی کا مقصدِ وحید ہو۔ اک بھولا بھٹکا بورا بکسوں کے پہلو میں چوڑا ہو کر پڑا تھا۔ اس کے نیچے پندرہ سال کا لڑکا دبک کر بیٹھا ہوا تھا اور اپنی آزردہ اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھ کو برابر تکتا جا رہا تھا۔ انتہائی بدحالی کا نمونہ تھا۔

"رحم صاحب رحم۔ کسی کو نہ بتانا میں سبھی کہوں!" اس نے میرے پاؤں پکڑ کر کہا۔

"ارے تم جہازی چور ہو!" اور یہ کہ اسے فرش سے اٹھایا اور یوں جھنجھوڑ ڈالا کہ معیّن کرنا مشکل تھا کہ ہم دونوں میں سے مداخلت کا ذمہ دار کون ہے؟ "تمھیں خبر بھی ہے کہ تم کر کیا رہے ہو! پاگل ہو تم! جہازی چور اور پھر اس جہاز پر" میں ایک آسیب زدہ شخص کی طرح ان الفاظ کو دہراتا رہا۔ ذہن میں کسی مقصد کو لیے بغیر میں اسے کاندھوں سے پکڑ کر ملکورے دے رہا تھا! میں حقیقت میں ہر طرح خالی الذہن تھا۔

میرے خوف کی نوعیت کا اندازہ لگائے بغیر لڑکا رحم! رحم! کے الفاظ دہرا رہا تھا۔ وہ شاید انھیں اپنی غیر متوقع دریافت پر محمول کر رہا تھا۔

"اس جہاز پر تمھارے لیے رحم کہاں نکچے!" میں نے لاتعلقی کے انداز میں کہنے کی کوشش

کی۔" میں اتنا کر سکتا ہوں کہ جہاں ہو۔ وہیں پڑے رہو! کھانے کے لیے بھی ہے کچھ؟"

"ناہیں صاحب! ناہیں!"

"اچھا، کل ملوں گا تم سے! چُپ چُپ خاموشی! جتن کروں گا کہ تمھیں اس مصیبت سے چھٹکارا ملے" اور میک لین صاحب اوپر سے چیخ رہے تھے "ارے اندریاس۔ نیند آگئی کیا ان کاغذات کے ساتھ تمھیں۔ رات وہیں بسر کرنے کی ٹھانی ہے کیا؟"

"آیا جناب آیا۔ وہ تو اک بورا ان پر آ رہا۔ اور مصیبت پڑ گئی مجھے۔"

کاغذات دفتر میں جمع کر کے فوراً ہی اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں سخت ہیجان خیز جذبات کا شکار ہو رہا تھا۔ خیال ہے کہ پرسر نے پوچھا بھی تھا کہ کہیں میں بخار میں تو مبتلا نہیں ہوں یا پاگل ہونے کے تو ارادے نہیں جب احساسات کی شدت کے ہاتھوں نڈھال ہو کر بستر پر پڑ گیا تو اک گت کی طرح میرے ہی الفاظ بار بار میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ "وہ تو اک بورا ان پر آ رہا! اور مصیبت پڑ گئی مجھے۔"

بورا تو واقعی ان پر آ رہا تھا مگر وہ بورا بھی کیا ہی بورا تھا!

صبح کے پانچ بج رہے ہیں! کیا یہی مقدر میں لکھا ہے کہ اس جہاز پر نیند مرے لیے حرام ہو جائے۔ خیالات کا ہجوم دماغ پر حاوی تھا۔ اس بیچارے بچے کو بچانا ہی ہو گا۔ اب اسے کھانا کیسے پہنچایا جائے؟ کواڑوں پر ترپال سے ڈھکی ہوئی لکڑی کی پٹیاں جڑی ہیں اور انھیں کھولنے کے لیے دو آدمی درکار ہیں جس سے راز کا راز رہنا ناممکنات میں سے ہو جائے گا۔ صرف اندرمی لی او ہی تھا وہ شخص جس پر میں اعتبار کر سکتا تھا۔ جہاز کے تہ خانے والے گودام میں دروازہ ضرور ہو گا مگر ہو گا وہ بھی مقفل! پھر اس کی چابی کس کے پاس ہو گی؟ خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے دن کے نکلنے کے لیے کس قدر دعائیں کیں!

بہرکیف میں خوش تھا۔ میں ایک گرانمایہ بوجھ اٹھائے ہوئے تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ میں اس بار کے قابل ہوں۔ جہاز پر میری زندگی اب تک افسردہ اور دلچسپی سے خالی تھی۔ اب اسے

اک مقصد متیسر ہو گیا تھا۔ مجھ میں اُس غریب، کسمپرس مخلوق کے لیے شفقت پھوٹ پڑی تھی جو محض اس لیے اتنی بدنصیبیوں کو برداشت کرتا آیا تھا کہ اک نئی ہولناک تقدیر کے جال میں پھنس جائے ا ہیں جہاز کو بھی جانتا تھا اور جہاز میں آنے والے واقعے کو بھی۔

آہستہ آہستہ ایک مدہم سی روشنی جہازی روشندان کے گول شیشے میں سے آنا شروع ہوئی۔ طوفانی سمندر پر بھاری بادلوں میں سے دھندلی سی پو پھٹ رہی تھی۔ ہوا تھم گئی تھی اور جب جہاز کا اگلا حصّہ تیز رو لہروں میں ابھرتا اور ڈوبتا تھا تو سیاہی مائل سطحِ آب کی شکنیں بڑی بڑی نہروں میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔

چار بجنے سے پہلے ہی میں لباس پہنے تیار کھڑا تھا۔ میں عرشے پر چلا آیا۔ بادِ نسیم میری فکر آلود اور تپتی پیشانی سے کھیلتی تھی جس سے مجھے اک گونہ راحت محسوس ہوتی تھی۔ پسکو کے پہاڑوں کے نیچے ساحل کا کنارہ، افق پر بمشکل نظر آتا تھا۔ جہاز کے ملازم عرشے کو پانی سے دھونے میں چپ چاپ مصروف تھے۔ میرا خیال ہے کبھی کبھی وہ مجھے کنکھیوں سے دیکھ کر سرگوشیاں کرتے تھے۔

او خدایا! کیا انھیں بھی پتا چل گیا؟ مگر بدیہی طور پر یہ ممکن نہیں تھا۔

صدر ملاح کشتی میں پاس سے گزرتے ہوئے بولا۔ "صبح بخیر، ری کارڈو صاحب!"

"ہیلو۔ پانچو صاحب۔"

"یہ کیا کہ آپ اتنی صبح سویرے آگئے؟ چوکیداروں کا کہنا ہے کہ آپ کھاٹ سے گر گئے تھے۔ دیکھیے نا وہ ہنس رہے ہیں!"

"مجھ پر ہنس رہے ہیں، پانچو صاحب؟ مجھے کچھ سر درد تھا اور اب ہوا خوری کے لیے آ نکلا ہوں۔"

"امید کہ آپ اب بہتر ہوں گے!"

"مہربانی! — بھئی پانچو صاحب؟"

" جی، ریکارڈو صاحب!"

" افسر سوم کہاں ہوں گے ؟"

" اندرومی لی او صاحب؟ ابھی ابھی ہال کمرے میں گئے ہیں۔ آپ کو وہیں مل جائیں گے۔ وہ پہلے شخص ہیں جو ناشتہ کر رہے ہیں ۔"

میں ایک ہی جست میں تا بدان سے آ رہا۔ دیے ابھی تک روشن تھے۔ اور اندرومی لی او ایک بڑے سے گرما گرم کافی کے پیالے کے سامنے بیٹھا ہوا اسرا غرسانی کہانی پڑھ رہا تھا جس میں وہ قطعی کھو گیا تھا۔

میں داخل ہوا تو اس نے مجھے نظر اٹھا کر دیکھا لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ میں اتنی صبح سویرے کیوں آ موجود ہوا ہوں۔ وہ میری پریشان حالی کی وجہ بھی نہ تاڑ سکا۔

خوش قسمتی سے وہ ہال کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔

کسی تمہید باندھنے کی کوشش کے بغیر ہی میں نے کہنا شروع کر دیا " وہی ہوا جس کی توقع تھی، سمجھ نہیں آتی کہ کیا کروں۔ میں سوچنے سے بھی عاری ہوں!"

" کس بات سے اتنا پریشان ہو رہے ہو؟ سکون اور دلجمعی سے کام لو!"

" یہاں اک لفظ بھی نہیں کہوں گا میں! جس قدر جلد ممکن ہو ناشتے کو نگلنے کی کرو۔ میں کمرے میں تمھارا منتظر ہوں ۔"

" ارے ہوا کیا ہے؟" اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔

" نہ نہ، زور سے نہ بولو۔ کمرے میں چلے آؤ!"

" دروازہ تو یقیناً ہے مگر ہے جہاز کے اگلے حصے کے بلند عرشے میں اس کی چابی ناخدا کے پاس ہے۔ پہلا وقت ٹھیک رہے گا اور لبدہ ملازمین جہاز کے ہوتے ہوئے کوئی قدم اٹھانا انھیں شک و شبہ کی گنجائش دینا ہے ۔"

" میں اسے اتنی بہت کھانے پینے کی خشک چیزیں دے دوں گا کہ سارا سفر آرام سے کٹ

جائے گا۔"

"لیکن بندۂ خدا وہاں تو وہ دم گھٹ کے مرجائے گا۔ کوئی جاندار سانس تو لے نہیں سکتا وہاں!"

اندرومی لی او کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی رگ رگ پھڑک اٹھی تھی۔ وہ سرتاپا جوش تھا۔ اس کا جوش سرکشی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

اس نے کر گزرنے کی ٹھان لی۔ وہ پھٹ پڑا۔ "اب یہی ہو سکتا ہے کہ اسے تمہارے کمرے میں لے آؤں یا اپنے کمرے میں! اور بس!"

"بہتر یہی ہے کہ اسے میرے کمرے میں لے آؤ! میں لے دے کے مال کپتان ہی ہوں نا۔ میں یہ خطرہ بآسانی مول لے سکتا ہوں مگر تمہاری تو زندگی ہی برباد ہو کر رہ جائے گی!"

"اجی جہنم رسید کرو ایسی زندگی کو۔ مگر مجھے تو سارا دن عرشے پہ کاٹنا پڑتا ہے اور تمہارے پاس بہتیرا وقت ہوتا ہے۔ ہاں بندرگاہ ہو تو بات اور ہے۔"

ہم دونوں سوچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے اور سوچ کو ختم کرنے کے ارادے سے کہا۔ "تو پھر آج رات ٹھیک رہے گی؟"

"چلو آج رات ہی سہی۔ لاؤ استاد ہاتھ!" ــــ اور اندرومی لی او نے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ مارے خوشی اور جوش کے آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا! کوئی دیکھتا تو کہتا کہ حسین ناگہانی چیز سے میں اس قدر خوفزدہ تھا۔ وہی اس کی روح کا چین تھی۔ اب سے پہلے میں اس کی انسانیت کی وسعت سے آشنا ہوا تھا۔ اس کی دوستانہ سرگرمیٔ شوق کو نہ جان سکا تھا جو اجڈ ظاہریت کے پردے کے نیچے فروزاں تھی اور جس نے بچے کی سی حسیت کو چھپا رکھا تھا۔ آخر مجھے وہ شخص مل ہی گیا جو گرمیٔ قلب سے تنا سا تھا۔ جس کی روح نیکی کے لیے تڑپتی تھی! خدا اپنی برکات نازل کرے اس مصائب بھرے دن پر۔ ان لوگوں کی بیگانہ وار صحبت پر جس کے ذریعے ہمیں اپنے دونوں کی بھرپور اور آزادانہ ہم آہنگی اور رفاقت کی ہم نوائی کا موقع نصیب ہوا ــــ وہ

ہم آہنگی اور رفاقت جواب تک ساکت و خموش تھی۔ اپنے میں مگن تھی اور اپنی ہی حدوں میں مقید ہو کر رہ گئی تھی!

میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دبا لیا۔

"میں جانوں تم واقعی دوست ہو!"

"بیٹھ جاؤ اور چپ رہو!"

لڑکا سہم کر سوفے کی نشست کے کنارے بیٹھ گیا۔ نیچے کی کوٹھڑی کی تاریکی کے بعد یہاں کی روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

اس لمحے کی مجھے بڑی آرزو تھی۔ دن بھر اس کی توقع رہی اور اب کہ میں اس سے دوچار تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ کس طرح اسے بٹھاؤں! میں اس سے بے تکلفانہ پیش آنا چاہتا تھا مگر عجیب بے سرے پن سے متردد ہوتا تھا۔ میری متانت اور بے رخی اک مال کپتان کی سی تھی جو آلوؤں یا پھلوں کی بوریوں اور بکسوں کی جانچ پڑتال کر رہا ہو!

میں نے دروازے کو ابھی ابھی مقفل کیا تھا۔ اسی سے ٹیک لگا کر اپنے نو آمد مہمان کا جائزہ لینے لگا۔ جب وہ روشنی کا عادی ہو گیا تو اس نے اپنی ناقابلِ فہم اور ترچھی آنکھوں کی نظریں مجھ پر گاڑ دیں۔ اس کی انتہائی ہوشمندی اور دلچسپی سے میں گھبرا سا گیا اور اس گھبراہٹ کو چھپانے کی خاطر میں نے سوالات پوچھنے شروع کر دیئے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"حضور، چینی لڑکا!"

اس کے لہجے سے میں پہچان گیا کہ بیونس آئیرز کا رہنے والا ہے۔

"میرا باپ مارکو اے رز نامی ارجنٹائن کا تھا۔ میری ماں چینی تھی۔ جب گھر کو چھوڑا تھا تو اتنا چھوٹا تھا کہ اب یاد بھی نہیں کہ کب بچھڑا تھا۔ جب سے لوگ مجھے ترچھی آنکھوں کی وجہ سے چینی لڑکا کہتے ہیں۔"

اِک غیر مطبوع خاموشی چھاگئی ۔

اپنے اطمینانِ خاطر کو پھر سے حاصل کرنے کی اُمید میں. میں نے سکوت توڑا "میاں چینے، کچھ کھانا کھا لو، بے تکلفی سے رہو اور مزے سے بسم اللہ کرو! تمھیں کھائے پئے بھی بہتیرا وقت گزرا ہوگا۔"

اس نے منہ سے اِک لفظ نہ نکالا اور میز کے پاس کھانے کو بیٹھ گیا۔ وہ اک اک لقمہ کو تول تول اور سوچ سوچ کر کھا رہا تھا۔ اس نے میری جانب پوری بے التفاتی برت رکھی تھی۔

میں پائپ سلگا کر نشست پر بیٹھ گیا اور اس غیر معمولی تخلیق کو بنظرِ غائر دیکھنے لگا جسے تقدیر نے میرے ہاتھوں میں لا ڈالا تھا۔ میں جو عرض کر رہا ہوں کہ قسمت نے اسے میرے ہاتھوں میں لا ڈالا تو کسی ادبی صنائع بدائع کے بغیر عرض کر رہا ہوں مجھے اس سے پہلے انسانی زندگی کو کلیتاً نبٹانے کے پُر نشاط اور دہشت خیز احساس کا تجربہ نہیں ہُوا تھا ۔ زندگی کہہ لیجیے یا موت دونوں کا مجھ پر بھر پور انحصار تھا اور کون جانے یہ انحصار کتنی اَن گنت ذلتوں، مایوسیوں اور تاریکیوں پر منتج ہو! موت بھی مرے ہاتھوں میں تھی اور زندگی اور موت کے درمیان انسانی تقدیر کے تمام مرحلے اور سلسلے بکھرے پڑے تھے ۔ جذبات کے کھولتے ہوئے سمندر ۔ عریاں اور حیا سے بے نیاز۔ جذبۂ قربانی اور بے غرض محبت کے صاف شفّاف چشمے — وہ بے غرض محبت جو موت سے بعید ہوتے ہوئے ۔ لافانی زندگی کی ضامن ہے —

چینی لڑکا میرے شریک افکار نہیں تھا اگر تھا بھی تو کم از کم آثار اس کے اظہار سے قاصر تھے ۔ وہ بے حد محتاط ہو کر کھانا کھائے جا رہا تھا ۔ اس کی نظر کبھی کبھار کسی تصویر پر جا ٹھہرتی یا کسی کتاب کے نام پر جو چھائی ہوئی پراگندگی میں بھی پڑھا جا سکتا تھا۔ وہ عجیب سا لڑکا تھا۔ سنجیدہ ہونے کے باوجود لاغرض سا تھا ۔ اس کی سنجیدگی کو طفلانہ سنجیدگی کہنا پڑے گا جو پیر دگی کے مترادف تھی ۔ وہ کشیدہ قامت تھا اور مضبوط جسم ۔ اس کے جسمانی پٹھوں کی نشو ونما اپنے ہم عمروں سے کہیں بڑھ کر تھی ۔ اس کی رنگت، زردی مائل تھی اور یہ پیلا پن

ان لوگوں میں عموماً اک طبعی بات ہے جو نہایت سرخ ہونٹوں کے مالک ہوتے ہیں۔

پہلے پہل میں نے اسے جتنا کم عمر سمجھا تھا روشنی میں وہ اتنا کم عمر نظر نہ آتا تھا۔ سترہ کا کہوں گا یا زیادہ سے زیادہ اٹھارہ کا۔ جب کھانا کھا چکا تو اس نے اس شراب کی چسکی بھری جو میں نے اس کی خاطر انڈیل رکھی تھی اور پھر صبر و تحمل کے ساتھ میری طرف مڑا گویا کسی امتحان کا منتظر ہے۔

"ہیلو! چینی میاں —" میں نے دل لگی کے انداز میں کہا۔

اس کے لبوں پر وہ نورانی مسکراہٹ کھیل گئی جو مشرق کے سوا اور کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔

وہ میرے پیروں پر گر گیا اور ایک محبت بھرے بچے کی ادائے دلربائی کے ساتھ میرے ہاتھ کو اپنی پیشانی سے لگاتے ہوئے لبوں تک لے گیا۔ مجھ میں حیل و حجت کرنے کا حوصلہ نہ رہا۔ میں نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ گرم گرم آنسو میرے ناخنوں تک بہہ آئے ہیں!

عرشے پر گھنٹہ چار دفعہ گونجا۔ صبح کے دو بج رہے تھے۔

باہر سے فرحت بخش سمندر کا شور و غل سنائی دے رہا تھا۔

میں میدان میں نکل آیا تھا۔ ہم مولین ڈو پر رکے کہ دو آدمیوں کو اتارنا تھا جو کہ لادہ پر جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ دوسرا پڑاؤ اُن تو فا گاسٹا تھا جہاں ہمیں امید تھی چینے کو چوری چھپے اتار دیں گے۔ میں اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے مضطرب تھا کہ اس کی موجودگی کے نتائج مجھ سے کہیں زیادہ اس کے حق میں مہلک تھے اور اندروں لی اذکو بیابی بھی تو مل گئی تھی۔

چینا اپنے دن مقفل کمرے میں کاٹ رہا تھا۔ میری کتابیں پڑھتا یا نشست پر لمبے پڑے پڑے خوابوں کی وادی میں کھویا کھویا رہتا۔ اس کے بازو سر کے نیچے ہوتے تھے اور نظریں

چھت پر اس کا کرتا دھجیاں بن چکا تھا۔ نکما ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی جگہ اسے اپنا سوئیٹر دے دیا۔ ہم بہت کم باتیں کرتے تھے۔ اس کی توجہ سے بچنے کے لیے میں بہت سویرے ہی اُٹھ کر باہر آجاتا تھا۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ وہ سخت زکام میں مبتلا تھا اور مسلسل کھانستا چلا جاتا تھا۔ جب میں ہال کمرے میں یا عرشے پر ہوتا تو مجھے بھی مجبوراً کھانسنا پڑتا تھا۔ مگر اس وقت کا اندازہ لگائیے جب کوئی میری عدم موجودگی میں اسے کھانستا ہوا سن لے!

ایک صبح کا ذکر ہے کہ میں اندرومی لی او کے ساتھ عرشے پر ٹہل رہا تھا۔ ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور اس میں جنوب کی ہئیت صاف نمایاں تھی۔

اندرومی لی او سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"ری کارڈو! کیا ہوگا اگر ہم ان نوفاگاسٹا سے گزر جائیں؟"

"یوں قابلِ مسرت تو نہ ہو! وہ ٹھہرنے کی باقاعدہ بندرگاہ ہے!"

"توقع یہی ہے کہ ہم اس سے گزر جائیں۔ بہانہ پانی میں بہت گہرا ڈوبا ہوا ہے۔ ناشتے کے وقت تم نے دیکھا نہیں کہ حرامی (کپتان) دل پارے زر لوٹ جانے کو کس قدر بے چین تھا۔"

میں نے نظریں بچا کر پائلاٹ بسکٹوں کو جیبوں میں ڈال لیا تھا۔ کہیں دیکھ نہ لیا ہو اس نے؟!

"اس نے تو نہیں البتہ خدمت گار نے تاڑ لیا تھا۔ جب پچھلی دفعہ تم میز سے اٹھے تھے تو اس نے نرخرے کی آواز بھی پیدا کی تھی۔" میری نظریں چار ہونے پر اضافہ کیا۔ "بس ذرا اپنی چاک چوبندی دکھا رہا تھا وہ!"

"کہو اندرمی لی او! اگر انھیں ہمارا پتہ چل گیا تو پھر کیا ہوگا؟"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے! ہمیں پتہ بھی نہ چلے گا کہ وہ کیا کریں گے۔ بعض باتیں تو وہ قطعاً مشتہر نہیں کیا کرتے!"

"اندرومی لی اد! اب وہ ہمارا بچّہ ہے! اس کی تقدیر ہمارے ہاتھ میں ہے!"
چند لمحے اندرو می لی اد خاموش رہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں ای کارڈو! موت کا ہمیشہ صدمہ ہوتا ہے چاہے وہ ناواقف آدمی ہی کی کیوں نہ ہو! مگر جب تم ایک آدمی کی دیکھ بھال کرتے رہے ہو۔ جب وہ تمھارے سپرد کر دیا گیا ہو اور جب اس کی معصومیت اور ناگفتہ بہ فلاکت تمھارے روبرو ہو تو اس کی موت کا تصور بھی ناممکن ہے۔ میرا سب کچھ یہی بچّہ ہے۔" وہ دور افق پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ "میرے لیے وہ اِک الہام ہے۔ اک خزینہ ہے جسے میں قائم دائم رکھوں گا۔ اک ذمہ داری ہے اک موقع ہے! میں نے زندگی بھر اور کوئی نیکی نہیں کی اور وہ اسے مجھ سے چھین نہیں سکتے! کل کی بات ہے جب تم میک لین کے پاس گئے ہوئے تھے تو اس نے مجھ سے وہ وہ باتیں کیں جو تم سے کبھی نہیں کرے گا۔ میں ذرا اُجڈ ہوں اور اسی اُجڈ پن نے اس کی حوصلہ افزائی کی! تم ہو بھی تو بے حد شائستہ نا!"

"تو بُری ٹھہری یہ بات!"

"اجی نہیں! بات یہ ہے کہ تم بہت عالم فاضل ہو۔ میں ٹھہرا عوام کا اپنا! اس لڑکے نے اپنی زندگی بندرگاہوں کے فلاکت زدہ مزدوروں کے ساتھ گزاری ہے۔ تو ایسوں کو مجھ سے عامیوں میں کچھ ایسی بات نظر آتی ہے جسے وہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ دس سال کا تھا کہ اک دی ڈور کے اک لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ نکلا۔ یہ لڑکا اس سے عمر میں کچھ بڑا تھا۔ یہ دونوں دریائے پلیٹ سے والپے رسے زو کو جانے والے 'نارجی ین' جہاز میں سوار ہو گئے۔ ان کے ساتھ چند نقرئی سکّے تھے۔ جب یہ ختم ہو گئے تو انھوں نے پیٹ بھرنے کے لیے بوٹ پالش کرنے شروع کر دیئے۔ یہ نارمانوی چیز ہیں؟ ان کے ماں باپ قدرے آسودہ حال تھے۔ بیچارے نالوں کی چھتوں کے نیچے سو رہتے تھے۔ ایک رات کو چینے کا ساتھی سخت دقت کے ساتھ سانس لے رہا تھا جس سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

کیا دیکھتا ہے کہ اس کی مٹھی بھنچ رہی ہے جیسے وہ بار بار زمین پر مار رہا ہے ۔ معاً گرفت ڈھیلی پڑ گئی ۔ ہاتھ ٹھنڈا یخ تھا چینیا اس ساری طویل سرد رات میں ذرا ہلا تک نہیں ۔ مگر صبح کو اس کا دوست ختم ہو چکا تھا ۔ دماغ کی نس پھٹنے سے موت واقع ہوئی تھی ۔ چینیا گماٹوں کے آس پاس بلا مقصد گھومتا رہتا تھا ۔ باردوں کی بندرگاہ پر کوئلے کے جہازوں کے ملاحوں کا جم غفیر ہوتا تھا ۔ چینیا ان سے روٹی مانگ مانگ کر پیٹ بھرتا تھا ۔ کبھی تو روٹی ملتی تھی اور کبھی مغلظ گالیاں ۔ ایک روز اسے روٹی کی قیمت بہت مہنگی ادا کرنی پڑی ۔ وہ کوئلے کے ڈھیروں میں بے ہوش پڑا ہوا پایا گیا تھا اور پولیس اٹھا لے گئی تھی ۔ کپڑے تار تار تھے اور خون شرمناک طور پر بہہ رہا تھا ۔ خدا ایسے وحشی درندوں سے سمجھے! جب ذرا چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو چھپ چھپا کر جہاز میں سوار ہو گیا اور پیرو آ پہنچا ۔ کلاؤ پر چینیوں نے اسے اپنا سمجھا اور واقعی شفقتِ پدرانہ سے پیش آئے ۔ اس کی رگوں میں مشرقی خون دوڑ رہا تھا جس کا احساس اس میں بیدار ہو گیا تھا ۔ تین سال پیرو میں بڑے آرام سے کام کرتا رہا ۔ لیکن بعد میں ایک ڈاکہ زنی کے سلسلے میں مشتبہ ٹھہرا کہ اس میں اس کے چند دوستوں کی شمولیت کا شبہ تھا اور وہ ان دوستوں کے متعلق کوئی بھی بات بتانے سے گریزاں تھا ۔ وہ بے جرم ہونے کے باوجود بھاگ جانے پر مجبور کر دیا گیا اور یوں وہ ہمارے جہاز میں آ چھپا ۔"

" بڑا اچھا ہوتا جو لائما میں اسے قید کر ڈالتے ! "

" لیکن وہ کسی کو مشکوک سمجھتا جب نا ! "

" اس کے لیے بھی خدا کا شکر ہے ہش ۔ چپ چپ ۔ وہ دیکھو پرسرا ! "

پرسر خوشی کی ترنگ میں تھا ۔

" کیسے مزاج ہیں میک لین صاحب ؟ " ۔۔ مجھے خیال سا گزرا کہ وہ ہمیں مشکوک سمجھتا ہے ۔

" بھئی ! کچھ اپنی ہی کہو ۔ اچھا بتاؤ موسم پسند ہے کہ نہیں بھئی ؟ امید ہے کہ سفر کے آخر تک یہی کیفیت رہے گی ! اگر تمھاری مانیں تو کسی بندرگاہ پر ٹھہریں ہی نہ ۔ مگر نہیں بھائی جوانی

کو سمندر سے عشق ہے - ہر روز اک نئی بندرگاہ اور اک نئی حسینہ! ہیں نا؟ کیوں نملا؟ کہا ہے کچھ ہر بندرگاہ پر اک نئی حسینہ! کیا بات ہے جوانی کی، ہاہا، ہوہو!"

"اے جناب اب .....!"

"تو گویا ظاہر یوں کرنا چاہتے ہو کہ مجھ سے متفق نہیں ہو تم اور! ارے آج کل کے نوجوانو! ہم تم سے مختلف تھے ہم اعتراف کر لیا کرتے تھے بھائی - نہ کوئی راز نہ کوئی پردہ داری! تم برخوردارو! ساری رات تو مابعد الطبیعی مسائل کے سوچنے اور حل کرنے میں کاٹ دیتے ہو اور دن کو ایک چھوٹی سی کوٹھری میں مقید ہو کر ادبیات یا کچھ اسی طرح کی اور چیز کی تخلیق میں لگے رہتے ہو!"

میں اس زہر چکانی سے بچنے کو تھا کہ اندر دمی لی اور نے ٹھوکر مار دی!

"اوہو! اک بوڑھا شریف آدمی تو چلتا ہی چلا جائے گا - کیا راستے ہے تمہاری! کبھی آؤنا نیچے شراب گھر میں اور وہاں جب میری نئی مرکب کو چکھو گے تو قطعاً پہچان نہ سکو گے کہ کیا چیز بن گئی ہے - اس جہاز میں کوئی اصل مدھ رسیا ہے بھی تو نہیں - چلتی نظر رف کے ہمراہ میرا پیش رو اک ملازم بھی چھوڑ گیا تھا - کیا ہی آدمی تھا، ہی موریلز! برا ہوا کہ جہاز کی غرقابی سے پیشتر اس کی روح غرقاب ہو گئی مگر بہر حال اپنی بوتلیں ڈبو نہ سکا اپنے ساتھ - جی ہاں! حضرت! وہ تھا شرابی - اب تو میں کبھی کبھار صرف اک آدھ گھونٹ چڑھا لیا کرتا ہوں اور میں امید کرتا ہوں کہ تم اس اعتدال کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھو گے! اور تم صاحبو! تم بھی اعتدال کا دامن نہ چھوڑنا!" وہ بہک گیا تھا اور اس نے شراب گھر کے کٹہرے کا سہارا لے رکھا تھا، "کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں اتنی پی گیا ہوں کہ دماغ ہی چل گیا ہے! اندریاس صاحب جانتے ہیں اور میں تمہیں سے اپیل کرتا ہوں اندریاس صاحب کہ تم تائید کر دینا ذرا ــــ اور ہاں! میرا حساب کتاب غلطیوں سے قطعاً مبرا ہوتا ہے - اس جہاز کی اک اک بوری اک اک بکس اور اک اک آلو کا حساب میرے نوک زباں ہے - اک اک مائی کے لال کو جانتا

بحری نمک

ہوں جو ہزار چوری چھپے گودام کے تاریک ترین کونے کھدرے ہیں ہی کیوں نہ گھس آیا ہو۔ اور میں کوئی شیخی تو نہیں بگھار رہا؟" یہ کہنے کے بعد وہ خاموشی سے مڑا اور چلا گیا۔

میرے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں! اب اس امر میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ اسے پتہ چل گیا ہے۔ شراب گھر میرے گرد گھوم رہا تھا!

جب پرسر خدمتگار سے اُلجھ رہا تھا تو اندرومی لی او نے سرگوشی میں کہا "یہ بھی کوئی بات ہے بھلا زری کارڈو! پریشانی کاہے کی؟!"

اس افسردہ ناک دورِ مے نوشی کے باقی ماندہ حصے میں افسر سوم نے ہماری گفتگو بھی اپنے ذمہ لے لی۔ میں بدحواس ہو رہا تھا۔ چیف انجینئر داخل ہوا اور آتے ہی پرسر سے جہاز کے دن بھر کی مسافت پر تکرار شروع کر دی۔ ہماری عدم موجودگی کا احساس ان کی تکرار کی گرمی میں کھو گیا اور ہم وہاں سے کھسکتے بنے۔

مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ اس تازہ صورتِ حال پر اندرومی لی او سے تبادلہ خیال کروں میں سیدھا اپنے کمرے کی طرف دوڑ آیا اور دروازے میں چابی کو دو دفعہ گھما دیا۔

چینا لمبا پڑا ہوا چھت کو تک رہا تھا۔ اُس نے میرے آنے پر ذرا اظہارِ تحیر نہ کیا اور نہایت آرام سے آنکھیں موند لیں۔ جب میں نے اس مجسمہ سکوں کو یوں دیکھا تو میری ہمت بھی بلند ہو گئی۔ نہیں، یہ کبھی ہو نہیں سکتا! میں مہمان کی بابت افترا پردازی سے کام لے رہا ہوں شاید۔ یہ بیسویں صدی ہے۔ یعنی ۱۹۳۶ء ایک ہزار نو سو چھتیس! لبِ ساحل شہر آباد ہیں۔ خوش نما باغات ہیں۔ سینما ہیں اور بازاروں میں پولیس بھی ہے اور فوجی بھی! اور زمانہ ہے ایک ہزار نو سو چھتیس کا۔ یہ ہے بات! مجھے کیا ہو رہا ہے۔ آدمی کو زندہ جلا دیں گے؟ ناممکن! مجھے کسی ماہر معالج ذہنی کی ضرورت ہے اور وال پے رے زو میں بہتیرے اچھے موجود ہیں۔ اسے زندہ ہی دفن کر دیں گے! خیال ہی ہولناک تھا۔ میں اسے مشتہر کر دوں گا۔ مضحکہ خیز! اسے دفن کر دیں گے!

اف خدایا۔ مگر کر ڈالیں گے وہ یہی!" میں ان آخری الفاظ کو انتہائی زور کی آواز کے ساتھ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ سارا کمرہ گونج اٹھا تھا۔ کہتے کہتے صوفے پر دھڑام سے گر پڑا۔ مجھ پر اتھاہ دل شکستگی کا عالم طاری تھا۔

جب مجھے ہوش آیا، تو صوفے پر پڑا ہوا تھا۔ چینا گھٹنوں کے بل میرے پاس بیٹھا تھا اور بے چینی سے مجھے تک رہا تھا، اس سے پہلے میں نے اسے کبھی اتنا رقیق القلب نہیں دیکھا تھا۔ بے نیازی شاید اس کی ادائے خاص تھی۔ وہ میری پیشانی پر گیلا تولیہ رکھ کر دباتا رہا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا "اندریاس صاحب، اندریاس صاحب، پہلے سے اچھے ہیں نا آپ۔ کسی نے دو دفعہ دروازہ کھٹکھٹایا، میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ آپ میری خاطر دکھ جھیل رہے ہیں۔ آپ دکھ نہ جھیلیے! چینا اس قابل نہیں۔ وہ ڈرپوک بھی نہیں چلی (CHILE) نے اس کے حق میں کبھی نیکی نہیں کی۔ معاف کیجیے آپ وہاں کے تو نہیں ہیں۔ اپنی زندگی کا برے سے برا اور اچھے سے اچھا حصہ وہیں کٹا ہے۔ آپ نے کیا کہا تھا؟ قسمت؟ آپ، آپ بہت خطرے مول لے رہے ہیں۔ چینے کی پروا نہ کیجیے۔ اسے کئی دفعہ بڑی سخت سخت موت آئی ہے۔"

"ارے چینے، بس بھئی بس! تم تو مجھے پست ہمت کر رہے ہو!"

دروازے پر ہلکی سی تھپک سنائی دی۔

میں فوراً پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں، اندرومی لی او! ذرا باہر آ جاؤ تو کچھ باتیں کریں۔"

دھند لکا بڑھ رہا تھا۔ کپتان اور چیف انجینئر عرشے پر ٹہلتے ہوئے مزے مزے سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ ہمیں نظر انداز کر گئے۔ اندرومی لی او مجھے دنبالہ جہاز کی طرف لے گیا کہ میری ہیئت کذائی پر نظروں کا اٹھنا یقینی امر تھا۔ میرے کپڑوں کی حالت

ابتر تھی۔ میرے خدو خال سے ذہنی کرب اور رنجیدگی کا اظہار نمایاں تھا۔ جب ہم جہاز کے رفتار پیما سے گزر کر کٹہرے تک پہنچ گئے تو اس نے راز داری کے لہجے میں پرسر کے متعلق سنا سنایا سب دہرا دیا۔" اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ شرابی سؤر کہانی کے ہر پیچ و خم سے بخوبی آگاہ تھا۔ کہانی اس تک پہنچی کیسے ؟ اتفاقات کی چند کڑیوں کے ذریعے جن کا منبع وہ باہمی آویزش تھی جو دو روز پیشتر ان آدمیوں میں واقع ہوئی جو جہاز کے اگلے حصے پر کام کر رہے تھے۔ ایک محنت کش زخمی ہو گیا اور ڈاکٹر نے آکر اسے کلوروفارم سنگھا دیا جس کے زیر اثر وہ مسلسل ایک لڑکے کی بابت کہتا رہا جسے انھوں نے گودام میں چھپا ہُوا دیکھ لیا تھا۔ انھوں نے اس کی کچھ چیزیں بھی ہتھیالی تھیں اور اور بھی ناگوار باتیں کرتا رہا جو جبران کن نہیں تھیں۔ اسی سہ پہر کو دعوتِ شرب و شراب میں ڈاکٹر نے ایک گدھے کی مانند جسے افیم کی لت کو ڈھد پر کھاج تھی سارے راز سے پرسر کو آشنا کر ڈالا اور اک بلا آپڑی کہ بسکٹوں کا قصہ لیے ہوئے عین اس لمحے خدمتگار بھی ظہور پذیر ہو گیا۔ جب یہ دونوں شراب میں سرمست و سرخوش تھے اور ایسے افسانوں کے لیے ہمہ تن گوش بسکٹ وہی تھے جنھیں میں جیب میں محفوظ کر لیتا تھا۔ دو میں دو ملائے تو بن گئے چار اور یہ رہے آپ!

"مجھ سے پینے نے ان محنت کشوں کی آویزش کا کبھی ذکر نہیں کیا۔"

" ہاں ریکارڈو وہ تم سے ڈرتا جو ہے۔ چونکہ وہ تمھاری عزت کرتا ہے اس لیے اس نے مجھ سے تو بہت سی باتیں کر ڈالیں اور تم سے باید و شاید ۔ اسی طرح یہ بات بھی تم سے چھپائے رکھی ۔ اسے مجھ سے کہیں بڑھ کر تمھارا خیال رہتا ہے!"

" اندر ومی لی ادا میں نیچے جا رہا ہوں کہ اس معاملے کی بابت کچھ اور بھی اس سے پتہ لگا دُوں جس قدر ہمیں معلوم ہے اس سے کہیں زیادہ اور بھی موجود ہو گا۔"

"اس ہنگامے کے ہوتے ہوئے میں تمھیں چھوڑنے سے تو رہا!"۔

جب ہمیں یقین ہو گیا کہ راستے میں کوئی موجود نہیں تو ہم کمرے کو چل پڑے۔ میں نے

چابی کے لیے جیبوں میں ہاتھ ڈالا۔ مگر چابی کہاں؟ میں نے ہر جگہ اس کی تلاش کی پر بے سود! پھر اندرومی لی اونے طور ڈھب سے کام لے کر دروازہ کھول دیا۔ کمرہ خالی تھا۔ سرہانے کی سلوٹیں صاف کردی گئی تھیں۔ کتابوں کو ترتیب اور سلیقے سے رکھا گیا تھا اور نم آلود تولیہ کو خشک کرنے کے لیے خانے پر پھیلا رکھا تھا۔ مگر چینا کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

"اندرومی لی او! چینا گیا!" میں نے نامرادانہ کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

اندرومی لی او نے دروازہ بند کردیا۔ سگار سلگایا اور سامنے کی نشست پر براجمان ہو گیا۔

"ای کارڈوا تم سے ایمان کی بات کہوں کہ بہت ہی اچھا ہوا۔"

"خدا کے لیے یہ نہ کہو۔ وہ پکڑا جائے گا اور پھر۔"

"قیاس کہتا ہے کہ انھوں نے اسے پکڑ ہی لیا ہوگا۔"

"کل ہمیں انتوفاگاسٹا پر قیام کرنا ہی تھا۔ اسے بھی ساحل پر اتار دیتے۔"

"جی نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ کپتان کا ارادہ ہے کہ وہاں سے گزر جائیں۔"

"تو پھر یہ فیصلہ کن بات ہے؟"

اندرومی لی او کھڑا ہو گیا اور چپکے سے ابھی ابھی جس سگار کو جلایا تھا اسے بجھا دیا۔ میں اس قدر مضطرب تھا کہ احتجاج کی ہمت نہ ہوئی۔ میرا دل سینے میں پس گیا تھا۔ میں سر کو ہاتھوں پر رکھے بیٹھا ہوا تھا اور مرورِ وقت سے بے نیاز تھا۔

اندرومی لی او انتہائی غور کے ساتھ مجھے تنقیحی نظر سے تک رہا تھا۔ اس نے پیار سے کندھے کو تھپکتے ہوئے اک ایسی آواز میں کہا جو شدتِ جذبات سے پہچانی نہ جاتی تھی۔

"ری کارڈو! ہم نے امکان بھر کوشش کر ڈالی ہے۔"

اور باہر چلا آیا۔

"بیحد تاخیر ہو گئی ہے۔ بیحد۔" میں ان الفاظ کو بار بار یوں دہرا رہا تھا گویا کسی کتاب کا

سبق ہیں جو مجھے یاد کرنا ہے۔ بجذ نا خیر! غالباً اس سے پہلے بھی کسی جہازی نے اس کو تاڑ لیا تھا اور وہ اس بات کے متعلق خاموش رہنے کی قیمت بھی چاہتا ہوگا ورنہ — میں خیال سے ہی پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے محنت کش سے مقابلہ کر کے رَن سر کیا تھا جانے اس معرکے کا ذکر مجھ سے کیوں نہیں کیا ممکن ہے وہ محنت کش اسے بچا لیتا۔ لیکن نہیں۔ وہ وحشی بہت پست واقع ہوا تھا اور معاملہ زیادہ دیر تک درونِ پردہ نہ رہتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ موت معرضِ التوا میں پڑی رہتی — اور بس!

گزشتہ واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ اس رات کوٹھڑی میں وہ کس قدر دیوانہ وار مجھ سے وابستگی کی آرزو کرتا تھا۔ اس نے کس طرح میرے پاؤں پکڑ رکھے تھے اور رحم کی بھیک مانگتا تھا۔ بیچارہ چینا! بے شمار معصوم ان خوابوں کا شکار بنا کر تباہ کر دیئے جاتے ہیں جو انہیں ان لوگوں کے سپرد کر دیتے ہیں جنہیں انہی خوابوں سے جلبِ منفعت کے سوا اور کوئی غرض نہیں ہوتی۔ کروڑوں بے ضرر روحیں مصیبت جھیلتی ہیں، مشقت کرتی ہیں اور درندہ صفت جذبات کی غلامی میں دم دے ڈالتی ہیں۔ وہ انسانوں کی حماقت اور جہالت جس کا آغاز تو محض اک خفیف جذبۂ جابریت کے ماتحت ہوتا ہے مگر جس کا اختتام ذلت کی بدترین گہرائیوں اور مہلک ترین انحطاط کا مرکز ٹھہرتا ہے۔ میک بین نے سچ کہا تھا۔ ہم سب درندے ہیں۔ میں خود درندہ ہوں۔ مگر اب میں کیوں اک ریاکارانہ محبت جتانے والی کسبی کی طرح واویلا کر رہا ہوں، ہذیان بک رہا ہوں؟ میں مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوں گا۔ میں کپتان کی حکم عدولی کر دوں گا۔ میں اس کا ایک ایک گناہ اس کے منہ پر دے ماروں گا۔ لیکن کیا ابن الوقتی اچھی نہ رہے گی کہ جھوٹی تابعداری کا اظہار کر دوں چینے کے کرائے کی ادائیگی کے لیے پیشکش کر دوں۔ اس میں ساری تنخواہ لگا دوں اور ضرورت پڑے تو اپنا سب کچھ بیچ ڈالوں اور اپنی آخری کوڑی تک نذر کر دوں۔ مگر یہ سب کچھ لغو ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے کپتان مجھے تقصیر وار ہی نہیں ٹھہرائے گا بلکہ تقصیر منوائے

گا بھی! چینے کا نام فہرست میں کہیں درج نہیں غریب کی دستاویزات بھی کوئی نہیں وہ دفتری طور پر مرا ہُوا ہے۔ چینا مر گیا ہے یہ خیال مجھ پہ مسلط ہو گیا۔

"وہ مر گیا ہے۔ وہ مر گیا ہے۔" مَیں ان الفاظ کو دہرائے جا رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح دہرائے جا رہا تھا۔ میں نشست پر لباس میں پوری طرح ملبوس، نڈھال ہو کر گر پڑا۔ میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ "وہ مر گیا ہے! وہ مر گیا ہے!" اور وہ مند گئیں!

"وہ مر گیا ہے" دور افتادہ خواب کی سلطنت سے اِک آواز آ آ کر مجھ میں گونج رہی تھی!

مجھے وقت کا کچھ تصوّر نہ تھا۔ ہو سکتا ہے تین بجے ہوں۔ ہو سکتا ہے چار بجے ہوں۔ میرے کمرے میں لمپ ٹمٹما رہا تھا۔ میں اُس خاموشی میں گھُٹ رہا تھا جو آدھی رات کے وقت جہاز پر طاری ہوتی ہے جب وہ عین سمندر میں ہو اور اس کے جوانب و اطراف سے لہروں کے ٹکرانے اور نلوں میں پانی کے دوڑنے کی بھدی آواز کے سوا اور کوئی آواز کانوں میں نہ پہنچتی ہو۔ مجھے خیال سا ہوا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے اور دروازہ ہلکے سے بند ہُوا ہے۔ میں جاگ پڑا۔ معاً اک جھٹکا ہُوا اور دانتوں کا برش گلاس میں بجنے لگا۔ میری آنکھیں پوری طرح کھُل نہ سکیں نیند نے انھیں بُری طرح مقفل کر رکھا تھا۔ "ری کارڈو۔" کوئی آواز تھی کیا؟ میں بیٹھ گیا۔ چینا کمرے کے درمیان کھڑا تھا اور جہاز کے ہلنے سے لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ مسکرایا۔ اگرچہ پیلا پڑا ہُوا تھا مگر مسرور تھا۔ "چینا" میں ہچکیاں لے رہا تھا۔ مَیں نے بازو اس کے گرد حمائل کر دیئے۔ میں بھی مسرور تھا۔ زندگی پھر سے درخشاں اور پُر لطف ہو گئی تھی۔ بعد میں مجھے یاد آیا کہ اُسی نے کہا تھا۔ "ری کارڈو۔" معمولاً وہ مجھے عزت سے بلاتا تھا مگر اب کے اس نے دل کے اندر سے، جذبات کی اتھاہ گہرائیوں سے مجھے پکارا تھا۔

وہ بیٹھ گیا اور میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا۔ "آج میں نے سہ پہر

بچاؤ کشتی میں بسر کی ہے ۔ وہیں میں نے جہاز رانوں کو کہتے ہوئے سنا کہ انتوفا گاسٹا پر پڑاؤ نہیں ہوگا ۔ بس یہیں میرا خاتمہ ہے ۔"

" پیگلا ، چینیا ۔" میں عالمِ یاس میں متامل تھا ۔ مجھ میں نا امیدی کی تاریک لہر اٹھی اور تمام کائنات کو تاریک کر گئی ۔

"اب خاتمہ ہے ، ریکارڈو ۔ مجھے معلوم ہے ، میں چینی ہوں ، موت زندگی کی بدترین شئے نہیں ہوتی ۔ تم جانو ہم سب خوابوں کے بندے ہیں ۔ خواب کے بغیر مر جانا سب سے ہولناک چیز ہے ۔ لیکن میں تو خواب دیکھا کرتا ہوں ، ریکارڈو ۔"

یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرا نام بار بار زبان پر لانا چاہتا ہے ۔ " مجھے ایک بات کا افسوس ہے ۔" اس کے چہرے پر غم کے آثار ہویدا تھے ۔ " میں نہیں چاہتا کہ تم — اور معاف کرنا جلد ہی یہ بات غیر اہم ہو کر رہ جائے گی ۔ میں نہیں چاہتا کہ تم دل میں یہ خیال لاؤ کہ میں نے جھوٹ بھی بولا ہے ۔ میں نے اس آدمی کو انکار کر دیا تھا ، تم جانو تمھارے آنے سے پیشتر اس نے پیش کش کی تھی ۔"

" بس ننھے لیس ! کسے تمھارے بیکسے کا دھیان ہوگا ؟ تمھارے عذر سے بیس گنا زیادہ تو وہ جانکنی کی کوفت ہے جو تم برداشت کر چکے ہو ۔" میرا جی چاہتا تھا کہ اضافہ کر دوں ۔ " میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تم جیتے رہو ! " لیکن میں ان الفاظ کے اضافے کا حوصلہ نہ کر سکا ! یوں کرنا ستم ظریفی کی سفاکی کے مترادف تھا ۔

" ریکارڈو ! میں اپنے آپ کو حوالے کر دینے کو ہوں ۔ میری آرزو تھی ۔" اس کی آواز غوطہ کھا گئی مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور آنسو پی کر کہنے لگا ۔ " میری آرزو تھی کہ تمھیں ایک بار پھر دیکھ لوں ! تم سے کچھ باتیں کر لوں ۔ عزیز دوست ! تمھارا شکریہ اور اندرے دی لی او صاحب کا بھی شکریہ ۔ جو کچھ تم نے میری خاطر کیا ، میں اس کے قابل نہیں تھا ۔ میں اک غریب چینی لڑکا ہوں ۔ کسی کو بھی اعتبار نہ آیا کہ میں ارجنٹائن کا باشندہ ہوں ۔

مجھے خود بھی اعتبار نہ رہا۔ میں چلینی ہوں، چلینی۔ میں ہوں بھی چلینی ریکارڈو! میری ماں بھی چلین کی تھی، ہم مسکراتے ہوئے مرتے ہیں! اور ہم احسان بھولتے نہیں!"

وہ مشرقیوں کے دستور کے مطابق فرش پر بیٹھ گیا اور جس طرح پہلی ملاقات پر میرے ہاتھ کو چوما تھا، اسی طرح پھر اسے بوسہ دیا۔

میں نے اوپر نگاہ کی۔

اس دفعہ وہ نہ رویا نہ چلایا۔

اس کے چلے جانے کا مجھے تبھی احساس ہوا جب جہاز کے ہلنے سے دروازہ زور کے ساتھ بند ہوا۔ روشندان صبح کے نور میں نہا رہا تھا۔ میں نے لیمپ بجھا دیا۔ سمندر سیاہی کی مانند سیاہ تھا آسمان نیلگوں تھا مگر مشرق کی طرف اپنے چینے کی طرح صاف صاف زرد تھا

دوسرے روز میں صبح صبح اٹھ کھڑا ہوا اور دفتر میں غرق ہو گیا۔ میں تندہی سے کام میں مصروف رہا۔ اتوار کا روز تھا، ساڑھے گیارہ میں اپنے کمرے میں آیا۔ منہ ہاتھ دھویا اور دوسرے کپڑے اتار کر وردی پہن لی۔

جلد ہی خدمت گار نے طعام شب کی گھنٹی بجائی۔ کپڑے پہننے کے بعد میں سوچ رہا تھا۔ "عجیب بات۔ ہے نا۔ یہی کھانے کا بلاوا۔ نماز عشائے ربانی کا بلاوا کیوں نہیں۔ کیوں نا یہ طعام شب 'قربانی' ٹھہرے اور میز قربان گاہ اور میں اتوار کے بہترین لباس میں ملبوس رسوم کا ادا کرنے والا پادری۔ اور گردیہ ملعون کمینے اکٹھے ہو جائیں اور اپنے ان گناہوں کی پر فریب معافی کی التجا کریں جنھیں یہ سچے دل سے محسوس تک نہ کرتے ہوں۔ چاہیے تو یہی کہ نماز عشائے ربانی ادا کریں!" اس سے پہلے کبھی بھی نماز عشائے ربانی کی روح نے مجھ میں اس قدر مکمل طور پر حلول نہیں کیا تھا۔

اس خیال سے مجھے روحانی فیضان مل گیا تھا۔ میں پُر سکون تھا۔ مطمئن تھا۔ میں کمرے سے نکلا اور ہال کمرے کی راہ لی۔ صرف اندرومی لی او غیر حاضر تھا کہ وہ دیدبان میں کام کر رہا

تھا۔ میں نے رسماً سر کو جھکایا اور جواب بڑی شائستگی سے دیا گیا۔ کپتان نے خوش خلقی سے سر کو ہلا کر سلام کا جواب دیا۔ اس کا یہ فعل حیرت زا تھا۔ وہ موضوع سے بے نیاز ہو کر ہر طرح کی گفتگو میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ اس لمحے سیاست کو فوقیت نصیب تھی ہسپانوی انقلاب، اشتراکیت اور فاشیت پر بحث جاری تھی اور اس میں دن کی مسافت کی شرطیں اور پہنچنے کے وقت کی پیش گوئیاں مداخلت کا باعث ہوتی تھیں۔ پرسر اور چیف انجینئر بڑی سرگرمی سے مصروفِ دلائل تھے۔ لیکن جس چیز نے میرے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اس کا کوئی ذکر اذکار نہ آیا۔ اک دور کا اشارا تک نہ ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا تین ناقابلِ برداشت، دنوں کی ہولناک شہادت محض اک بُرا سا خواب تھا جسے میری پریشاں خیالی نے جنم دیا تھا۔ سب کچھ فضول تھا۔ بے حقیقت! ہم روزانہ کے معمول کو انجام دے رہے تھے۔

کپتان نے غیر متوقع طور پر قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹر! مریض کا کیا حال ہے؟"

میں نے اپنے آپ سے کہا "سنبھل جاؤ کہ موضوعِ سخن بدل رہا ہے اور اسی سے مجھے دلچسپی ہے۔"

"پہلے سے بہتر ہے جناب، ہے تو سو کھا ہوا مگر اس سے نپٹنا خاصا مشکل کام ہے۔ کہتا تھا کہ مجھے بدلہ لینا ہے اور ڈال پے رے زؤ کے پڑاؤ سے پہلے پہلے ہسپتال سے نکل کر رہوں گا! اس حساب کو چکا کر چین لوں گا۔"

"اسے سنبھالے رکھو ڈاکٹر کہ آپس کی چپقلشیں تکلیف دہ ہوتی ہیں!"

"جی! اب تو ٹھیک ہے سب کچھ! جس نے اس کے چاقو مارا تھا وہی اس کا دوست بن گیا ہے۔ اس سے ملنے آتا ہے۔ اس کے پاس بیٹھتا ہے اور دونوں تاش کھیلتے ہیں معلوم ہوتا ہے اس کے دل میں کوئی اور ہی چیز ہے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے کنکھیوں سے دیکھا۔ اس کا یوں دیکھنا کچھ بھی واضح نہیں کر رہا تھا۔

یہ نمازِ عشائے ربانی کا پھندہ تو نہیں تھا؟

اس دوران میں پرسر اور چیف انجینئر جہاز کی رفتار پر مصروفِ بحث تھے۔

"مگر چیف، کتنے میں کہا تھا آپ نے۔ تو گویا روزانہ مسافت اتنی ہے؟ اگر یہ فرض کر لیں کہ کسی طوفان اور باد سرسر سے دوچار نہ ہوں گے تو بھی دوپہر سے پہلے ڈال پے رے زد پہنچنا ناممکن ہے۔ میرا اندازہ یہی ہے کہ چار بجے پہنچیں گے۔"

"نہیں میک لین صاحب! چار بجے تو آپ رودبار انگلستان میں جانی داکر کی ساتویں بوتل کو سپردِ آب کر رہے ہوں گے!"

"تو یوں کرنے کے لیے آپ کو کوئلے کے علاوہ کچھ اور بھی جلانا ہو گا۔"

"جی، جی۔ جی جناب!"

"آہا! جی! تو اپنی جہنمی بیہودہ گوئی کو ختم کر دیجیے اب!" بوڑھے ملعون نے جواب دیا۔ اس کے لبوں پر خوشگوار مسکراہٹ نمایاں تھی۔

یہ سفرِ آسانی کی سربلندی تھی!

میں نے تصور میں بیجنے کے بتلائے جانکنی و کرب پیکر کے آگے اپنے تائب شرمسار سر کو جھکا دیا۔ پرسر میرے دل کی حیاتِ ربانی کو مشکوک نظر سے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ممکن ہے مجھے وہ مضطرب گھبرایا ہوا اور شاید خوفزدہ سمجھتا ہو۔ میں نے خشوع و خضوع سے دعا مانگی۔ بالآخر مجھے اک مسعود اور اتھاہ روحانی سکون نصیب ہو گیا۔

ہم میز سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جہاز کے بیچ کے حصے میں تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد میں دفتر میں چلا آیا اور ڈال پے رے زد کے پڑاؤ کے متعلقہ کاغذات کی تیاری میں لگ گیا۔

جب میں دفتر سے فراغت پا کر عرشے پر آیا تو سات سے چھ ہو رہے تھے۔ غروبِ آفتاب کا منظر دلکش تھا۔ خوش قسمتی سے ہمارے مخالف ٹھاٹھیں مارتے ہوئے ریلے تھم گئے تھے۔ سمندر کی سطح آئینے کی طرح ہموار تھی۔ رات کے آنے سے سمندر کی لہریں پاس سے

بسرعت گزر رہی تھیں۔ جس سے جہاز کی تیز رفتاری کا اندازہ بآسانی ہو سکتا تھا۔ میں نے عرشے کے اوپر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا رکھی تھی اور افتاں وخیزاں پانیوں اور ہر آن رنگ بدلتے والے سمندر کے متلون گردابوں کے پُرنشاط سحر میں کھویا ہوا تھا۔

میں نے اپنا بازو دیوار پر رکھا ہوا تھا۔ اک اور بازو کی رگڑ ہوئی — وہ تھا اندرومی لی اد کا بازو۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولا اور ہم دونوں سمندر کو تکتے رہے۔ شام کو آخری جانے والے سٹیمر نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے! جس کنارے ہمیں لگنا تھا، اس پر روشنی کے میناروں کے نور مشعلوں کے شعلوں کی طرح برس رہے تھے۔ عین ہمارے سروں کے اوپر بادلوں کے چند ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ معاً ڈوبتے سورج نے انھیں منور کر دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آمد شب سے پہلے ساحل اس منعکس لو میں گم ہو کر اک غیر ارضی زندگی اختیار کرنا چاہتا تھا۔ گداز یت سے بھرپور گلابی رنگ نے اوپر کے حصوں کی سفیدی کو اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ یاقوت کی طرح تاباں لہریں آسمان کی درخشانی کو شرمندہ کر رہی تھیں۔ میں نے اندرومی لی اد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس رات ہم آسمان کو تکے جا رہے تھے۔

اس کے لب ہلے۔ اس کی آواز کچھ کہنے کی کوشش میں گلوگیر تھی "وہ چمنیاں دیکھو!"

میں نے مشین کی طرح کہا مانا۔ اس مافوق فطرت روشنی کے سکون میں دھوئیں کی اک لکیر چمنیوں سے اُٹھ رہی تھی! اوپر ہی اوپر جا رہی تھی۔ نیلاہٹ بھرا دھواں — آسمانی نیلاہٹ — ملکوتی نیلاہٹ!

میں غش کھا کر تختۂ جہاز پہ اوندھے منہ گر پڑا۔

(۱۰)

مجھے سخت بخار ہو گیا جو اپنے ساتھ بحران اور ہیجان کا اک سمندر لے آیا۔ وال پیرے زد پہنچنے سے پہلے کے چار روز کی یاد میرے ذہن سے قطعاً مفقود ہے۔

ایک روز صبح کے وقت مجھے محسوس ہوا کہ ہم بندرگاہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ روشندان

پوری طرح کھلا ہُوا تھا اور اس سے سمندر کی تازہ ہوا آ رہی تھی - اگرچہ مراجعت پر روشندان کھلا ہُوا تھا - مگر کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی تھی - جہاز کے داخل ہونے کے دنت، مجھے اچھلتی ہوئی لہروں کے سفید رنگ جھاگ روشندان سے نظر آ رہے تھے جہاز کو لنگر انداز کرنے کی خاطر لوہے کے رسّوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور عرشے پر پیروں کے پے بہ پے چلنے اور رپٹنے سے اک اودھم سا مچ جاتا ہے - اوپر دہی عالم طاری تھا -

اندر دمی لی اد بیٹھا ہوُا تھا اور اُس کی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں -

" پہلے سے اچھے ہو ناری کارڈو !"

" میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں بھائی !"

اور یہ تھا بھی سچ ، چپ چاپ پڑے رہنے سے میرے اعصاب کو سکون میسّر ہو گیا تھا - کسی کوشش، تگ و دو اور ہمّت کے صرف کے بغیر میری صحت عود کر آئی تھی - میں ٹھیک ٹھاک تھا - مطمئن تھا - تھوڑی بہت لنگڑاہٹ ضرور تھی مگر قدرت نے ماضی کو بھول جانے اور اقدار کو صاف سمجھنے کی قوت سے نواز دیا تھا - اندر دمی لی اد کی آواز نے پچھلے توہمات کی یاد کو تازہ کر دیا - بیتے ہوئے مصائب کا پورا باب نظروں کے سامنے کھلا پڑا تھا - لیکن مجھے خیال سا آیا کہ ان واقعات میں مبالغہ آرائی کو بھی خاصا دخل تھا - میں متعجب ہو کر مسکرا پڑا اندر دمی لی اد نے کہا - " وال پے رے زو آ گیا ہے "

اور ہچکچاتے ہوئے اضافہ کیا " مگر کمزوری سے تم اُٹھ نہ سکو گے "

میں نے اُٹھتے ہوئے احتجاجاً کہا " اجی رہنے بھی دو ! ایک منٹ میں کپڑے پہن کر تھیلے میں چیزیں بھر ڈالوں گا ـــ اور خدا حافظ !"

" تو کیا جا رہے ہو ری کارڈو ! ؟ "

" ہاں ہاں ! اور کروں بھی کیا یہاں ؟ اس سفر نے ثابت کر دیا ہے کہ میں سمندر کے کام کی چیز نہیں ہوں - جہاز کا روزمرّہ اک بحری داستان کو تو زیب دے سکتا

ہے مگر حقیقی زندگی کے بیلے سخت کٹھن معاملہ ہے۔"

"ریکارڈو! تمھارے جانے سے میں کھو جاؤں گا! تمھاری صحبت نے زندگی کو قابلِ برداشت بنا دیا تھا۔ اب اس جہاز پر ہمارے نصیبوں میں دوست کہاں؟"

جب وہ چلا گیا تو میں نے کپڑے پہننے شروع کر دیے۔ اس کے الفاظ سے مجھے قلق تو ہوا مگر جواباً میں کہہ بھی کیا سکتا تھا جو چند چیزیں میرے پاس تھیں وہ تھیلے میں بند کر دیں۔ میں نے درازوں کو بھی دیکھ ڈالا کہ ان میں کوئی شئے دھری نہ رہ جائے۔ جاتے ہوئے میری نظر اک صندوق پر پڑی جو نشست کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ جائزے کے لیے اسے کھولا تو اک پھٹا پرانا کرتا نکلا جو بوسیدگی سے دھجیاں بن گیا تھا اور قطعاً ناقابلِ استعمال تھا۔ پہلے پہل تو سمجھ نہ آئی تھی کہ یہ کس کا کرتا ہے۔ پھر مجھے سوئیٹر کا قصہ یاد آ گیا۔ یہ چینے کی ملکیت تھا۔

میں پیشانی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ پھر اک بھیانک خواب جسے بھولنے کے لیے مضطرب تھا۔ اب اسے کیا کروں؟ روشندان سے باہر پھینک دوں۔ نا۔ سامنے ہی بندرگاہ ہے اسے کمرے میں بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ یوں کرنا خواہ مخواہ کی چہ میگوئیوں کو مدعو کرنا ہے۔ اسے تھیلے میں ہی کیوں نہ ٹھونس لوں؟ نہ، اسے رکھوں ہی کیوں؟

اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس رات چینے کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ وہ نہ ادھر کا تھا نہ ادھر کا! اتنی وسیع کائنات میں اسے ذرا سی جگہ نصیب نہ تھی۔ میرا کمرہ بھی اُسے ٹھہرا نہ سکا! اور میرا دل؟ یہ تو تھا ہی کاؤدی!

میں نے تھیلا بند کیا اور باہر چلا آیا۔ مری رگ و پے میں خون کھول رہا تھا۔ کرب و بلا اور توہم نے شدت کے طیش و غضب کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اپنے آپ پر طیش آ رہا تھا۔ اور اس چیز پہ طیش آ رہا تھا جسے زندگی کہتے ہیں۔

افسروں سے علیک سلیک لیے بغیر میں جہاز کی باہر جانے والی راہ پر پہنچ گیا۔ میں کیسا

قسم کی توجیہہ اور بیان دینے کا آرزومند نہ تھا۔ مگر اس کا کیا کیجئے کہ راہ کے اس سرے پر کپتان موجود تھا اور اندرومی لی او کو حکم صادر کر رہا تھا۔ اس کا مستقل مجرب، موٹا، پینپے سا جسم، سرخ چہرہ، متمردانہ ظاہریت دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مرے دل میں اس سے پہلے اتنی شدت کی نفرت کے شعلے کبھی بلند نہ ہوئے تھے! میں نے کندھے پر تھیلا رکھا اور اس راہ سے نیچے کو جانے لگا۔ مجھے توقع تھی کہ نظریں بچاتے نکل جاؤں گا۔ مگر دو قدم ہی چلا ہوں گا کہ وہ حرامی پیچھے سے غرایا۔

"اب سے ہم جہاز میں ایسے زنگیلوں کو لینے سے رہے!!"

میں سرخ بھبوکا ہوگیا۔ میں نے تھیلے کو زمین پر دے مارا اور مارے غصے کے لال پیلا ہو کر اک آتشیں دیو کی طرح اس پر پل پڑا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس حرامی درندے کے بے ہنگام حجم سے بدلہ لے لوں جو میری نحیف طاقت کے سامنے اک دیو پیکر کی مانند خوفناک نظر آتا تھا۔

دو آہنی بازوؤں نے مجھے پیچھے سے روک لیا۔ اندرومی لی او کے بازوؤں نے جکڑ رکھا تھا۔

"چھوڑ دو مجھے! اسے فنا کر ڈالوں گا میں!" میں غرا رہا تھا۔

"ریکارڈو۔ میرے تو کپتان ہیں وہ! ۔ جاؤ بھی اب۔ جاؤ۔"

"جہنم رسید کرو فرض! ۔ چھوڑ دو مجھے ورنہ ۔"

میں نے اس کے منہ پر مکا جڑ دیا۔ اندرومی لی او نے میرے جبڑے پر ضرب جو لگائی تو میں تھیلے کے اوپر دوہرا تہرا، ڈھیر سا ہو کر لڑھکتا آیا اور زمین پر پہنچ گیا!

کپتان نے اندرومی لی او سے کہا جو اپنی وردی کو درست کر رہا تھا۔ "اچھا بھئی افسر صاحب! بہت شکریہ لیکن وہ یہاں کے قابل نہیں تھا!"

اندرومی لی او نے جواب دیا۔ "کپتان صاحب! آپ غلطی کر رہے ہیں۔" پھر اپنے

کوٹ اور ہیٹ کو اتار کر کپتان کے پیروں پر پٹخ دیا۔ "کپتان صاحب! افسر سوئم کی جگہ کے لیے مجھ سے بڑا بدمعاش ڈھونڈ لیے! میرے لیے اس جہاز کی نوکری کوئی اچھی شئے نہیں تھی!" میرے پیچھے پیچھے قمیص پہنے وہ بھی رواں دواں آ پہنچا! اس کی سیاہ گھنگریالی لٹیں ہوا میں لہرا رہی تھیں!

ایرنا ندوتیلیٹ

خاک باد

آنے والے کے طور اطوار سے خاصا شہد اپن مترشح تھا۔ وہ جس بات کو کہنا چاہتا تھا اور کہہ نہ سکتا تھا اسے کہہ ڈالنے کے لیے آدھ گھنٹے سے سعیٔ لاحاصل میں مصروف تھا۔ گھر کے دروازے کے پاس کی بھاری بھر کم شمتیری پہ بیٹھا ہُوا تھا۔ اس نے میل آلود بھورے نمدے کی سسنتی ٹوپی کو سر سے نہ اتارا تھا۔ باتیں کرنے کے دوران میں اس نے آنکھیں جھکائے رکھیں۔ جواُن اسے خوب جانتا تھا۔ وہ سائمن آرسے والو اور اس کی بیوی لاؤرا کا بیٹا تھا۔ وہ بچپن ہی سے بدنام تھا۔ مگر اب وہ کہتے تھے کہ ان میں سے کسی نے اس بات کا خواب تک بھی نہ دیکھا تھا کہ وہ واقعی وہ کچھ کر گزرے گا جو وہ اپنے والدین کے ہمسایہ دوستوں سے کر رہا تھا۔ جواُن ان باتوں پہ اعتبار نہ کرتا تھا لیکن اب...." آپ کے لیے بہتر یہی رہے گا کہ یہاں سے چلتے بنیں۔" وہ نظروں کو اوپر اٹھائے بغیر بار بار یہی کہے جا رہا تھا۔ جواُن نے جواب میں چُپ سادھ رکھی تھی۔ دن دھیرے دھیرے نکل رہا تھا اور سیاہ رنگ کے بادلوں سے زور کی بارش کے آثار ظاہر تھے۔ فضا میں گھمس چھائی ہوئی تھی۔ جواُن نوآمدکی ٹوپی کے اوپر سے دور کا منظر دیکھ رہا تھا۔ کھیتوں کا منظر۔ سبز، زرد، سنہرے پھر سبز شوخ سبز اور پھر زرد نرم۔ جہاں وہ کھڑا تھا، وہاں سے وادی کا منظر خاصا نظر آتا تھا۔ اناج کے سبز خوشوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے دیکھنے کے لیے یہ جگہ بہت موزوں تھی۔

"کون ہے؟" باورچی خانے سے اس کی بیوی کی بلند اور صاف آواز آئی۔ وہ خاموش

رہا۔ نوآمد سر جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ اپنے ایک گرد آلود بوٹ سے باریک مٹی کے ننھے سے ڈھیر کو کھرچ رہا تھا اور دوسرے بوٹ کے تلے سے اسی مٹی کو دباتا جا رہا تھا۔ "بہتر یہی ہے کہ آپ یہاں سے چلتے بنیں۔" اس نے پھر کہا اور اب کے اس کا چہرہ نمایاں تھا۔ جوآن نے اسے غور سے دیکھا۔ اور دل میں کہا۔ "آنکھوں کے سوا ہو بہو باپ کا چہرہ لیے ہوئے ہے اور آنکھیں ماں کی ہیں جن کا رنگ تمباکو کے پتے کا سا تھا۔"

"کون ہے؟" اس دفعہ اس کی بیوی کی آواز قریب تر آتی ہوئی سنائی دی۔ اب کارمن بچے کو گود میں لیے دروازے پر کھڑی تھی۔ جو سامنے کے چھتے میں کھلتا تھا۔ نوآمد شہتیری سے اُٹھا اور اضطراری طور پر اپنے ہاتھ سے پتلون کے مقام نشست کو ملنے لگ پڑا۔ پھر اس نے تعظیماً ٹوپی اتاری۔ موٹے سیاہ چٹے ہوئے بال یوں اٹھ کھڑے ہوئے گویا قید سے آزاد ہو گئے ہوں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ انھیں مدت دراز سے کنگھی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا "کارمن صاحبہ صبح بخیر۔" اس نے کہا۔ بچہ ماں کی گردن سے کھیل رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ انگلیوں کو اس کی گداز بیت میں داب دے۔ چند ماہ کا بچہ چار خانہ کھیس کے میلے کپڑے میں لپٹا ہوا تھا اور دونوں سے ماں کے دودھ کی بساند آ رہی تھی۔

جوآن نے کچھ نہ کہا۔ نوآمد صریحاً گھبرایا ہوا اور خفیف نظر آتا تھا۔ اس اثنا میں کہیں سے کوئی آواز نہ آئی۔ اک دیہاتی علاقوں کا سکوت طاری تھا۔ وہ سکوت جس میں فطرت کا شور و غل سدا جذب و خوابیدہ ہوتا ہے۔ ساری وادی اداس صبح میں پورے طور پر دھڑک رہی تھی۔ جوآن نے دل میں کہا "سورج نکلنے ہی والا ہے۔"

نوآمد نے کہا۔ "اچھا تو میں چلتا ہوں۔" مردوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ کارمن خاموش تھی۔ اس کی نظریں خاوند پر مرکوز تھیں۔ نووارد نے اپنی ٹوپی پھر سے پہن لی۔ ان کی طرف پیٹھ کی اور ہولے ہولے جنگلے کے دروازے کی طرف چل پڑا جو گھر سے دس پندرہ گز کے فاصلے پر تھا اور اسے بہت احتیاط سے کھولا مگر اس کی احتیاط کے باوجود قبل سے

محروم قلابوں نے عادتاً چیں چیں کر ہی دی۔ قلابے مقامی لوہار کے بنے ہوئے عام قسم کی چیز تھے "بہتر یہی ہے کہ وہ چلتے بنیں۔" کیوں؟ سائمن آرے والو اور اس کی مرحوم بیوی لاؤرا کا بیٹا قریباً آدھ گھنٹہ بھر دلائل کی وضاحت بیان کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی گفتگو بک بک جھک جھک کے مترادف رہی۔ حکام اور ریاست کے معاملے ہمیشہ اک الجھن ہی ہوا کرتے ہیں۔ سائمن آرے والو کا بیٹا حکام کے ساتھ گھی کھچڑی تھا اور ان کے حقیر سے حقیر کام انجام دیتا تھا۔ مگر حق بات تو یہ ہے کہ موجودہ الجھیڑے کے متعلق اس کا اپنا ذہن پراگندہ تھا اور معاملے کو سمجھنے سے قاصر تھا جوآن نے سوچ کر کہا۔" بدمعاش کہتا تھا کہ اگر ہم اس ہفتے کے آخر تک نہ نکلے تو وہ اور بدمعاشوں کی امداد سے ہمیں نکلوا کر رہے گا۔" کارمن نے کہا۔" جان سے مار ڈالیں پہلے۔ زندہ نکلنے سے رہے ہم۔"

"یہی کہا تھا میں نے اس سے۔" جوآن نے کہا۔ اس کا چہرہ تیرہ و تار افسردگی کا مظہر تھا۔ ان میں اور کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ کارمن بچے کو سنبھالے باورچی خانے کو چلی گئی اور جوآن اپنے گھر کے سامنے اک شجر کی طرح تنہا کھڑا رہ گیا۔

قرب و جوار پہ اک عسرت برستی تھی اور اس بات کی کوئی معقول وجہ نظر نہ آتی تھی کہ آخر یہ افسرانِ بالا جوآن کے گھر اور آس پاس کے کھیتوں کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ انھیں اس اقدام سے حاصل بھی کیا تھا؟ لے دے کے تھا بھی کیا؟ اناج کے چند قطعے۔ آلوؤں کے کچھ ٹیلے اور ایک سبزیوں کی کیاری اور ان میں بہنے والی پانی کی نہر جو بفضلِ ایزدی، کارمن کے کہے مطابق، ہر تا دورز کی واقعی عظیم اور نفیس ملکیت سے نکل کر ادھر بہہ نکلتی تھی۔ رہا گھر تو یہ آدھا جھونپڑا تھا اور آدھا گھر۔ جوآن سوچ رہا تھا کہ اگر حکام نے یہ گھر اس سے چھین لیا۔ تو انھیں اس رقم کا بقایا بھی چکانا ہوگا۔ جو اس نے باورچی خانے اور گندگی کا حوض بنانے کی خاطر برسوں ادھر قرض لی تھی۔ لیکن کیا یہ واقعی سچ تھا کہ سائمن آرے والو کے بیٹے کے بقول انھیں یہاں سے اٹھتے ہی بننے گی یہ واقعہ ہے کہ اس نے پچھلے انتخاب کے دوران ووٹ ڈالا تھا۔ تو پھر کیا؟ کون تھا جس نے نہیں ڈالا

تھا دوٹ ۔ کسی نے اِس کی حمایت کی اور کسی نے اُس کی اور سب کوئی اپنے اپنے گھر خوش ۔ اک نہ اک کی شکست لازمی تھی اور اک نہ اک کی جیت ! جوآن کھل کھلا کر ہنس پڑا ۔ یونہی مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا وہ ۔ مگر نہیں ۔ یہ بات نہیں تھی ۔ اسے یاد آیا کہ پچھلے ہفتے جب وہ قصبے میں گیا تھا ۔ تو اک عجیب بات اس کے دیکھنے میں آئی تھی ۔ کچھ سپاہیوں نے بندوقوں کے علاوہ قینچیاں بھی اٹھا رکھی تھیں ۔ بندوق تو خیر مگر یہ قینچیاں کیوں ؟ اس بات نے اسے پریشان کر رکھا تھا ۔ وہ قانون کے ہاتھ میں قینچی دیکھ کر سہم گیا تھا ۔ اس کے علاوہ وہ لوگوں کے برتاؤ میں اک بیگانگی سی محسوس کرتا تھا ۔ ’’ڈان رو مولو لی نارز‘‘ کی دکان میں اس کے ہاتھوں تیل فروخت کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا ۔ کہا اس سے یہی گیا تھا کہ تیل ہے نہیں ۔ مگر تیل موجود تھا ۔ کثیف اور چمکیلا ، سیاہ ڈرم سے کیف میں اور کیف سے کاؤنٹر کے پیچھے رکھی ہوئی بوتل میں ٹپک رہا تھا ۔ جس طرح ڈان رومولو نے اسے دیکھ کر آنکھ بھوں چڑھائی تھی ۔ اس کے پیشِ نظر اس نے چپ میں بہتری سمجھی اور یوں بھی اس نے کسی سے بات چیت کرنے سے احتراز ہی کیا ۔ اگرچہ چوک میں بھیڑ دیڑ کچھ نہیں تھی ۔ پھر بھی چار سپاہی اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے ۔ اس نے چند چیزیں خریدیں ۔۔۔ ایک ہنڈیا ۔ کپڑے دھونے کا ڈنڈا صابن اور چپلوں کا جوڑا ۔ اس کے بعد وہ دواؤں کی دکان میں گیا کہ خوشبودار ویسلین کی شیشی اور روئی کا بنڈل خریدے ۔ بنیاوائڈز نامی مالک دوکان نے خندہ پیشانی سے پیش آتے ہوئے ، رازدارانہ انداز میں اس سے پوچھا ’’کہو بھئی راہ میں کوئی واقعہ تو پیش نہیں آیا ‘‘ جوآن جواب دینے کے لیے لب کھولنے کو تھا کہ بنیاوائڈز نے چپ رہنے کا اشارہ کر دیا ۔ ایک سپاہی اندر آ رہا تھا اور اس کے پیچھے کون تھا ؟ سامن آرے والو کا بیٹا ۔ سپاہی نے تڑاخ سے چوبی کاؤنٹر پہ چابک جڑ دی ۔ بنیاوائڈز کا رنگ اڑ گیا اور اس نے جلدی جلدی جوآن کی خریدی ہوئی چیزوں کو کاغذ میں باندھ دیا ۔ ’’کیا ہو رہا ہے یہاں ؟‘‘ سپاہی نے پوچھا ۔ آرے والو نے جوآن کو پہچان تو لیا مگر اسے دیکھا یوں گویا کبھی پہلے ملا ہی نہیں ۔ سپاہی نے بنیاوائڈز کو جواب دینے کی مہلت نہ دی قینچی کو اپنی

پتلون پر مارتے ہوئے جوآن کی طرف مڑ کر کہنے لگا۔ "تو تم بھی ان لوگوں میں ہو جو مزاحمت کر رہے ہیں؟" اس کا رنگ بھی بیناوانڈرز کی طرح پیلا پڑ گیا ہوگا کہ اسے محسوس ہوا، اس کا دل دھک دھک کرنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سپاہی کے منہ پر اک چپت جڑ دے۔ آخر وہ سپاہی تھا اور اسے کوئی حق نہ پہنچتا تھا کہ وہ اس انداز سے اُس امن پسند شخص سے گفتگو کرے جو کسی کو دق بھی نہ کر رہا ہو اور دواؤں کی دکان میں محض خوشبودار ویسلین کی شیشی اور روئی کا بنڈل خرید رہا ہو۔ آرسے والو بول اٹھا۔ "جی ہاں! ان کا شمار بھی سرخوں میں ہے اور آپ 'ترس' اس پی گارڈ' والی راہ سے ادھر، یہیں نزدیک ہی رہتے ہیں۔" جوآن یوں کھڑا تھا جیسے فرش میں گڑ گیا ہو۔ اس کی نظریں چھوٹے سے چوبی ڈنڈے پر جمی ہوئی تھیں۔ جن کے ایک سرے کے چھید میں چمڑے کے تسمے بندھ رہے تھے۔ گانٹھ دار ڈنڈا اک لمبی انگلی تھی جس کا ہر جوڑ، جوڑوں کے درد کی وجہ سے سوج رہا تھا۔ وہ کرخت، خاکی رنگ کپڑے کی وردی پر قمچی ہلکے ہلکے مارتا چلا جاتا تھا۔ سپاہی پُرمعنی انداز میں غرایا۔ "ہوں م۔ ہوں م۔" 'آرسے والو' نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "مگر اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ ہے یہ خموش طبع۔" قمچی تھم گئی۔ بناوٹی مسکراہٹ سے سپاہی کا چہرہ شکن آلود تھا۔ "تو خیر دیکھا جائے گا۔ مگر ہیں یہ سب اک سؤر کے نیچے اور سنو جی بیناوانڈرز! یہاں کسی قسم کا لُچ پن نہ ہونے پائے اور اوے اد تم سے بھی کہہ رہا ہوں، سنا؟" وہ چلے گئے۔

جوآن کی زبان خشک تھی۔ اس نے کاؤنٹر سے پلندہ اٹھایا اور چپکے سے جیب میں کھسکا دیا ــــ پلندہ جس کی قیمت ۵ء۴۰ سینتادو، ابھی اس کے ذمے تھی ــ اس نے بیناوانڈرز کو خدا حافظ کہا۔ جس کے ہاتھ ابھی تک کانپ رہے تھے اور جس کا رنگ یوں پیلا پڑا ہوا تھا گویا اینٹھن کا دورہ پڑ گیا ہے۔

خطرے نے سامن آرسے والو کے بیٹے کا روپ دھار لیا تھا۔ جوآن کو یاد آ گیا کہ سامن آرسے والو اس کا دوست تھا اور اس کا بیٹا لڑکپن میں حقیقتاً کبھی برا نظر نہ آیا تھا۔ وہ تو یوں

ہی ادھر اُدھر سیاست کے مشغلے پر زبان چلاتا رہتا تھا۔ لیکن اب تک اس نے بتایا کیا ؟ اگر فوج میں بھرتی ہوتا تو معاملہ صاف تھا۔ مگر وہ فوجی وردی بھی تو نہیں پہنے ہوئے تھا جب سے ہنگامہ پروری نے شدت اختیار کی تھی وہ حکام سے کچھ کھچڑی ہوا جا رہا تھا۔ قصبے کے باسیوں کا کہنا ہے کہ یا تو وہ صدر قصبہ کے دفتر میں ہوتا ہے یا سپاہیوں کے ساتھ مونائے د نوش۔ اک مخبر۔ اور مخبر ہی تو وہ تھا۔ اور مخبر بھی ایسا جسے پندرہ پندرہ یا تیس تیس میل کے علاقے کے ہر بسنے والے کے متعلق پوری پوری آگاہی رکھنے کی سبقت حاصل تھی اور ہوتی بھی کیوں نہ ؟ وہ اپنے باپ آرسے والو اور اپنے دادا کی طرح عین اسی علاقے میں تو پیدا ہوا تھا۔ جواُن کی طرح وہ ننگے پاؤں قریبے کے مدرسے میں جایا کرتا تھا اور اسی کی طرح ادھر ادھر علاقے بھر میں گھومتا پھرتا تھا۔ اسے مالکوں، کرایہ داروں، مزارعوں اور مزدوروں کے نام ازبر تھے اور ہوتے بھی کیوں نہ ؟ پھر وہ بڑا ہو گیا اور مدرسے کی ٹوپی اور جوتا پہننے لگا اور قرب و جوار میں آباد ہو گیا۔ بندوق چلنے کی آواز نے پہلے کارمن کو بیدار کیا اور پھر جواَن کو۔ اور بچہ رونے لگ پڑا۔ روشنی بڑھ رہی تھی اور کمرے کی چیزیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ جب وہ اچھل کر بستر سے باہر ہوا تو اس کا ذہن وقت کا اندازہ لگا رہا تھا قریباً پانچ بجے تھے۔ فائر پھر سنائی دیئے اور راب کے قریب تر تھے۔ اس نے عجلت میں پتلون پہنی، پیٹی کا بکسوا باندھا اور دروازے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وقت کے متعلق اس کا اندازہ صحیح تھا۔ کھیتوں پر آسمان سے دودھیا روشنی اتر رہی تھی۔ اس نے اندازہ لگائے بغیر دل میں سوچا "پانچ کا عمل ہے اور دن کے نفیس ہونے کی توقع ہے۔" بنگلے کے دروازے کے قبضوں نے کسی کی آمد آمد کا اعلان کیا۔ دو آدمی درانہ گھس آئے۔ جواَن نے انھیں فوراً پہچان لیا ایک آرسے والو تھا اور دوسرا وہی قمیص والا سپاہی جسے اس نے بنیا وائدز کی دواؤں کی دکان پر دیکھا تھا۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آرسے والو کی تنبیہہ مبنی بر حقیقت تھی؟ بارہ روز ہوئے جب وہ یہاں آیا تھا۔ ہر چیز عین اس کے کہے کے مطابق پیش آ رہی تھی۔

"ایک ہفتہ — ایک ہفتہ کے اندر اندر یہاں سے تتر بتر ہو جاؤ اور یہ تمھارے حق میں بڑا بہتر ہوگا ورنہ ....." اب آرتے والو پھر آدھمکا تھا مگر اس دفعہ قانون بھی ساتھ تھا۔

جب سپاہی جوآن کے قریب آیا تو اس نے ہوا میں ایک دو فائر کر دیئے۔" مزے کے ہیں، ہیں نا! اور اگر تم یہاں سے چلتے نہ بنے تو کل اسی وقت ڈھیروں اور بھی سنو گے — سمجھے؟" اس نے پھر پستول کا گھوڑا چڑھایا اور تفریحاً پتلی پتلی گندم کی بالوں کا نشانہ باندھنے لگا۔ آرتے والو سر جھکائے کھڑا تھا۔ جوآن اور کارمن بھاگم بھاگ جائے دقوعہ پر پہنچ گئے تھے کہ دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔ اس نے اک نظر بھی انھیں نہ دیکھا "تمھیں خاصی تنبیہہ کر دی گئی ہے۔ یہاں سے چلتے بنو اور فوراً چلتے بنو۔" سپاہی نے یہ کہہ کر پستول کو چمڑے کے خانے میں رکھ لیا۔ آرتے والو کا ہاتھ پکڑا اور رخصت ہو گیا۔ اب کہیں جا کر جوآن نے محسوس کیا کہ سپاہی کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔

ہر اک نے اپنا اپنا فرض ادا کر دیا — ادھر قانون اور آرتے والو نے اور ادھر جوآن، کارمن اور دودھ پیتے بچے نے! گھر کو آگ بآسانی لگ گئی۔ سوکھے گھاس، پرانی لکڑی اور قدیم فرنیچر کے دھڑا دھڑ جلنے کی لا ابالیانہ آوازیں تڑاخ تڑاخ آ رہی تھیں دو یا شاید تین گھنٹے مسلسل۔ تازہ شمالی ہوا کے چلنے سے شعلے اور بھی بھڑک اٹھے تھے اور یہ سب کچھ یوں معلوم ہوتا تھا — جیسے قریے کے چوک میں میلے کا منظر ہو — رومی کلیسا کی عظیم موم بتی پیچی والے سپاہی کی زندگی کا سنہری موقع تھا۔ اس کے ساتھ چار سپاہی بطور گواہ اس بات کی گواہی کے لیے آئے تھے کہ آیا جوآن چپ چاپ چلتا بنا ہے یا مزاحمت کا باعث ہوا ہے۔ وہ آرتے والو اور ان چار ساتھیوں سے کہیں بڑھ کر اس آگ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

جب وہ قصبے کو واپس ہوئے تو لی نارز کی دکان پر ٹھہر گئے۔ صدر قریہ وہیں اناج کی بوریوں کے ساتھ آرام سے ٹیک لگائے موجود تھا۔

"کیا بنا؟" — "سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا حضور والا!" آرتے والو نے مختصراً جواب دیا۔

"تو جوان خالی کر گیا مکان ؟" سپاہی نے کہا۔ "نہیں تو عالی جاہ! ہم لوگوں نے تالے ڈالے اور اندر براج گیا۔ اور عالی جاہ! آپ جانیں ہمارے پاس ضائع کرنے کو اتنا وقت نہیں تھا کہ...."

کثیف اور چپکیلا تیل میلے ڈرم سے کیف میں اور کیف سے بوتل میں ٹپ ٹپ کر کے گر رہا تھا۔

رکارڈو گیرالڈیس

عقیدت کی جیت

ضلعے کے سارے مویشی خانوں کو تہذیبِ نو کا بخار چڑھ رہا تھا اور وہ اپنی پہلی قدرتی چراگاہوں والی ہیئت کو کھو رہے تھے۔ جو بے کراں وسعتیں اس وقت تک غیر منقسم پڑی تھیں اب گیارہ زاروں میں ہندسی طور پر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھیں ـــ اور تار کے جنگلے انہیں ٹیڑھے ترچھے قطعوں میں بانٹ رہے تھے۔

اب وہ ایسا میدان نہیں تھیں جس کی ہم آہنگ سرسبزی و شادابی افق تک دوڑتی چلی جاتی تھی۔ ان کی شکل وصورت تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ بدل رہی تھی اور یوں معلوم ہوتی تھیں کہ اُن ٹکڑوں کا سلسلہ ہیں جنھیں آپس میں جوڑ رکھا ہے۔

جب زمین نے دیکھا کہ وہ مفتوح ہے اور اس سے بے اندازہ فائدہ اٹھایا جا رہا ہے تو اس نے ذلت آمیز جدوجہد سے ہاتھ اٹھا لیے اور اپنی بلند کیفیت لامحدودیت سے دست بردار ہو گئی۔

اجنبی قدموں نے تکریم کے بغیر اسے داغدار کر دیا۔ آلاتِ عقوبت نے اسے طویل سیاہ زخموں سے لہولہان کر ڈالا۔ نامعلوم بیجوں نے اس کے زندگی بخش رس سے قوت کو چوس لیا اور لالچی ہاتھوں نے منفعت کی خاطر اس کے خون کی چوری کر لی۔

ایک ہی ٹکڑا رہ گیا تھا جو تبدیلیوں کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔ دان روفی نو کا مویشی خانہ! دان روفی نو نے اس حملہ کو یوں دیکھا جیسے کوئی بیٹا، ماں کی بے حرمتی کو دیکھے اور اس کا دل سینے میں ڈوب جائے۔

اس کی آنکھ میں آنسو ہوتا اور لبوں پر طنز آمیز مسکراہٹ - اپنی ڈاڑھی ہلاتے ہوئے کہتا "یہ تو کسی امریکی کی پتلون بن گئے ہیں۔" اور اس کی محزون آنکھیں دھندلا جاتیں اور مختلف رنگوں کو ایک ہی تحلیل کر دیتیں۔

اس کا مویشی خانہ ہر قسم کی تبدیلی سے ناآشنا رہا - گائیں، گھوڑیاں اور بھیڑیں یکجا ایک ہی کھیت میں چرتی تھیں اور سبھی خدمت گار وہیں کے باشندے تھے اور جس طرح کوئی جھنڈے کو سنبھالے ہو یہ میدان کے اس آخری ٹکڑے کو سنبھالے ہوئے تھے۔

یہاں وہ حقیقتوں کو بھول جاتے تھے اور اسی بات کا خواب دیکھتے تھے کہ اس کی حدود سے پرے بھی سب کچھ اسی طرح قائم دائم ہے جیسے دس سال پہلے تھا۔ جس طرح غداری کا صدمہ فوری ہوتا ہے ان دس سالوں میں تبدیلیاں بھی فوری ہوئی تھیں۔

اگر پرانے معیاروں سے جانچو تو اس میں واقعی وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو مویشی خانے کے مالک میں ہونی چاہئیں وہ دیہات میں پروان چڑھا اور اس کے سارے کاموں کا کاریگر تھا - اس کی روح دیہاتی تھی۔ سرتاسر ہمدردی بڑھاپے کی وجہ سے اس کی عزت کی جاتی تھی اور نیکی کی وجہ سے محبوب خلائق تھا۔

مویشی خانہ پرانے طریقوں پر چل رہا تھا، زراعتی سائنس جس طریقہ کار کی حمایت کرتی تھی اسے اختیار کرنا زیادہ نفع بخش ثابت نہ ہوتا لیکن یہ تو جھنڈے کو گرانے کے مترادف ٹھہرتا۔

سیمنٹ کا چھوٹا سا گھر مویشی خانے کے گھروں کی طرح کا بنا ہوا تھا - اس کے تین کمرے تھے جو یکے بعد دیگرے ایک دوسرے سے ملحق تھے۔ یہاں سے ایک پلاٹیو نظر آتا تھا جس پر گویا بڑی صفائی سے جاروب کشی ہو رہی تھی - یہ گھر صریح غربت کا مذاق اڑا رہا تھا۔

اس روز صبح ہی سے چھوٹے گھر پر ڈراؤنے خواب کی مانند حبس چھائی ہوئی تھی۔

عقیدت کی جیت

چھت کے آتشیں معانقے کے ساتھ ساتھ نیچی دیواریں نہایت تیز جھلسا دینے والی دھوپ کی خیرہ کن سفیدی کا انعکاس کر رہی تھیں۔ پلا بٹو کے پار زمین کی دراڑیں اک ابتری، پراگندگی کا نقشہ لیے ہوئے تھیں۔

چھوٹی سی اولتی کے سایہ تلے ڈان روفی نو چمڑے کا تسمہ گندھ رہا تھا اور پسینے سے تربتر تھا۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے اپنے کام سے تیز نظریں ہٹا کر کھیتوں کو دیکھا جو دھوپ سے جھلس گئے تھے اور گھاس کے نہ ہونے سے چٹیل میدان بن گئے تھے۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئیں اور کھیتوں کی پیلی رنگت کا ارتعاش اس کی نگاہوں کو غبار آلود کر گیا۔

تین مہینوں کی سنگ دل و بے پناہ قحط سالی نے سخت سے سخت جڑوں کو جلا کر راکھ کر ڈالا تھا اور ننگے کھیتوں میں کچھ تھا تو یہی مردار جانوروں کے ڈھانچے جو ادھر ادھر پڑے تھے ۔۔ تباہی کی مسلمہ تصدیق۔

ڈان روفی نو نے تسمہ لٹکا دیا اور قریبی کنوئیں پر پانی پینے کے لیے چلا آیا۔ اس نے ڈول میں اپنے سر کا نیم حصہ ڈبو دیا۔ پھر وہ دھوپ سے بچنے کی خاطر سونے کے کمرے میں آ گیا کہ ایک نظر اپنی ننھی اعجاز کن مریم کو بھی دیکھ لے جو ضلع بھر میں مشہور تھی۔

دہلیز سے ادھر قدم رکھتے ہی وہ اک طرح کی تصوف بھری خاموشی سے دوچار تھی۔

کمرے میں اندھیرا تھا اور تمام خارجی اثرات سے محفوظ تھا۔ دو موم بتیوں نے اسے روشن کر رکھا تھا جو مستغرق مریم کے دائیں بائیں موجود تھیں۔ اس کے لیے یہ کہنا سخت مشکل تھا کہ مریم کا انداز بخشش کا تھا یا خشوع عبادت کا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے چھوٹے چھوٹے سخت ہاتھ ایک پُر تسکین احترام کے خالق تھے اور ہو سکتا ہے کہ کمرے کی ٹھنڈک جو اس کے سائے تلے اونگھ رہی تھی، اس کے اعجاز کا ہی نتیجہ ہو۔

دونا آنس لی نا نے اس کے لیے منکوں کی ایک چھوٹی سی چٹائی بُن رکھی تھی اور اس کے پیچھے بہت سی کیلوں سے یوں ٹھونک رکھا تھا کہ ایک حلقہ سا بن جاتے۔ میگ پائی اور اُلّو

کے انڈوں کی تسبیح بھی لٹک رہی تھی۔

بوڑھا سویں بار جھک کر اُس پانی کے لیے دعا مانگنے والا ہی تھا جس کی انھیں اشد ضرورت تھی کہ اسے اپنی دعاؤں کی بے اثری کا احساس ہو گیا۔

"لکڑی کا یہ بے حس ٹکڑا تو مینڈکوں کی طرف زیادہ متوجہ ہو رہے ہے"

انتقام کی آرزو نے اس کے مقدس ارادے کو ختم کر دیا۔

باہر جو کچھ ہو رہا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ خشک کھیت — جن میں خاک اڑ رہی تھی۔ جانور — جو زمین کو سونگھ رہے تھے اور خاک بھی نہ پاتے تھے ۔ان کے نتھنوں کی سانس سے مٹی کے دو مینار اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

اس بے بس مخلوق کی ساری مصیبتیں اس کے غصے کا باعث بن گئیں اور اک مبہم منصوبہ کو ٹھوس شکل مل گئی۔

جب چاروں کھونٹ کی دھوپ سے ہر ایک عذاب میں مبتلا تھا تو اس ننھے بُت کی طرح اس ٹھنڈے کمرے میں غیر ملتفت ہو جانا اک آسان بات تھی۔" ہماری دعاؤں کو التجاؤں کے ذریعہ نہیں مانا تو قوت سے مان لے۔" اب مناسب یہی ہے کہ جب تک مان نہ لے یہ بھی مصیبت کا مزا چکھتی جائے۔

وقت موزوں تھا۔ لڑکے کھالیں اتارنے گئے ہوتے تھے۔ بڑی بی باورچی خانے میں خارپشت پکا رہی تھی۔ اب وہ اپنی دھمکی کو مداخلت کے بغیر بروئے کار لا سکتا تھا۔

اس نے اک بے ادب ہاتھ بڑھا کر کنواری مریم کو کونے کے تخت سے اتار لیا اور جس طرح وہ چوزے کو اس کی چیں چاں ختم کرنے کے لیے اپنے کرتے میں چھپا لیتا تھا، اسے بھی چھپا لیا اور کمرے میں تالا ڈال کر اس راہ پر ہو لیا جس کی خاک جوتوں میں گھس کر اس کے پاؤں جلائے ڈالتی تھی۔

تیز ہوا کا جھونکا گرے ہوئے پتوں کے مخروطی چکر کو مبتلائے گرداب کر رہا تھا۔ جب وہ آگ

کے لیے چومنے پر جھکتا تھا تو اس کے چہرے کو تپش محسوس ہوتی تھی اسے وہی تپش تیز ہوا کے جھونکے میں موجود ملی تھی۔

وہ اون مونڈنے کے چھپر میں پہنچ گیا جو چوڑی کچی اینٹوں کی عمارت تھی اور چھت گھاس پھوس کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے ایک کونے میں کھرلی تھی اور دیوار میں کڑا تھا اور ان دونوں کو ملا کر اس گھوڑی کا اصطبل سمجھ لو جو اس جگہ کی ساکھ تھی۔ مویشی خانے بھر میں یہی ایک جانور تھا جس کی ہڈیوں پر کچھ گوشت نظر آتا تھا۔

اس نے گھوڑی کی پیٹھ پر میشی کی نرم کاٹھی کو پھینکا۔ باگیں ڈالیں اور کاٹھی کو زیر اندا نسے باندھا اور اس پر بیٹھ کر اس چور کی طرح چل پڑا جیسے جنگل کے انتہائی گنجان حصے کی تلاش ہو۔

وہ سرپٹ مرغزار کی طرف بڑھا جا رہا تھا اور وہ رہا مویشی داغنے کی چراگاہ کا کھمبا اور صرف یہی تھی اک چیز جسے گرمی مرجھا نہ سکی۔

اس تھر کی جو تفصیل اسے نظر آئی، جلتی پر تیل کا کام کرتی گئی کہ پہلے ہی سورج کی تپش سے اس کا خون کھول رہا تھا اور گرمی کپڑوں کے اندر سے اسے پھونک رہی تھی۔

اس نے گھوڑی کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں کہ وہ جھٹکے کے بغیر ٹھہر جانے کی عادی تھی کرتے کے اندر سے مورتی نکال کر اس پر کافرانہ طمانیت کے ساتھ نگاہ کی۔ اس نے گھوڑی کا زیر بند کھول دیا۔ اور اس بلندی پر جو جانوروں کی پہنچ سے باہر تھی پر وہی تھی اس کی طرح ننھی کنواری کو باندھ دیا

جب کام ختم کر چکا تو اپنے کارنامے پر اک نظر دوڑائی کہ کہیں بچ نکلنے کا کوئی امکان تو نہیں۔ جب یقین ہو گیا تو تسلی کا قہقہہ لگایا جس سے چہرے کی شکنیں اور بھی واضح ہو گئیں۔

اس نے گلے میں مسیح کی شبیہہ والا تعویذی فیتہ پہن رکھا تھا۔ اسے چوم کر کہنے لگا "خدا کی قسم جب تک مینہ نہ برساؤ گی اسی کھمبے کے ساتھ جکڑے رہو گی" اور کسی مزید توقف کے

بغیر گھوڑے پر اچھل کر سوار ہو گیا اور گھر کی راہ لی۔

معاً وہ ٹھہر گیا۔ ایک جذبہ اس کے سینے میں ابھر رہا تھا جسے وہ الفاظ میں بیان نہ کر سکتا تھا۔ دُور افق پر۔ کیا تھا وہ؟ ایک سیاہ لکیر آگے کو حرکت کرتی نظر آتی تھی۔

اسے یقین نہ آتا تھا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر دھوکا ہو رہا تھا۔ پھر تو وہ قریباً پہنچ ہی گیا تھا پھر بھی آگے نکل گیا کہ دیکھے بھلا اور لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔

ایک ہی شور تھا جو سننے میں آ رہا تھا۔ "بند کرو دروازے اور کھڑکیاں بند کرو! طوفان آ رہا ہے۔" اور اس کا شک دور ہو گیا۔

اک لمحہ خاموشی رہی۔ پھر طوفان پہلی بار زمین پر ٹوٹ پڑا۔ سڑک پر خاک و خاشاک کا چکر جنباں و لرزاں مینار کی صورت میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ پوپ لر کے پرانے درخت جھکے جا رہے تھے۔ ان کی سربلند چوٹیاں چیخ رہی تھیں اور کے سوارینا کے پیڑ باریک اور تیز سیٹیاں بجا رہے تھے۔

ڈان رَوفی نو مسرور سا ہو کر سوچ میں پڑ گیا۔ اپنے جذبے کے ہاتھوں زمین میں گڑ گیا تھا۔ اس نے اپنے آس پاس دیکھا۔ جو چند جانور اسے نظر آئے، یکساں طور پر، پہلو بہ پہلو آندھی کے رُخ دوڑے جا رہے تھے۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ وہ موٹے ہو گئے ہیں۔ گویا وہ کسی دوسرے عالم میں تھا۔ اسے یہ جان پڑا کہ وہ معجزوں سے مملو ہے اور جب اس نے لمحہ بھر کی کھوئی ہوئی قوت کو پا لیا تو گھوڑے کی گردن پر جھک گیا اور ننھی کنواری کی طرف سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔

وہ رہی وہ! سخت کانٹوں کے ساتھ جکڑی ہوئی۔ ننھی۔ بالکل ویسی کی ویسی۔ تیرگیٔ طوفان میں ذرا کم تاباں۔ ڈان رَوفی نو نے اس کے پیر چوم لیے، محبت اور پیار کے بول نچھاور کر دیئے۔ اسے نرم کاٹھی میں لپیٹ لیا اور خود ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر گھر کو سرپٹ دوڑ پڑا۔

یوں معلوم ہوتا تھا آندھی سارے جہان کو اپنے آگے بھگائے لیے جا رہی ہے۔ اب تیز تو

تھی مگر شدید نہیں تھی۔ بڑے بڑے قطرے گرنا شروع ہو گئے جو مٹی میں گیند کی طرح لڑھکتے تھے۔ بڑے میاں گیلی مٹی کی باس میں لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ جب وہ روکنے والے جنگلے کے قریب پہنچا تو قطروں کا حجم بڑھ گیا تھا۔ زمین پر پڑتے تھے تو بلبلے اُٹھتے تھے۔

وہ اندر داخل ہوا تو شرابور تھا۔

اون مونڈنے کے چھپر میں سبھی مصروف تھے اور ہر اس چیز کو چھت تلے لا رہے تھے جس کی بابت احتمال تھا کہ مینہ سے خراب ہو جائے گی۔

اودن پرندہ پر پھڑپھڑا پھڑپھڑا کر اپنی فتح مندانہ مسرت کا اظہار کر رہا تھا۔ بجلی آسمان کے آر پار لحظہ بلحظہ چمک، کڑک رہی تھی۔

فی لائپ سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ وہ پیاڈ کی لکیر کے ساتھ ساتھ مینہ کے ٹھنڈے ٹھار تلے میں تربتر گھوڑے پر سوار چیختا چلاتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے کاٹھی کے ساتھ ایک کھال باندھ رکھی تھی جس کے سم گھوڑے کے شانوں کے لیے مہمیز کا کام کر رہے تھے۔ گھر کے قریب آجانے پر مشتعل جانور چاروں پیر جوڑ جوڑ کر بار بار اچھلا کودا۔

"ارے کدھر کو؟ کیا کرتے ہو؟ کوئی مصیبت . . . ؟" ڈان روفی لو نے چلا کر کہا۔

"بوڑھا ہو رہا ہوں بابا اور بدھو بھی اور پٹھوں میں اینٹھن بھی ہے۔" وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔

بارش ہوتے ہوتے مدھم پڑ گئی۔ چھتوں سے ننھی ننھی نہریں نہ نکلیں۔ ان سے جو قطرے ٹپک رہے تھے، وہ پہلے قطروں کے نشانوں کو اور گہرا کر رہے تھے۔ چند لمحے پیشتر آندھی نے جن درختوں کو نازیبانے لگائے تھے وہ دھل دھلا کر نکھر گئے تھے اور ان کے سبز پتے چمک رہے تھے۔ پتوں کا رنگ گہرا پڑ گیا تھا۔

خندقوں نے دریاؤں کو چرا لیا تھا اور جوہڑوں نے جھیلوں کو۔ پرندے پروں کے گیند بنے، ساکت و جامد، اپنے پپوٹوں کو نیم بند کیے استادہ تھے۔ ایک ہلکا ترنم، ایک بھرپور طمانیت چھائی

ہوئی تھی اور گو اندر ہی اندر ان میں شدت تھی مگر لوگوں تک کی حرکتوں کو اعتدال پر رکھے ہوئے تھیں۔ لوگ ٹھنڈی ہواؤں سے اپنی جلدوں کو تھپتھپا رہے تھے۔

سارے میدان سے معانقہ گیر تھا ۔ اک نرم ترنم ایک سکوت استغراق۔

اسی روز رات کے نو بجے۔ چھوٹے مویشی خانے بلی بیر ییز محوِ خواب معلوم ہوتی تھی ۔ بوڑھے میاں بیوی کی خواب گاہ میں روشنی نظر آتی تھی - گھر کی ساری موم بتیاں وہیں جمع ہوکر مجسمہ کے لیے نور بکھیر رہی تھیں۔ دان ردنی نو ہاتھ میں تسبیح لیے "مریم! خوش آمدید" گاتا تھا جس کا جواب سب متحدہ آواز میں دیتے تھے۔

باورچی، کارندے سبھی اس اہم وقت میں جمع تھے - ایک گہری یکساں لہجے کی آواز سے وقفے وقفے پر متحدہ آوازیں آملتی تھیں ان سادہ روحوں کے دلوں سے نکلا ہوا تقدس تمام فضا میں طاری تھا۔

کھڑکیوں پر مینہ کے تھپیڑے رک رک کر پڑتے تھے ۔

ننھی کنواری اپنے طاقچے میں موجود تھی اور اس واقعے سے جو اطمینان حاصل ہوا تھا اس سے پھولی نہ سماتی تھی - اس نے اس فتح تو کی خوشبو کو آس پاس کے سارے دلیوں پر پھیلا دیا تھا۔

ایمیلیا پاردو باثان

سسٹر ایپاری سی یول

"س" یں دلی 'کلیر' کی بہنوں کی خانقاہ کی دُہری جالی والی نیچی کھڑکی میں سے مجھے ایک راہبہ نظر آئی جو سربسجود ہو کر مصروفِ دعا تھی۔ وہ بلند قربان گاہ کے سامنے دراز تھی، منہ فرش کی طرف تھا، بازو باہر کو پھیلے ہوئے تھے اور جسم قطعاً ساکت۔ اگر وہ زندہ تھی تو اتنی ہی جس قدر اس ملکہ اور شہزادی کے چت پڑے بت زندہ تھے جن کی بیسل کھڑی کی بنی ہوئی قبریں گرجے کے مشرقی حصے کی زینت آرائی کر رہی تھیں۔ وہ معاً اُٹھ کھڑی ہوئی اور یہ حرکت اس نے یقیناً سانس لینے کے لیے کی تھی۔ اب وہ میری نظروں کے سامنے تھی۔ جس طرح شکستہ دیواریں کبھی کا شاندار محل ہوتی ہیں، صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی صغر سنی میں بہت حسین ہوگی۔ اگر اسے اسّی کا کہیں تو بآسانی نوّے کا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے چہرے کی ——— مُردوں کی سی مُردنی اس کے لرزاں سر چکلے منہ اور سفید ابرو سے عیاں تھا کہ وہ اس عمر کو پہنچ گئی ہے جہاں کوئی مرورِ زمانہ کا خیال تک نہیں لاتا۔

اس کے مردہ چہرے میں جو اس دنیا کا نہیں معلوم ہوتا تھا، اک غیر معمولی چیز تھی ——— آنکھیں۔ وقت کو شکست دیتے ہوئے وہ ابھی تک اپنی آگ، اپنی گہری سیاہی اور اک ہیجان خیز اور ڈرامائی اظہار کو محفوظ کیے ہوئے تھیں۔ ان کی اک نگاہ کو ایک دفعہ دیکھ کر عمر بھر بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ اُس راہبہ کے پاس جو خانقاہ میں داخل ہو کر خدا کے حضور اپنا معدوم دل پیش کر رہی ہو، ایسی جوالا مکھی آنکھوں کا ہونا اک ناقابلِ توجیہہ بات تھی۔ یہ آنکھیں اک طوفان خیز ماضی کا پتہ بتا رہی تھیں۔ اک حزیں یاد پر روشنی ڈال رہی تھیں۔ اگرچہ مجھے امید یہی تھی کہ راہبہ کے راز سے کبھی

آگاہ نہ ہوسکوں گا، مجھے تجسس کھائے جا رہا تھا۔ بہرحال اتفاقات نے میری آرزو کو قطعاً پورا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

اُسی شام سرائے کی کھانے کی گول میز کے گرد بیٹھے ہوئے ایک معمر شریف آدمی سے میری شناسائی ہوگئی جو بہت باتونی اور ہشیار تھا اور ان لوگوں میں سے تھا جنھیں اجنبیوں کو معلومات پہنچانے کا شغف ہو۔ وہ میری دلچسپی سے پھولا نہ سمایا اور اپنی بلا کی یادداشت کے دفتر کھول دیئے۔ میں نے ابھی ولی کلیبر کی خانقاہ کا ذکر اور اس تاثر کا اظہار ہی کیا تھا، جو بوڑھی راہبہ کی آنکھوں نے میرے دل پر چھوڑا تھا کہ وہ پھٹ پڑا۔ "آہ سسٹر ایپاری سی یوں! جی، جی ہاں، واقعی اس کی آنکھوں میں ہے سبھی کچھ نہ کچھ۔ ان میں اس کی سوانح حیات لکھی پڑی ہے۔ یقین جانیئے اس کے آنسوؤں نے اس کے گالوں کی اُن شکنوں کی آبیاری کی ہے جو قریب سے دیکھنے پر نہر معلوم ہوتی ہیں۔ چالیس سال اشک ریز رہی ہیں۔ اس دوران میں ڈھیروں ہی اشک بہ گئے ہوں گے لیکن ان کا پانی اس کی آنکھوں کی چنگاریوں کو مدھم نہ کر سکا۔ بیچاری سسٹر ایپاری سی یوں! چونکہ میرا باپ اسے لڑکپن سے ہی جانتا ہے اور میں جانتا ہوں اس نے اس سے تھوڑا بہت معاشقہ بھی کیا ہوگا۔ سو مجھ سے بہتر بھلا اور کون اس کی زندگی کی کہانی بیان کر سکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ ایک دیوی کی مثل تھی۔

"راہبہ بننے سے پہلے اسے آئے رین کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کے والدین نیک خاندان کے افراد تھے اور گاؤں میں مانی ہوئی حیثیت کے مالک۔ ان کے بہتیرے بچے ہوئے مگر سب مر گئے اور یہی تنہا رہ گئی جس پر ان کی ساری محبت اور نازبرداری مرکوز تھی۔ ۔ تھا وہ قصبہ جہاں پیدا ہوئی تھی اور تقدیر کی رضا یہی تھا کہ یہی قصبہ مشہور شاعر —— کی جنم بھومی بھی ٹھہرے، تقدیر جو ہمارے پنگوڑے کی چادروں سے ہی اس رسّے کو بٹنا شروع کر دیتی ہے جس سے ہمیں پھانسی دینا ہوتی ہے۔"

میری چیخ نکل گئی اور داستان گو کے منہ سے الفاظ نکلے بھی نہ تھے کہ "زندان زدہ فرشتۂ اعظم

سسٹر ایپا پی سی یوں

یے مصنف کا جلیل القدر نام پکار دیا جو شاید رومانی حدث کا صحیح ترین نمائندہ تھا، جس کے نام کے ایک ایک حرف میں تذلیل کن تکبر۔ تحقیر کن تنفر۔ تلخ طعن وطنز۔ اور مایوس کن اور کفر آمیز یادِ وطن کے دھڑکنے کی دھار موجود تھی۔ گو ابھی تک مجھے ان دونوں کے تعلق کا کوئی سلسلہ معلوم نہیں تھا۔ راہبہ کی نظرا ور یہ نام میرے تخیل میں گھل مل گئے تھے اور ان دونوں کے اختلاط سے مجھے پہلے ہی اس ڈرامے کا کیبل سوجھ رہا تھا، جو دل سے تعلق رکھتا ہے اور جس سے دل کا لہو بہا کرتا ہے۔

اطلاع دینے والے نے دہرا کر کہا۔" وہی ہے وہی۔ شہرہ آفاق جوآن ڈی۔ کمارگو ۔۔ گاؤں کو اسس کی ذات پر ناز تھا۔ اس گاؤں میں معدنی چشمے نہیں تھے۔ معجزے کرنے والا پیر نہیں تھا۔ کوئی عظیم گرجا نہیں تھا۔ رومن زمانے کے کتبے نہیں تھے۔ غرض یہاں کوئی ایسی دلچسپی کی چیز نہیں تھی جو باہر سے آنے والوں کو دکھائی جاتی لیکن اس پر بھی گاؤں بہت فخر سے اپنے چوک کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ "یہی ہے وہ گھر جہاں کمارگو پیدا ہوا تھا۔"

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔" آہ، اب سمجھا! سسٹر ایپاری سی یوں یعنی آئنے زین کمارگو سے محبت کرتی تھی، جس نے بے التفاتی کی اور وہ خانقاہ میں داخل ہو گئی کہ بھول جائے ۔۔۔"

راوی نے مسکرا کر کہا۔" ذرا ٹھہریئے صاحب! اگر اس قصے میں لے دے کے یہی کچھ تھا تو یہ روزمرہ کا اک واقعہ ہوا اور بیان کرنے کی زحمت کے لائق کیوں ہونے لگا ۔۔ سسٹر ایپاری سی یوں کے قصے میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ صبر کیجیے تو سب کچھ سن لیجیے گا۔"

آئنے زین نے اپنے بچپن میں کمارگو کو ایک نہیں ہزاروں بار دیکھا تھا، لیکن آپس میں کبھی گفتگو نہیں ہوئی تھی کہ وہ جوان ہو بھی چکا تھا اور یہ ابھی بچی تھی وہ تنہا اور الگ تھلگ رہتا تھا، اس نے گاؤں کے لڑکوں سے بھی کوئی سروکار نہ رکھا تھا۔ جب آئنے زین بہارِ شباب میں قدم رکھ رہی تھی تو تعلیم کمارگو سالامانکا میں قانون پڑھ رہا تھا۔ وہ چھٹیوں کے دوران

اپنے سرپرستوں کو ملنے کے لیے صرف ایک دفعہ گاؤں آتا تھا ۔ گرمیوں کا ذکر ہے کہ وہ آ کو لوٹ رہا تھا۔ اتفاقاً طالبِ علم کی نظریں اٹھیں اور آئے رین کی کھڑکی پر پڑ گئیں ۔ وہاں اس نے لڑکی کو دیکھا جس کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں ۔ وہ نظریں جو آدمی کا دل سینے سے اڑا لے جائیں ! دو سیاہ سورج آپ دیکھ ہی چکے ہیں کہ ابھی تک وہ کس شئے کی مانند ہیں! کمار گو نے کراتے کے گھوڑے کی باگ کھینچ لی کہ اس حیرت زا حسن سے جی بھر کر سیر ہو لے ، لیکن لڑکی کا چہرہ کو کنار پھول کی طرح تمتما اٹھا کھڑکی سے پیچھے ہٹی اور اسے زور سے بند کر دیا ۔ کمار گو نے اپنی نظمیں قلیل المیعاد ادبی رسالوں میں چھپوانا شروع کر دی تھیں ۔ اس رات اس نے اِک حسین نظم کہی جس میں اس نے اُس اثر کو بیان کیا تھا جو گاؤں میں داخل ہونے وقت اس کے دل میں آئے رین کی دید سے پیدا ہوا تھا ۔ جب رات ہو گئی تو اس نے اسی کاغذ کو جس پر یہ نظم لکھی تھی ، ایک پتھر پر لپیٹا اور آئے رین کی کھڑکی پر دے مارا ۔ شیشہ ٹوٹا اور لڑکی نے کاغذ اٹھا لیا ۔ اس نے نظم کو ایک نہیں سینکڑوں نہیں ہزاروں بار پڑھ ڈالا ۔ وہ اسے انتہائی ذوق و شوق سے پڑھتی رہی ۔ اس میں جذب ہو گئی ۔ مزے کی بات ہے کہ یہ نظم جو کمار گو کی تصنیفات کے مجموعے میں شامل نہیں ہے ۔ اعلانِ محبت نہیں تھی بلکہ افسوس اور کوسنوں کا عجیب سا مرکب تھی ۔ شاعر اپنے آپ کو مردود کہہ رہا تھا کہ اس کے نصیبوں میں دریچے والی لڑکی کی پاکدامانی اور خوبصورتی نہیں ہے اگر وہ اس پل کے قریب آ جاتے تو اس کا رس چوسے بغیر نہ چھوڑے ۔ اس نظم کے واقعے کے بعد کمار گو سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہوئی جس سے پتہ چلتا کہ اسے اک ایسا شخص بھی یاد ہے جسے آئے رین کہتے ہیں ۔ وہ اکتوبر میں میڈرڈ روانہ ہو گیا جہاں اس کی زندگی کے پُرجوش حصے کا آغاز ہو گیا تھا جو اس کی ادبی سرگرمیوں اور سیاسی معرکوں پر مشتمل تھا ۔

جس دن سے کمار گو گیا تھا ، آئے رین روز بروز غمگین ہوتی جا رہی تھی ۔ وہ سچ مچ بیمار ہو گئی ۔ اس کے والدین نے اس کی طبیعت کو بحال کرنے کے لیے اپنے مقدور بھر سب کچھ کر

ڈالا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے اسے باداجوزے گئے ۔ اس کے لیے انھوں نے نوجوان لڑکوں کی صحبت اور رقص و سرود کو عام رکھا ۔ اس کے مداح بھی تھے اُن کی تعریفیں بھی تھیں جو اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں ۔ لیکن نہ اس کی طبیعت بحال ہوئی اور نہ صحت بہتر ۔

وہ رات دن کمار گو کے تصور میں غرق رہتی تھی ۔ بائرن نے جولارا کے متعلق کہا تھا وہی کمار گو پر بھی صادق آتا تھا کہ جنھوں نے اسے دیکھا ہے ان کا دیکھنا لاحاصل نہیں ۔ خود آئے رین کو بھی یہی خیال تھا کہ وہ شک میں مبتلا نہیں ہے ۔ اسے یقین تھا کہ اس عجیب عجیب اور اداس داس نظم میں کوئی جادو تھا جس کا وہ نشانہ بن چکی ہے ۔ لاریب کہ وہ اس چیز کی گرفت میں تھی جسے آج کل تسلطِ وہم کہتے ہیں ۔ ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے کمار گو موجود تھا ۔ زرد رُو ۔ کٹھور اور اپنی متفکر پیشانی پر گھنگریالے بالوں کا سایہ لیے ہوئے ۔ جب آئے رین کے والدین نے دیکھا کہ ان کی بیٹی کسی پُراسرار مرض سے گھلی جا رہی ہے تو انھوں نے اسے دارالخلافے میں لے جانے کی ٹھانی جہاں بہترین ڈاکٹروں کے مشوروں کے میسر ہونے کے علاوہ کئی دل بہلاوے بھی ہوں گے ۔

آئے رین کے میڈرڈ پہنچنے تک کمار گو اک مشہور شخصیت بن گیا ہوا تھا ۔ اس کے خود سرانہ نشیں ، ہیجان خیز اور برق آسا شعروں نے نقالوں کا اک مدرسۂ فکر پیدا کر دیا تھا ۔ اس کے معرکے اور کارنامے لوگوں کے موضوعِ سخن تھے ۔ وہ ایسے لوگوں کے گروہوں میں گھرا ہوا تھا ۔ جو شیطان صفت ، بذلہ سنج ، بے پروا اور لاابالی تھے ۔ وہ ہر رات کوئی نہ کوئی خرمستی ایجاد کر لیتے تھے ۔ کبھی شہر کے شرفا کے آرام میں خلل انداز ہوتے تھے اور کبھی شراب و کباب کی بدمستی سے بھرپور مجلسیں بپا کرتے تھے ۔ جن کا ذکر چند اخلاق سوز اور ملحدانہ نظموں میں موجود ہے اور کئی نقاد مصر ہیں کہ یہ نظمیں حقیقتاً کمار گو کا نتیجۂ فکر نہیں ہیں ۔ شرب و سرور کی محفلیں اور اوباشی بھرے جلسے ، فراموشوں کی نشستیں اور باغیانہ سبھائیں باری باری منعقد ہوتی تھیں ۔ کمار گو اپنے جلاوطن ہونے کی راہ کو پہلے ہی ہموار کر رہا تھا ۔ آئے رین کے والدین دیہات کے سادہ دل

لوگ تھے۔ انھیں ان چیزوں کی قطعاً خبر نہ تھی۔ بازار میں شاعر سے ان کی ملاقات ہوئی تو وہ اس سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ملے کہ بالآخر وہ اپنے گاؤں ہی کا تھا۔

کمارگو لڑکی کے حسن کو دیکھ کر پھر بھونچکا سا رہ گیا۔ اس نے غور سے دیکھا کہ اس کی ملاقات سے آئے رین کے خوب صورت اور زرد گالوں پر پھر سے سرخی دوڑ گئی ہے۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتا گیا اور رخصت ہوتے وقت وعدہ کرتا گیا کہ پھر کسی وقت ان کے پاس ملاقات کے لیے آئے گا۔ یہ بچارے گاؤں کے بھولے باشی اس کی توجہ سے بہت خوش تھے۔ حسب وعدہ وہ ان کے یہاں آتا رہا۔ کچھ روز بعد آئیرین کے منہ پر رونق آگئی۔ اس سے والدین بے حد مطمئن ہوئے۔ انھیں خاک بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے نام کے ساتھ کیا کیا فضیحتیں وابستہ ہیں۔ انھیں خیال سا ہوا کہ ممکن ہے یہی ہمارا داماد ٹھہرے۔ انھوں نے اسے آمد و رفت کی کھلی اجازت دے رکھی تھی۔

آپ کے چہرے سے ترشح ہے گویا آپ اپنے خیال میں اختتام کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہی آپ کی بھول ہے۔ آئے رین اس کی اتنی بُری طرح سے گرویدہ ہو گئی تھی جیسے اس نے کوئی جادو کا شربت حُب پی لیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود چھ مہینے سے وہ اس کے یہاں جانے سے انکار کرتی رہی۔ لڑکی کی مقدس مدافعت نے اسے اپنے دوستوں کا نشانۂ تضحیک بنا دیا۔ اس نے ایک ابلیسانہ وسفاکانہ انتقام کی شرط لگالی اور یہ شرط اس نے اپنے غرور کی خاطر لگائی۔ وہ غرور جو بعض رومانوی پہلوؤں کا زہر آلود سرچشمہ ہوتا ہے۔ دیکھنا چاہیں تو آپ بائرن اور کمارگو کا غرور ہی دیکھ لیجیے۔ اس نے دلیل بازی سے کام لیا۔ پھسلایا۔ سرد مہر ہو گیا۔ جذبۂ رقابت بیدار کیا۔ خودکشی کی دھمکی دی۔ الغرض اسے قابو میں لانے کے لیے ہر ایک طرح کا جال بچھایا۔ وہ بے بس ہو گئی۔ آخر اس نے اس سپردگی کا وعدہ کر لیا جو خطرناک تھی۔ جرأت اور شائستگی کے معجزہ کی نوازش! کہ وہ پاک صاف اور بے داغ لوٹ آئی۔ کمارگو کا وہ وہ مذاق اڑا کہ مارے غصے کے آپے سے باہر ہو گیا۔

دوسری ملاقات کے وقت اس کی طاقت نے جواب دے دیا۔ اس کی قوتِ ارادی

جھک گئی ۔ وہ مغلوب ہوگئی اور جب پریشان و لرزاں، آنکھیں بند کیے وہ اپنے ملعون عاشق کے بازوؤں میں پڑی تھی، وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور اس نے پردے کی ڈوریاں کھینچ دیں آئے رین کیا دیکھتی ہے کہ آٹھ دس نوجوان ہوسناک نظروں سے یوں دیکھ رہے ہیں گویا اسے کھا جائیں گے۔ وہ طنز کے طور پر ہنس رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے ۔

وہ لپک کر اٹھی اور سنورے بغیر پریشان بالوں اور عریاں شانوں کے ساتھ سیڑھیوں سے دھم بازار میں آکودی ۔ وہ گھر اس حالت میں پہنچی کہ اس کے پیچھے پیچھے شریر لڑکوں کا گروہ تھا جو اس پر کیچڑ اور پتھر پھینک رہا تھا۔" اسے کیا ہوا اور وہ کہاں رہی ؟" یہ بتانے سے اس نے قطعاً انکار کر دیا ۔ یہ بات میرے باپ نے اس شخص سے سنی تھی جسے وہ اتفاقاً جانتا تھا اور جو اُن میں تھا جن کے ساتھ لُمسارگو نے شرط لگائی تھی ۔ اسے سرسام ہوگیا جس سے اس کی جان کے لالے پڑ گئے ۔ جب تندرست ہوئی تو خانقاہ میں داخل ہوگئی جو اسے خاصی دور تھی ۔ اس کی توبہ و استغفار کے طریقوں سے ننوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے ۔ تحیر کن روزے ۔ روٹی میں راکھ کی ملاوٹ ۔ تین تین دن پانی کی بوند چکھے بغیر چلنا ۔ سردیوں کی راتوں میں ننگے پاؤں اور گھٹنوں کے بل مصروفِ عبادت رہنا ۔ اپنے آپ کو کوڑے مارنا ۔ گردن میں کڑا ۔ کنٹوپ کے نیچے کانٹوں کا حلقہ ۔ کمر کے گرد کیلوں والی پیٹی .....

اس کے رفیق اسے دلی سمجھتے تھے ، جس چیز نے انہیں سب سے زیادہ متاثر کیا تھا وہ اس کا گریۂ مسلسل تھا ۔ ممکن ہے یہ افسانہ سا ہی ہو مگر کہتے ہیں کہ ایک بار اس نے آنسوؤں سے سلفچی بھر دی تھی ۔ ایک دن معاً اس کی آنکھیں خشک ہوگئیں ان میں ایک بھی آنسو نہ رہا لیکن رہیں درخشاں اور ان کی درخشانی آپ دیکھ ہی چکے ہیں ۔ بیس سال سے اوپر گزر چکے ہیں اس واقعہ کو ۔ پارسا لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عفو خداوندی کی نشانی ہے تاہم مسٹر ایپاری سی یوں کو اپنے معاف ہونے کا یقین نہیں ۔ جبھی تو وہ اس بڑھاپے میں بھی روزے رکھتی ہے ، سربسجود رہتی ہے اور اپنے آپ کو کوڑے مارتی ہے ۔

میں نے کہا "اس کی توبہ و استغفار دو کے لیے ہے" اور حیران تھا کہ واقعہ نگار کی فہم و فراست اس بات کو گرفت میں لینے سے قاصر کیوں رہی ہے۔ "کیا تمھیں خیال ہے کہ سسٹر اپیاری سی یوں کمارگو کی نامبارک روح کو بھول گئی ہے؟"

پیوبارو خا

خاکِ زرخیز

قصبے کے مضافات میں شاہراہ کے بائیں طرف ایک پُرانا یک منزلہ مکان واقع تھا، جس کی سیلن زدہ تاریک دیواروں پر بڑے بڑے سیاہ حروف میں مندرجہ ذیل عبارت بڑی شان سے نظر آتی تھی۔

پلے سیڈرو کی شراب کی دکان

جس فنکار نے ان الفاظ کو لکھا تھا وہ ان کے دائروں کے نازک پیچ و خم سے مطمئن نہیں تھا اور گویا سبقت لے جانے کی کوشش میں اس نے فراخ دروازے کی اوپر کی چوکھٹ پر ایک لمبے لمبے اور گنجان پروں والے مرغے کی تصویر بنا دی تھی جس کے دونوں پنجے ایک خون آلودہ دل میں گڑے ہوئے تھے جس میں ایک بے رحم تیر پیوست تھا! یہ تصویری تحریر ایک راز تھا جس کا مطلب معلوم کرنے کے لیے ہم آج تک قاصر رہے ہیں۔

گھر کی چوڑی ڈیوڑھی کے آمنے سامنے کی دیواروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے پیپوں کی قطار لگی ہوئی تھی، جس سے آنے جانے کا راستہ تنگ ہو گیا تھا۔ یہ راستہ دوکان کو جاتا تھا جہاں شراب کے علاوہ۔ چاکلیٹ۔ تمباکو۔ لکھنے پڑھنے کا سامان اور دوسری بے شمار چیزیں بکتی تھیں۔ مکان کے پچھواڑے انگور کی بیلوں کے سایوں تلے کئی میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہاں ہر اتوار کو بعداز دوپہر باخوس دیوتا کے پجاری جمع ہو کر شراب و شغب سے جی بہلاتے تھے اور وینس دیوی کے پرستار عشبہ سے جگر کی آگ بجھاتے تھے۔

ہسپانوی افسانے

شراب کی دکان کی مالکہ جسٹا کی ہمت سے کام کاج خاصہ نفع بخش ہو سکتا تھا مگر اس کا کیا کیجیے کہ اس کا خاوند کاہل، فضول خرچ اور نکما واقع ہوا تھا اور جو خالص و نا خالص شرابیں وہ کاؤنٹر پہ بیچتی تھی ان کا رسیا ہونے کے علاوہ اندلسی نسل کے پالتو سانڈ کی ساری صفتوں سے متصف تھا!

اس کے دوست کہتے۔

"ارے یار پلے سیڈرو! پھر وہی حال کر دیا تم نے بیوی کا! ارے کم بخت یہ کر کیسے ڈالتے ہو تم؟"

"تو بھئی! بھلا میرا اس میں کیا قصور؟ تم جانو بھیا، یہ جو عورتیں ہیں نا، سورنیاں ہوتی ہیں سورنیاں! اور ہماری اپنی بیوی۔ سو تو ذرا پہنچی چاہیے اس تک ابھی میں تیاری ہی کر رہا ہوتا ہوں کہ وہ رہی، امید سے! اچھی زمین، اچھے بیج، اچھا موسم....!"

جب بیوی سنتی تو چلا اٹھتی —

"ارے ناہنجار، سور! کام پر کیوں نہیں جاتا تو؟"

"کام۔ کام برڑ.... کام — ان عورتوں کو تو اور کوئی بات ہی نہیں سوجھتی۔"

جنوری کے مہینے کا ذکر ہے کہ ایک دن پلاسیڈرو نشہ میں دھت، دریا میں گر پڑا۔ دوستوں نے اسے ڈوبتے ڈوبتے بچا لیا، مگر جب گھر پہنچا تو پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اسے بستر پر لٹا دیا گیا کہ غریب کو ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا۔ بیماری کی حالت میں جو بھی "زارت ذی کو" اسے یاد تھے، زور سے گا گا کر پڑھتا رہا! ایک روز صبح کے وقت گاؤں کا ڈھولچی دکان میں آ نکلا۔ اسے پاس بلا کر کہنے لگا۔

"شو بین! ذرا بانسری اور ڈھول تو ادھر لائیو!"

"ابھی لایا"

اسے پلاسیڈرو بھلا لگتا تھا۔ اس لیے ڈھول اور بانسری لا کر کہنے لگا۔

"ہاں بھیا! کونسی چیز پسند کرو گے؟"

خاکِ زرخیز

"آرسس کو"۔

ڈھول والا اس کے نصف تک پہنچا ہو گا کہ پلاسیڈو مڑ کر بولا۔

"بس بھیا بس اب اس کا آخری حصہ کہ ہمارا وقت بھی آخر ہے!"

اور پلاسیڈو نے منہ دیوار کی طرف کر لیا اور دم دے دیا!

دوسرے روز گورکن پاشی نے اپنے دوست کے لیے ایک نفیس آرام دہ اور تین فٹ گہری قبر تیار کی۔ دکاندار جیسٹا اُمید سے تھی اور اپنے سات بچوں اور دکان کی خاطر جدوجہد کیے چلی جا رہی تھی۔ اس کے خاوند کے دوست نصیحتوں سے اس کی امداد کر رہے تھے۔

پاشی ذارا یا پاشی شیطان ان سب سے بڑھ کر وفادار ثابت ہوا۔ پاشی اگر موٹا نہ ہوتا تو خاصہ لمبا تھا۔ اگر پشت پر نگاہ کرو تو چوڑا چکلا تھا اور جو سامنے کی طرف دیکھو تو پھولی ہوئی توند کی وجہ سے گول مٹول نظر آتا تھا۔ اس کے ملائم حجامت شدہ چہرے کا رنگ سرخی مائل بنفشئی تھا اور اس کی چمکیلی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چہرے کے موٹاپے میں ڈوبی سی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ناک یونانیوں کی سی نہیں تھی پر جو یہ اتنی بڑی اور چوڑی اور سرخ نہ ہوتی تو اس کے خوبصورت ہونے میں کلام نہیں تھا گو اس کے منہ میں دانت نہیں تھے مگر اس کے دشمنوں کو بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ اس کے لب بے پناہ مسکراہٹ کے موجب تھے۔ اس کی پلیٹ جتنی بڑی ٹوپی بہترین خوش مذاقی کا مظہر تھی اور کسی حالت میں بھی اس کے سر سے جدا ہونے کی تلخی کو گوارا نہیں کرتی تھی۔

بے فکروں نے اس کی ذات کے متعلق کئی گپیں اڑا رکھی تھیں کوئی کہتا تھا وہ اپنے زمانۂ شباب میں انتہائی دہشت پسند تھا اور جب شمالی ریلوے کی پٹڑی بچھائی جا رہی تھی تو وہ لارانئے ادجا کے مقام پر اک عام قسم کی بندوق کے زور سے راہگیروں کو لوٹا کرتا تھا۔ کسی کا کہنا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے بحری جہاز کے عملے میں شامل ہو کر لوٹ مار کیا کرتا تھا اور یونہی بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے کہ اس نے گورکن کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا اور مردہ

بچوں کی چربی جمع کیا کرتا تھا۔ مگر ہم حقیقت کے احترام کے سلسلے میں نہایت عجلت سے عرض کیے دیتے ہیں کہ یہ سب مفروضے سچائی سے کوسوں دُور تھے۔

جب پاشی امریکہ میں کافی عرصہ ٹھہرنے کے بعد اپنے گاؤں کو لوٹا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کا وہ قطعۂ زمین جو پہاڑی کے دامن میں واقع تھا، اک قبرستان بن گیا ہے ——— گاؤں میں یہی مشہور ہو چکا تھا کہ پاشی مر گیا ہے۔ پاشی نے گاؤں کی منتظمہ سے اپنی زمین کے ٹکڑے کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ منتظمہ نے اسے زمین کی قیمت دینے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ مگر پاشی نے کہا کہ میں اپنی زمین مفت نذر کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ گورکن کا کام میرے سپرد کر دیا جائے اور اک قبرستان کے کونے میں دیوار کے قریب معمولی جھونپڑی کی تعمیر کی اجازت مل جائے جہاں میں اپنی ٹوپی اور پائپ کے ساتھ سکون سے زندگی گزاروں۔

اجازت ملنے پر اس نے جھونپڑی تعمیر کر دی اور اسی میں اُٹھ آیا اور قبرستان کی دیکھ بھال کا کام شروع کر دیا۔ مُردوں کو پاشی سے کوئی شکایت نہ ہو سکتی تھی کہ وہ ان کی قبروں کو خوشبُو دار پھولوں اور بیلوں سے ڈھانپے رکھتا تھا۔

اتنا اچھا کام کرنے کے باوجود گاؤں کے لوگ اسے ٹیڑھی نظر سے دیکھتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ اکثر اوقات عشائے ربانی کی نماز میں شریک ہونے سے گریز کیا کرتا تھا اور جب پادری کی تعریف سنتا تو آنکھ مار کر بسکانی زبان میں کہتا "تمھیں خوب جانتا ہوں اُستاد!" لوگ معاندانہ طور پر اس کے اس فقرے سے یہ سمجھتے تھے کہ وہ اک ایسی افواہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ پادری کسی نزدیک کے گاؤں میں دو تین بچوں کا کنوارا باپ بن چکا ہے اور سچ پوچھیے تو اس افواہ میں کچھ نہ کچھ شائبۂ حقیقت بھی ضرور تھا۔

پاشی نے گاؤں میں اتنی دہشت پھیلا رکھی تھی کہ جب بچے ماؤں کے کہنے میں نہ آتے تو وہ کہتیں "اگر چپکے نہ بیٹھو گے تو پاشی شیطان تمھیں اُٹھا لے جائے گا۔"

پاشی گاؤں کے امیروں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور وہ اساز جو اپنے آپ کو بذلہ سنج

سمجھے ہوئے تھا اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔

پاشی اور نوجوان ڈاکٹر ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ جب مردے کی چیر پھاڑ کرنی ہوتی تھی تو گورکن ڈاکٹر کا ہاتھ بٹاتا تھا اور اگر کبھی کوئی راہگیر اس "تماشے" کو قریب سے دیکھنے کے لیے میز کے پاس آ کر کراہیت یا خوف کے مارے الٹے پاؤں چلا جاتا۔ تو پاشی ڈاکٹر کو آنکھ مار دیتا، گویا کہہ رہا ہو۔ "دیکھا نا ڈر گیا کہ رازِ درونِ پردہ سے آشنا نہیں ہے۔ ہا ہا ہا!"

لوگ پاشی کو برا بھلا کہتے تھے مگر وہ ان کی باتوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ پاشی جبٹا کے مے خانے کی محفل کا کہنا تھا اور یہی بات اسے دل سے پسند تھی۔ اس کے سامعین بھی ملاحظہ کر لیجیے۔ سڑک مرمت کرنے والا۔ ایک آزاد خیال مخبر۔ چھوٹا مجسٹریٹ، جو مجسٹریٹ بننے سے قبل جلیبیں بنایا کرتا تھا۔ ڈان رامون جو کسی زمانے میں سکول ماسٹر تھا اور اب اپنے کھانے اور شراب کی بوتل کے ساتھ ہر شام کو مے خانہ میں پہنچ جاتا تھا۔ ڈھول والا۔ فارم کے دفتر کا ملازم اور بہتیرے دوسرے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاشی کی مزے دار باتوں کی کشش ان سب کو کھینچ لانے کا باعث تھی۔ جب چھلاوے کا ذکر اذکار چل نکلتا تو کہتا۔ "بھلا اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ یہ تو ہے ہی بجلی کا کرشمہ۔" یہ سن کر سامعین ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے گویا پوچھ رہے ہیں "کیوں بھئی اس کی وزنی بات کی اہمیت سمجھ میں آ گئی!"

پاشی جملے گھڑا کرتا تھا اور یہ وہ چیز تھی جو بڑے بڑے آدمیوں کو بھی شاذ شاذ ہی نصیب ہوتی ہے! اور بعض دفعہ ایسے ایسے نظریے پیش کرتا جو لادینوں کو زیادہ زیب دیتے ہیں۔ اس کی ساری فلاسفی کا لب لباب ان الفاظ سے عیاں ہے جو وہ اکثر کہتا تھا۔ "آدمی پودوں کی مانند ہیں۔ چونکہ انھیں پیدا ہونا پڑا ہے اس لیے وہ پیدا ہو گئے ہیں۔ بعض پودوں میں سرخ پھول لگتے ہیں اور بعض میں زرد۔ اسی طرح بعض لوگ اچھے ہیں اور بعض برے! لیکن آدمی پیدا وہی ہوا ہے جو شرابی ہو!"

وہ گھونٹ بھر پانی پیتا اور یوں منہ بناتا گویا کوئی تلخ چیز حلق سے اتری ہے اور اس کی تلخی کو زائل کرنے کے لیے غٹ غٹ کرکے برانڈی کا بڑا سا گلاس پی جانا۔ وہ برانڈی کے بہت بڑے گلاس کے ساتھ ساتھ پانی کے چھوٹے سے گلاس کا آرڈر دیا کرتا تھا۔ مذاقاً!

جواب دینے میں وہ لاجواب تھا ایک روز کوئی زردار کان کن ادھر آنکلا اور شاید اپنے آپ کو یوسف ثانی سمجھتا تھا کہ لگا اپنی فتوحاتِ عشق کی بڑ ہانکنے! "ایک بچہ اولاد ابالی چھوڑ آیا ہوں، ایک زوبی آرتے میں اور ایک گرتی لو میں۔"

پاشی سے رہا نہ گیا سنجیدگی سے کہنے لگا۔" ارے میاں! یقین بھی ہے تمھیں کہ تمھاری بیوی کے بچے، تمھارے ہی تھے کیا؟"

جب پاشی اپنے امریکی قیام کے قصے سناتا تھا تو پائپ کا دھواں اس کی سرخ ناک کو گرما دیتا تھا اور لفظ لفظ پر تحسین کی تالیاں بجتیں اور قہقہے بلند ہوتے تھے! اس کے امریکی قیام والے تجربے بڑے بڑے دل کش تھے۔ وہ وہاں جواری بھی رہا تھا۔ دکاندار بھی، کھیت کا کارندہ اور فوجی بھی اور نہ جانئے اور کیا کیا کچھ!

ایک دفعہ اسے فوجی کی حیثیت میں چند قدیم امریکیوں کو زندہ جلانا پڑ گیا تھا۔ لیکن پاشی نے جو محبتیں کالوں، بھوروں اور زردوں سے کی تھیں جب ان کے افسانے بیان کرتا تو سننے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے تھے۔ مبالغہ آرائی کے خوف کے بغیر اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ عورتوں کے معاملے میں اس کی طبع بڑی رنگین رہی ہے۔

مے خانے کی مالکہ ان عورتوں سے تھی جو کام کاج کے بغیر ایک منٹ بھی آرام سے نہیں بیٹھ سکتیں۔ اپنا آٹھواں بچہ جننے کے دور روز بعد ہی وہ یوں اپنے فرائض انجام دے رہی تھی گویا کچھ ہوا ہی نہیں! مگر اسی رات اسے بخار آ گیا اور بخار بھی ایسا جس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور غریب کو قبر میں پہنچا کر دم لیا۔

چونکہ کافی مقروض تھی اس لیے مے خانہ بیچ دیا گیا اور بیچارے بچے سڑک پر آ رہے!

خاکِ زرخیز

میئر نے کہا "ان بچوں کے لیے تو کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے!"

"لازماً ان بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے" پادری نے بڑے شیریں لہجے میں کہا اور آسمان کو تکنے لگا۔

دوا ساز نے بڑے عزم سے کہا "اب باتوں کو چھوڑیئے اور ان بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیجیے!"

قصبے کے کلرک نے کہا "یعنی..... خیرات!"

اور دن اور ہفتے گزرتے گئے! سب سے بڑی لڑکی ڈاکیے کے گھر کا کام کاج کرنے لگی اور وہاں وہ مطمئن بھی تھی اور نومولود بچی کو لوہار کی بیوی نے، عین اپنی مرضی کے خلاف، چھاتی سے لگا لیا!

اور باقی کے چھ، شوبین، یشتنی، مارتی، جوشے، ماری اور رگا پسر سڑک پر ننگے پاؤں دوڑ دوڑ کر بھیک مانگتے پھرتے تھے!

ایک روز صبح کے وقت گورکن گاؤں میں اپنا چھکڑا لے کر آیا اور ان چھوٹوں ننھے منّوں کو اس میں لاد دیا اور نومولود ننھی کو گودی میں اٹھا لیا اور راہ میں دوا ساز کی دکان سے دودھ پلانے والی بوتل خرید کر سیدھا اپنی جھونپڑی میں سارے ساز سامان کے ساتھ پہنچ گیا۔

میئر نے کہا "دکھاوا!"

دوا ساز بڑبڑایا۔ "احمق!"

پادری اتنی بڑی کلفت و فلاکت کو دیکھ نہ سکا اور آسمان کو تکنے لگا۔

قصبے کے کلرک نے پیش گوئی کی۔ "وہ اکتا کر اک دن ان کا ساتھ چھوڑ کر رہے گا!"

پاشی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ وہ ان کی پرورش میں مصروف ہے! چونکہ کھانے والے بہت ہیں۔ اس لیے اس نے شراب چھوڑ دی ہے اور قبرستان میں بھونڈے طریقے سے سبزیاں بوتا ہے۔ اب گاؤں میں باقاعدہ منڈی کھل گئی ہے اور جس دوست کے کھیت قبرستان

کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوتے ہیں وہ وہاں اپنا مال فروخت کرنے کے لیے لے جایا کرتا ہے۔ پاشی نے اسی دوست کے ساتھ معاملہ طے کر لیا ہے کہ وہ اس کے کرم کلے اور ہاتھی چوک بھی وہیں بیچ آیا کرے ۔

پاشی کے دوست کے کرم کلے جو درحقیقت قبرستان کی پیداوار ہیں۔ گاؤں کی منڈی میں اپنی خوبی اور لذّت کی وجہ سے بہت مشہور رہیں، لیکن خریداروں کو کیا معلوم کہ جن کرم کلوں کو وہ مزے سے لے کر کھاتے ہیں انھیں انہی کے آباؤ اجداد کے گوشت پوست کے رس نے رس بخشا ہے!

پیدرو انتونیو دے الارکون

پیش گوئی

اگرچہ مجھے یاد نہیں رہا کہ وہ کون سا دن تھا مگر تھا وہ ۱۸۱۶ء کے اگست کا ہی کوئی دن جب غرناطہ کے کپتان جرنیل کے دروازے پر ہردیا نامی ستر سالہ جپسی آیا۔ اس کا پیشہ بھیڑیں مونڈنا تھا۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے کالے مریل گدھے پر سوار تھا جس کا سازے دے کر اک رسی تھی جو اس کی گردن میں پڑی ہوئی تھی۔ گدھے سے اترتے ہی کہنے لگا۔

"مجھے کپتان جرنیل سے ملنا ہے "

یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ اس کی اس عبارت سے پہرہ دار کے دل میں مزاحمت کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ اردلی مذاق پر اتر آئے اور اچٹین ششش و پنج میں پڑ گئے اور اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ بہرحال غرناطہ کی قدیم سلطنت کے جرنیل حضور والا شان ڈان یوجی نی او۔ پورلوٹ کے رہی رد، کو اس کی آمد کی اطلاع دے دی گئی اور چونکہ جرنیل بلند مرتبت حلیم الطبع واقع ہوئے تھے اور پہلے ہی سے ہردیا سے واقف تھے جو اپنے کرتبوں، سودا بازیوں اور اپنے ہمسایوں کے مال و متاع کو حریصانہ نظروں سے دیکھنے کے لیے مشہور تھا، اس لیے انھوں نے اسے حضور میں آنے کے احکام صادر کر دیئے۔

وہ دفتر میں داخل ہوتے ہی دوزانو ہو کر بولا "مقدس ترین مریم پر رحمت ہو اور اس دنیائے صغیر کے بادشاہ والاشان کی عمر دراز!"

نواب نے چھوٹ موٹ تنک کر کہا "اس جھک جھک کو چھوڑو اور سیدھے ہو کر جو کہنا ہے کہو!"

ہر دیا کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار نمایاں ہو گئے " تو حضور والا لا بیئے مجھے ایک ہزار دو نیاں عنایت کر دیجئے !"

"کون سی دونیوں کی بات کر رہے ہو؟"

" وہی دونیاں، حضور جن کا کچھ دن ہوئے اعلان کیا گیا تھا کہ اس شخص کو بطور انعام دی جائیں گی جو پاردوں کی بابت کسی قسم کی اطلاع بہم پہنچائے گا۔"

" ہاں ہاں، تو کیا تم کچھ خبر لاتے ہو اس کی ؟"

" نہیں تو حضور"

" تو پھر؟"

" لیکن اب میں اسے جان پہچان گیا ہوں !"

" وہ کس طرح ؟"

" بڑی سیدھی بات ہے حضور! میں نے اس کا پیچھا کیا، اس سے ملاقات کی اور اب اطلاع کے لیے حاضر خدمت ہو کر انعام کا خواستگار ہوں!"

جرنیل کی دلچسپی شک و شبہ سے دست و گریباں تھی، کہنے لگا " لیکن تمھیں یقین بھی ہے کہ تم نے اس سے ملاقات کی تھی ؟"

جپسی کھلکھلا کر ہنس پڑا " صاف دکھائی دے رہا ہے کہ حضور والا دل میں کہہ رہے ہیں " لو اک اور جپسی آگیا ہے مجھے دھوکا دینے کو!" خدا مجھے غارت کرے اگر جھوٹ عرض کروں۔ میں نے کل ہی پاردوں سے ملاقات کی ہے ۔"

" جو کچھ کہہ رہے ہو اس کی اہمیت بھی معلوم ہے تمھیں ؟ کیا تمھیں خبر ہے کہ ہم کئی سالوں سے اس بد طینت خونی ڈاکو کے پکڑنے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جسے نہ کسی نے دیکھا ہے اور نہ کوئی پہچانتا ہے۔ کیا تمھیں خبر ہے کہ کوہستان کے مختلف علاقوں میں وہ ہر روز کئی راہ گیروں کو لوٹتا ہے اور پھر انھیں گولی کا نشانہ بنا ڈالتا ہے کہ اس کا قول ہے: موت کی زبان گنگ ہے۔

پیش گوئی

انہی طریقوں سے وہ اب تک کیفر کردار کو نہیں پہنچ سکا اور سب سے بڑی بات، کیا تمھیں خبر ہے کہ پاروں سے ملنا موت سے ملنا ہے۔"

جلیسی پھر ہنس پڑا۔ کہنے لگا: "کیا حضور کو خبر ہے کہ جو کام جلیسی سے نہ ہوا وہ اس دنیا جہان میں کسی سے بھی نہ ہو گا۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ہم سچے طور پر کب روتے ہیں اور کب ہنستے ہیں؟ کیا حضور کے علم میں کوئی ایسی لومڑی ہے جو ہم سی مکار ہو۔ سو حضرت عالی میں پھر عرض کیے دیتا ہوں کہ یہی نہیں کہ میں اسے ملا ہوں بلکہ اس سے گفتگو بھی کی ہے!"

"کس جگہ؟"

"طوزار کو جانے والی سڑک پر۔"

"کوئی ثبوت؟"

"میں عرض کرتا ہوں، حضور عالی! اس بات کو کل سویرے ایک ہفتہ گزر سے گا کہ میں اور میرا گدھا چند لٹیروں کے ہاتھوں میں پھنس گئے۔ انھوں نے مجھے کس کر باندھ دیا اور حیران پریشان کر دینے والی غاروں اور کھوؤں سے گزرتے گزارتے اک میدان میں لے آئے جہاں انھوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ مجھے اک خوفناک شبہ ہوا۔ یہ کہیں پاروں کے آدمی تو نہیں ہیں۔ اگر واقعی اسی کے آدمی ہیں تو پھر زندہ بچ نکلنے کی کوئی امید نہیں کہ اس ملعون کا قول ہے: جن آنکھوں نے میرا منہ دیکھا وہ کسی اور کا چہرہ دیکھ چکیں۔

"میں اپنی سوچ میں غرق تھا کہ ایک آدمی میری طرف بڑھا۔ اس نے عجیب و غریب مگر شان دار کپڑے پہن رکھے تھے۔ میرے کندھے کو تھپک کر کہنے لگا۔" دوست! میں پاروں ہوں۔"

"اس بات کو سننا اور دھم سے زمین پر آ رہنا ایک ہی چیز تھی۔ لٹیرے نے بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔

"میں کانپتے کانپتے اُٹھا اور دو زانو ہو کر جس رنگ کی بھی آواز حلق سے نکل سکتی تھی، نکال کر کہنے لگا۔

"حضور کی روح پر رحمت ہو اے لوگوں کے بادشاہ! کون ہے جو حضور کو اس شاہانہ ہیئت سے پہچان نہیں سکتا جو خدا نے آپ کو بخش رکھی ہے۔ خدا کرے ماں حضور جیسے اور سپوت جنیں! اجازت دیجیے میرے بیٹے! کہ میں آپ کو چوم لوں۔ خدا اس غریب جپسی کا بیڑا غرق کر دے اگر اس کی آرزو نہ رہی ہو کہ آپ کے درشن کرے۔ آپ کو قسمت کا حال بتائے اور آپ کے شاہانہ ہاتھوں کو بوسہ دے! آپ مجھے ہمیشہ اپنی خدمت میں کمربستہ پائیں گے۔ کیا آپ معلوم کرنا پسند کریں گے کہ مردہ گدھوں کو کس طرح جیتے جاگتے گدھوں کے بدلے فروخت کر دیا جاتا ہے اور کس طرح بوڑھے گھوڑوں کو جوان گھوڑوں کی قیمت پر بیچا جاتا ہے اور خچروں کو کس طرح فرانسیسی پڑھائی جاتی ہے؟"

نواب مان ٹی جو ہنسے بغیر رہ نہ سکا۔ پوچھنے لگا "تو یاروں نے ان ساری باتوں کا کیا جواب دیا۔ کیا کیا اس نے بھلا؟"

"جو حضور کر رہے ہیں، وہی اس نے بھی کیا۔ خوب دل کھول کر ہنسا۔"

"اور تم نے کیا کیا؟"

"اور حضور میں اتنا ہنسا اتنا ہنسا کہ نارنجی جتنے بڑے بڑے آنسو آنکھوں سے بہنے لگے۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر اس نے تھوڑی دیر بعد میری طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔"

"جتنے آدمی اب تک میری طاقت کے آگے سرنگوں ہوئے ہیں دوست! صرف ایک تم ہو جو ان سب سے ہشیار نکلے ہو! ابھی اپنے بھونڈے مذاق کو چیخ و پکار اور واویلا اور اسی طرح کے خرافات کی صورت میں ظاہر کرتے رہے اور اس سے میں اور بھی چڑ جاتا رہا! صرف ایک تم ہی ہو جس نے مجھے ہنسنے کا موقع دیا اور اگر یہ آنسو نہ بہتے تو۔۔۔"

"تو گویا یہ خوشی کے آنسو تھے میرے اچھے حضور؟"

"یقیناً! اور ابلیس ہی جانتا ہے کہ چھ سات سالوں میں آج پہلی بار ہنسنا نصیب ہوا ہے"

مجھے لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ میں رو یا بھی تو نہیں - اچھا تو اب کام شروع کریں ادرسے لڑکو!"
پارون کا اتنا کہنا تھا کہ میں آنکھ جھپکنے سے پیشتر بندوقوں کی باڑ میں گھر گیا۔ میں الحاح وزاری سے کہنے لگا۔ "حضور! رحم کیجیے مجھ پر رحم!"
پارون نے چلا کر کہا ۔" رک جاؤ ذرا - ابھی نہیں! میں نے تمھیں اس لیے بلایا ہے کہ معلوم کروں کہ اس سے کیا کیا وصول کیا ہے تم نے؟"
"محض کھال میں منڈھا ہوا اک گدھا حضور!"
"کوئی روپیہ، پیسہ؟"
"تین ڈورو اور ستر دو بیاں عالی جاہ!"
"تخلیہ"! — اور وہ سب چلے گئے۔
لیٹرے نے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "اچھا تو مجھے قسمت کا حال بتاؤ۔" ہاتھ پکڑ کر میں لمحہ بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بدیہی امر تھا کہ مجھے بات کھل کر کہنے کا موقع مل گیا ہے۔ اس لیے میں نے پورے دلی وثوق سے کہا۔
"پارون آپ مجھے زندہ چھوڑ دیں یا مار ڈالیں مگر یہ کہے بغیر رہ نہیں سکتا کہ زود یا بدیر آپ کی موت پھانسی کے تختے پر واقع ہو گی۔"
اس نے کمال سکون سے جواب دیا۔" یہ مجھے پہلے ہی معلوم ہے۔ اچھا بتاؤ کب؟"
میں نے دل میں سوچنا شروع کر دیا۔" آج یہ مجھے آزاد کر دے گا۔ کل میں غرناطہ پہنچ کر اطلاع دے دوں گا۔ تیسرے روز اسے گرفتار کر لیں گے اور مقدمہ شروع ہو جائے گا۔" پھر میں نے بلند آواز میں کہا۔ "آپ پوچھتے ہیں کہ کب؟ تو گرہ میں باندھ لیجیے حضور کہ اگلے ہی ہفتے میں!" ادھر پارون لرز گیا اور ادھر میں خوف کے مارے لرز اٹھا کہ قسمت کے حال بتانے کا شوق میری جان لے کے رہے گا۔ پارون نے غور وفکر کے ساتھ بولتے ہوئے جواب دیا۔
"سنو جپسی! تم میری قوتِ گرفت

میں رہوگے ۔ اگر انھوں نے اگلے مہینے کے آخر تک مجھے پھانسی نہ دی، تو میں تمھیں پھانسی دے ڈالوں گا ۔ جس قدر یہ امر یقینی ہے کہ انھوں نے میرے باپ کو پھانسی دے دی تھی، اس بات کو بھی اتنا ہی یقینی سمجھو!! اگر اس وقت تک میرا خاتمہ ہوگیا تو تم آزاد ہو جاؤ گے!"

میں نے جی میں کہا "بڑی عنایت ہے اس کی کہ مجھے موت کے بعد معاف کر رہا ہے ۔ مجھے اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ اس مدت کو اتنا قلیل کیوں رکھا بہر حال ہم کچھ عرصہ مذکورہ بالا کیمپ میں ٹھہرے رہے ۔ بعدہٗ مجھے ایک کھوہ میں مقفل کر دیا گیا اور پاروں گھوڑے پر سوار ہو کر گھنی جھاڑیوں میں سے اپنی راہ پر ہولیا ۔

نواب کہنے لگا "اچھا، میں سمجھ گیا ۔ پاروں مر گیا ہے اور تم آزاد ہو اور اس لیے تم اس کے ٹھور ٹھکانے سے واقف ہو ۔"

"معاملہ تو اس کے برعکس ہے حضور عالی! پاروں زندہ ہے اور یہیں سے میری کہانی کے نہایت تاریک پہلو کا آغاز ہوتا ہے ۔ ایک ہفتہ گزر گیا مگر کپتان نے ادھر کا رخ نہ کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے وہ آس پاس کہیں بھی دیکھنے میں نہ آیا تھا ۔ خصوصاً اس شام سے قطعاً غائب تھا جب میں نے اسے قسمت کا حال بتایا تھا ۔ لیکن میرے محافظوں کا کہنا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے ۔ تم جانو، وہ اکثر اوقات جانے کہاں جہنم رسید ہو جاتا ہے اور جب وہ موقع محل مناسب سمجھتا ہے تو آموجود ہوتا ہے! سچ بات تو یہ ہے کہ وہ جو اتنی اتنی دیر غائب رہتا ہے تو ہمیں اس کے متعلق خاک بھی پتا نہیں ہوتا ۔ کچھ منت سماجت سے اور کچھ سارے کے سارے گروہ کی قسمت کا حال بتانے سے اور کچھ یہ پیش گوئی کرنے سے کہ سبھی پھانسی کے پاس بھی نہ پھٹکیں گے اور سبھوں کا بڑھاپا سکھ چین سے گزرے گا ۔ میں انھیں کم از کم اتنا رضامند کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ مجھے شام کو کھوہ سے باہر نکال لیا کریں اور درخت سے باندھ دیا کریں کیونکہ میں کھوہ کی حبس اور گرمی سے مرا جاتا تھا ۔ یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ وہ محافظ ہر وقت میرے پہلو میں موجود رہتے تھے ۔

پیش گوئی

ایک دن شام کے چھ بج رہے ہوں گے کہ وہ ڈاکو جو یاروں کے لفٹنٹ کے حکم کے ماتحت "ڈیوٹی" پر تھے، کیمپ میں آئے اور ساتھ میں کوئی چالیس پچاس سال کے لگ بھگ کی عمر کا خستہ حال، فصل کاٹنے والا مرد بھی لیتے آئے۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور رہ رہ کر یوں رونا چلاتا تھا کہ کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ کہتا جاتا تھا۔ "خدا کے لیے میرے بیس ڈورو مجھے واپس کر دو! کاش تمھیں معلوم ہو جائے کہ میں نے کس محنت سے انھیں حاصل کیا ہے! گرمیوں کے سارے موسم میں کڑکتی دھوپ کو خاطر میں نہ لایا اور برابر فصل کاٹتا رہا۔ جب کہیں ان کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ گرمیوں کے سارے موسم میں اک روز کے لیے بھی بیوی بچوں کی شکل نہ دیکھی اور برابر کام میں جٹا رہا۔ سخت محنت کے ساتھ فاقہ کشی کر کر کے پائی پائی جوڑی اور پائی پائی جوڑ کر بیس ڈورو پلے باندھے! اور یہ سب کچھ صرف اس لیے کہ سردیوں میں موت ہم سے دور رہے اور میں ان کو جا سینے لگاؤں اور ان کے وہ قرضے صاف کر دوں جو انھوں نے موت سے بچنے کے لیے ادھر ادھر سے مانگ رکھے تھے! اب خدا کے لیے کوئی اللہ کا بندہ کہہ دے کہ کہاں تک جائز ہوگا اگر میں یہ بیس ڈورو کھو دوں۔ یہ بیس ڈورو جو مرے پسینے خون کے خزانے کے برابر ہیں! مجھ پر ترس کھاؤ صاحبو اور سب سے پاک مریم کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے میرے بیس ڈورو واپس دے دو!"

لٹیرے اس کی آہ و زاری کے جواب میں ہنس ہنس کر اس کا مذاق اڑا رہے تھے! میں درخت سے بندھا ہوا دہشت سے کانپ کانپ جاتا تھا کہ آخر جیسیوں کے بھی بال بچے ہوتے ہیں۔

ایک لٹیرا اس کی طرف بڑھا اور کہنے لگا "اے احمق نہ بنو! تمھیں تو اس وقت زر و دولت سے کہیں زیادہ اہم چیز کی بابت سوچنا چاہیے تھا!"

"وہ چیز؟ کونسی ہے وہ چیز؟" فصل کاٹنے والے کے نزدیک سب سے بڑی بدقسمتی یہی تھی کہ بال بچے بھوکوں مریں۔

"تم اس وقت یاروں کے ہاتھوں میں پھنسے ہوئے ہو؟"

" پاروَں - کون پاروَں ؟ میں تو اسے نہیں جانتا اور نہ ہی کبھی اس کی بابت سنا کچھ! میں آلی کانتے کا رہنے والا ہوں اور سے وِتّے میں محنت مزدوری کرتا ہوں!"

" لیکن دوست! پاروں کا مطلب ہے موت! جو بھی ہمارے جال میں پھنس جائے ، مرے بغیر چھٹکارا نہیں پا سکتا! اس لیے پہلے دو منٹوں میں وصیت کی سوچ لو اور دوسرے دو منٹوں میں خدا کے یہاں پہنچنے کا دھیان کر لو! ہو جاؤ تیار! ابھی چار منٹ باقی ہیں اور پھر موت!"

" میں ان کا پورا پورا فائدہ اُٹھاؤں گا۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو اور میری سن لو!"

" بولو!"

" میرے چھ بچے ہیں اور ایک قسمت کی ماری بیوہ - بیوہ ہی کہوں گا کہ ابھی مجھے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا، تمھاری آنکھوں میں صاف لکھا نظر آرہا ہے کہ وحشی درندوں سے بھی بدتر ہو- ہاں ہاں بدتر ہو کہ ایک ہی نسل کے درندے کو موت کے گھاٹ نہیں اتارتے! لیکن خدا کے لیے مجھے معاف کر دو کہ مجھے ہوش نہیں کہ میں کیا بک رہا ہوں۔ صاحبو! آخر تم میں کوئی نہ کوئی تو باپ ہو گا۔ کیا تم میں کوئی ایسا نہیں جو باپ ہو ؟ کیا تم کو معلوم ہے کہ ساری سردیاں بھوکوں مرنا کیا ہوا کرتا ہے ؟ کیا تمھیں معلوم ہے کہ کیا حال ہوتا ہے اس ماں کا جو اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا دیکھتی ہے - وہ جگر کے ٹکڑے جو چلا چلا کر کہہ رہے ہوں ۔ "ماں ہم بھوک سے مرے جا رہے ہیں۔ ماں ہم سردی سے مرے جا رہے ہیں۔" صاحبو! میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہنا چاہتا - ان کے بغیر زندگی ہو گی بھی کیا۔ محنتوں اور رفاقتوں کی زنجیر! اگر مجھے جینا ہے تو محض اپنے بچوں کی خاطر جینا ہے! ہائے میرے بچے۔ ہائے مرے جگر کے ٹکڑے!"

وہ زمین پر لوٹ پوٹ گیا - اور لوٹتے لوٹتے چہرہ جو چوروں کی طرف کیا تو ہائے وہ چہرہ! وہ چہرہ اس ولی کا چہرہ تھا جسے پادریوں کے قول کے مطابق نیرو نے شیروں کے آگے ڈال دیا

تھا! کوئی شے ان کے سینوں میں ابھر رہی تھی۔ سب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور یہ دیکھتے ہوئے کہ سب متفق ہیں۔ ایک نے جرأت سے کام لے کر کہہ دیا ۔"

نواب کہانی سے بے حد متاثر ہو رہا تھا۔ بے ساختہ کہہ اٹھا۔" کیا کہہ دیا اس نے ۔"

اس نے کہا۔" بھائیو! جو کچھ ہم نے کرنے کی ٹھانی ہے ۔ اس کی بھنک تک یاروں کے کانوں میں نہ پہنچنے پائے!"

سب بولے ۔" ہرگز نہ پہنچے گی!"

ایک نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔" بھلے میاں! اب تم اپنے گھر کی راہ لو!"

ادھر میں نے بھی اسے اشاروں اشاروں میں سمجھا دیا کہ فوراً سے پیشتر دفع ہو جائے!

سبھوں نے کہا۔" تیز قدم!" — اور انھوں نے اس کی طرف پیٹھ کر لی!

فصل کاٹنے والا اپنے ہاتھ کو لجاجت کے ساتھ پھیلائے ہوئے تھا!

" ارے اب بھی تسلی نہیں ہوئی تمھاری!" ایک نے غرّا کر کہا۔" اپنی رقم بھی مانگتے ہو کیا؟ جاؤ بھئی جاؤ، ہمارے صبر کا امتحان نہ لو!"

وہ روتے ہوئے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد نظروں سے اوجھل ہو گیا ۔

ڈاکوؤں نے اس معاملے کو راز میں رکھنے کے لیے ایک دوسرے کے سامنے قسمیں کھانی شروع کر دیں اور قسمیں کھانے کھلانے میں شاید آدھ گھنٹہ ہی گزرا ہو گا کہ کیا دیکھتے ہیں کہ سان نہ گماں، یاروں آ رہا ہے اور اس کی گھوڑی کے پہلو بہ پہلو فصل کاٹنے والا بھی موجود ہے!

چوروں کی سٹی گم ہو گئی اور گھبرا کر پیچھے کو ہٹے! یاروں بڑے اطمینان کے ساتھ گھوڑی سے اترا۔ دونالی بندوق کو کندھے سے اتارا اور ساتھیوں کا نشانہ باندھتے ہوئے بولا۔" احمقو! ہونقو! مجھے تعجب ہے کہ تم میں سے ہر ایک کو میں گولی کا نشانہ کیوں نہیں بنا رہا! چلو جلدی کرو

اور اس آدمی سے جو بیس ڈورو لیے تھے اسے فوراً لوٹا دو!" چوروں نے اس رقم کو فصل کاٹنے والے کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ فوراً پاروں کے قدموں پر گر گیا کہ اس کا دل کس قدر رحم سے بھرا ہوا تھا۔ پاروں نے اس سے کہا۔

" جاؤ میاں! خدا کی رحمت تمھارے ساتھ ہو! تمھارے سمجھانے کے بغیر میں بھلا کب ان تک پہنچ سکتا تھا۔ اب دیکھ لیا نا تم نے کہ تم نہ ذلیل نہ وجیہ مجھ پر اعتبار کرتے ہوئے ڈرتے تھے! میں نے اپنے وعدہ کو نبھا دیا اور تم نے اپنی رقم وصول کر لی قصہ ہوا پاک۔ اب یہاں سے چلتے بنو!"

فصل کاٹنے والا بار بار پاروں کے پاؤں چومتا تھا وہ خوشی خوشی اپنی راہ پر ہو لیا۔ ابھی بمشکل پچاس قدم ہی گیا ہوگا کہ اس کے مربی نے پیچھے سے آواز دی۔ غریب فوراً ہی الٹے پاؤں بھاگا آیا!" کیا حکم ہے آپ کا؟" اور اس کی خدمت بجالانے کے لیے بیتاب تھا جس نے اس کے خاندان کو خوشیوں سے بھر دیا تھا۔

" تم پاروں کو جانتے ہو؟" اس نے خود ہی پوچھا۔

" نہیں تو۔"

وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔ پاروں نے اپنی دونالی بندوق اس کے کلوں پہ رکھ کر داغ دی! وہ گر پڑا۔ خاک و خون میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا!

" تم پر لعنت ہو خدا کی!۔" صرف یہی تھے وہ الفاظ جو وہ کہہ سکا۔

مارے دہشت کے مجھے کچھ سجائی نہ دے رہا تھا! مجھے یوں محسوس ہوا کہ جس درخت کے ساتھ بندھا ہوں وہ ہلکے سے ہلا ہے اور میرے بندھن ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ ایک گولی فصل کاٹنے والے کو زخمی کر کے سیدھی اس رسی کے آ لگی جس سے میں بندھا ہوا تھا اور اس کو کاٹ کے رکھ دیا۔ میں نے اس آزادی کو چھپائے رکھا اور بھاگ نکلنے کے موقع کے انتظار میں رہا۔ اس اثنا میں پاروں فصل کاٹنے والے کی طرف اشارہ کر کے اپنے آدمیوں سے مخاطب ہوا۔

"اب تم اسے لوٹ سکتے ہو! حماقت کے پشتارو، بیوقوفی کے پلندو! وہ شاہراہ پر چیختا چلاتا چلا

جا رہا تھا اور تم نے آزاد بھی اسی لیے کیا تھا اُسے ؟ ہیں ؟ وہ تو کچھ مقدر بھلے تھے جو مجھی سے مٹ بھیڑ ہوگئی اور ہر طرح و قوع کی تفصیل سے مجھے آگاہ کرکے یہاں لے آیا تھا اگر فوجیوں کو بھی لے آتا تو ہم سب جیل کی ہوا کھا رہے ہوتے اب تک ! لوٹ کے بعد قتل نہ کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا تم نے ؟ خیر، بہتیرا وعظ ہو چکا - اب اسے دفن کر دو کہ سڑنے نہ پائے !"

ڈاکو تو قبر کھود رہے تھے اور پارس میری طرف پیٹھ کیے کچھ کھا رہا تھا - میں نے ہولے ہولے درخت سے ہٹنا شروع کیا اور کھسکتے کھسکتے ایک قریبی کھوہ میں گھس گیا - رات ہو چکی تھی اور میں تاریکی کے پردے میں انتہائی تیزی سے چل پڑا - مجھے تاروں کی روشنی میں اپنا گدھا نظر آگیا جو چپ چاپ گھاس پر منہ مار رہا تھا اور آش کے درخت سے بندھا ہوا تھا - میں اس پر سوار ہوگیا اور راہ میں کہیں نہ ٹھہرا اور بھاگم بھاگ یہاں آپہنچا اب حضور عالی مجھے ایک ہزار دونیاں عنایت فرمادیں اور میں آپ کو پاروں کی کھوج میں رواں کر دوں - جس نے یونہی یاد آگیا، میرے ساڑھے تین ڈورو بھی دبا رکھے ہیں !"

جیسی نے پاروں کا پورا پورا حلیہ بتلانے کے بعد موعودہ انعام حاصل کر لیا اور دفتر سے باہر نکل آیا - اس کے جانے پر نواب اور اک اور شخص جس نے مجھے اس کہانی کی تفصیلات سے آگاہ کیا ہے، قطعاً حیران و ششدر بیٹھے رہ گئے !

اب یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ پاروں کے متعلق ہر دیا کی پیش گوئی کا اندازہ ممکن حد تک صحیح نکلا تھا -

جو واقعہ ابھی ابھی بیان ہو چکا ہے ، اس کے پندرہ روز بعد صبح کے قریباً نو بجے بے فکروں کا جم غفیر غرناطہ کے 'سان جوآن' اور 'سان فی لائپ' کے بازاروں میں دو فوجی دستوں کے اجتماع کو دیکھنے کے لیے ٹھہر گیا - نواب نے پاروں کی ذات ، اس کی جائے پناہ اور ساتھیوں کا حلیہ مشتہر کر دیا تھا اور ان فوجیوں کو گھنٹہ کے بعد اس کی تلاش میں ادھر چل نکلنے کا حکم موصول ہو چکا تھا - اہالیانِ غرناطہ اک غیر معمولی دلچسپی اور جوش و خروش کا اظہار کر رہے تھے - لیکن

غرناطہ کی قدیم سلطنت میں پاروں نے کچھ اس قسم کا خوف اور دبدبہ طاری کر رکھا تھا کہ فوجی اس اہم معرکے پر روانہ ہونے سے پیشتر نہایت متانت اور خموشی کے ساتھ اپنے دوستوں اور گھر والوں سے مل مل کر رخصت ہو رہے تھے۔

ایک فوجی نے اپنے ساتھی سے کہا "معلوم ہوتا ہے ابھی قطار میں کھڑے ہونے والے ہیں ہم! مگر دفعدار لوپے زدکھائی نہیں دے رہا کہیں!"

"بڑی عجیب سی بات ہے۔ جب بھی پاروں کو ڈھونڈھ نکالنے کا تذکرہ ہوتا تھا تو یہ شخص ہمیشہ پیش پیش تھا۔ اسے پاروں سے شدید نفرت تھی۔"

ایک تیسرا گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے بولا "تمھیں نہیں معلوم کیا ہوا ہے؟"

"ہیلو! یہ ہمارے نوآمد بھائی ہوں گے، کہو بھئی پسند آیا ہمارا دستہ؟"

"جی ہاں! واقعی بہت پسند آیا ہے تم لوگوں کا دستہ"۔ مخاطب نے جواب دیا جو پیلے چہرے اور خوبصورت جسم کا جوان تھا اور جسم کو وردی نے قدرے چھپا رکھا تھا۔

"کیا کہہ رہے تھے تم؟" پہلے نے پوچھا۔

پیلے چہرے والے نے جواب دیا۔ "تو ہاں بیچارہ دفعدار لوپے زتو مر گیا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو ارے مینوال! توبہ کرو بھائی۔ مجھے تو یقین نہیں اس بات کا۔ میں نے تو اسے صبح دیکھا ہے۔ بالکل جس طرح تمھیں اب دیکھ رہا ہوں!"

جس فوجی کو مینوال کے نام سے پکارتے تھے اس نے نہایت سکون سے کہا "آدھ گھنٹہ ہوا کہ پاروں نے اسے مار ڈالا ہے!"

"پاروں۔ وہ کہاں ہے؟"

"وہ یہیں ہے۔ عین غرناطہ میں۔ کوہ سنگ پر لوپے زکی لاش ملی ہے!"

سب خموش تھے مگر مینوال تھا کہ محبت وطن کی نشان کے ساتھ سیٹی بجا رہا تھا۔

ایک سارجنٹ بولا۔ "چھ دنوں میں گیارہ فوجی فنا ہو گئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاروں

ہمیں نیست و نابود کرنے کی ٹھانے ہوئے ہے۔ لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ وہ غرناطہ میں موجود ہے۔
اور ہم ہیں کہ اسے لوجا کی پہاڑیوں میں تلاش کرنے جا رہے ہیں۔"

مینوال نے سیٹی بند کر دی اور حسب معمول لاپروائی کے انداز سے کہنے لگا۔" اک بڑی بی نے اعلان دیکھا تو کہنے لگی، جب لوپے زکو اس نے مار ڈالا ہے تو یہ جو اس سے ملنے جائیں گے تو اُمید ہے مل کے بڑے خوش ہوں گے!"

" ارے بھائی، اس کا ذکر اتنی تحقیر سے کرنے میں تم کچھ ضرورت سے زیادہ ہی جرأت سے کام لے رہے ہو!"

مینوال نے کندھے اچکا کر کہا " یار وہ آدمی ہی تو ہے اور تو کچھ نہیں نا؟"

عین اس وقت قطار بندی کا حکم ہوا اور فوجی دستوں کی حاضری شروع ہو گئی۔
اتفاق کہیے کہ ادھر سے ہرویا بھی گزر رہا تھا اور دوسرے راہگیروں کی طرح وہ بھی فوجیوں کو بنظر تحسین دیکھنے کے لیے دم بھر کو ٹھہر گیا۔

نو آمد فوجی، مینوال کی نظر جو اس پر پڑی تو چونک اُٹھا اور چند قدم پیچھے ہٹا کہ اپنے ساتھیوں کے پیچھے چھپ جائے اور جب ہرویا نے اسے دیکھا تو اک چیخ ماری اور یوں اچھل پڑا گویا کسی زہریلے ناگ پر پاؤں آپڑا ہو اور چھوٹتے ہی سان جے رینی مو' بازار کی طرف بھاگنے لگ پڑا۔

اتنے میں مینوال نے اپنی بندوق اٹھائی اور جپسی کا نشانہ باندھا مگر اک اور فوجی نے بڑی پھرتی سے اس کی بندوق کو یوں دھکا دیا کہ نشانہ ہوا میں خطا ہو گیا۔

تماشائیوں کی طرف سے پیہم آوازیں آرہی تھیں " ارے پگلا ہے پگلا — دیوانہ ہو گیا ہے۔ ہوش حواس غائب ہو گئے ہیں اس کے!" اور افسر، سارجنٹ اور شہری اس پر پل پڑے۔ اس نے بچ کر بھاگ نکلنے کی کوشش تو کی مگر سب نے اسے زیر کر لیا اور سوالوں، لعنتوں اور بے عزتیوں کی بوچھاڑ کر دی! وہ سب کچھ خاموشی سے سہتا رہا!

اس دوران میں لوگوں نے جو بندوق چلنے کی آواز سنی اور ساتھ ہی ہر دیا کو بھاگتے دیکھا اور وہ سمجھے کہ کوئی بدمعاش مجرم ہے اور اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

جلیسی بولا "مجھے جرنیل کے پاس لے چلو، مجھے ان سے کچھ کہنا ہے۔"

لوگ بولے "کیا بات ہے تمھاری! کہنا بھی ہے تو جرنیل سے! پہلے یہ تو کہو قتل کسے کیا ہے تم نے؟ لو وہ رہے سپاہی! وہی تمھارا بندوبست کریں گے!"

ہر دیا نے کہا "بندوبست تو ہو ہی رہے گا مگر دیکھنا کہیں یاروں مجھے مار نہ ڈالے!"

"ارے یاروں کہاں؟ کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔ کیا ہو گیا ہے تمھیں!"

"جو ساتھ چلے آؤ گے تو سب پتہ چل جائے گا۔" اور لوگ اسے فوجی سردار کے پاس لے آئے۔ جلیسی نے بلنوال کی طرف اشارہ کرکے کہا "حضور! یہی یاروں ہے اور یہی ہو وہ جلیسی جس نے دو ہفتے قبل جرنیل کی خدمت میں اس کا حلیہ عرض کیا تھا۔"

لوگ چلا چلا کر کہہ رہے تھے "یاروں پکڑا گیا۔ یاروں پکڑا گیا! یاروں فوجی کے بھیس میں پکڑا گیا۔"

فوجی سردار نے جرنیل کے موصولہ احکام کو پڑھتے ہوئے کہا "اب شک شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نہایت احمق ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن بھلا کون مائی کا لال ایسا تھا جسے یہ سوجھتی کہ خود چوروں کا سردار ہی اُن فوجیوں میں شامل ہو گیا ہے جو اسی کو تلاش کرنے جا رہے ہیں۔"

یاروں جلیسی کو زخمی شیر کی طرح تک رہا تھا اور دل میں کہتا تھا "بڑا ہی ہو نوق نکلا میں! اک یہی تھا جسے جیتے جی چھوڑ دیا! جو کچھ ہوا ہے میں ہوں ہی اسی لائق!"

ایک ہفتے کے بعد یاروں کو پھانسی دے دی گئی اور یوں جلیسی کی پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی!

آرتورو آلا بار سے

بھیڑیا ۱۳

سورج افق کے نیچے ڈھلکتے ہوئے، کنارِ صحرا کے ساتھ ساتھ بنفشی روشنی کی لکیر کھینچ رہا تھا۔ آندھیوں کے جھکڑوں سے میدان میں مٹی کے بگولے اڑ رہے تھے۔ زہرہ اپنے تاریک گوشۂ فلک میں بیٹھی چمک دمک رہی تھی اور جوآن دی ہر در ہیرو اسے نے تھکے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پہ بیٹھے بیٹھے اپنے چھنارے کی کھنچی ہوئی تاروں پہ ایک حزن آمیز سُر چھیڑ دیا۔ گھوڑا تھکاوٹ سے بدقت قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا سارا جسم کاٹھی کے اگلے حصے پہ جھکا تھا۔ ٹوپی گردن کی پچھلی طرف پڑی تھی۔ آنکھیں گھوڑے کی گرد آلود ایال پہ جمی تھیں اور وہ دردناک میدانی گیت گا رہا تھا۔ اکثر اوقات گانے کے وقفوں کے دوران وہ تنہا خود کلامی میں مصروف ہو جاتا۔ پورے تیرہ گھنٹے گھوڑے پہ بیٹھے ہوئے آسیب نما یوڑ کے نشانوں پر چلتے جانا۔ پورے تیرہ گھنٹے بیابان میں سورج کے ساتھ ساتھ سوار رہنا۔ پورے تیرہ گھنٹے پسینے میں شرابور، خاک سے مٹی مٹی اور چمڑے سے پیوست ہونا۔ پورے تیرہ گھنٹے۔ اس بیکراں ویرانے میں مارے مارے پھرتے رہنے سے اس انسان کا زندگی سے تعلق کھو گیا تھا۔ اس کی روح سوکھی چھالیا کی طرح خشک ہو رہی تھی اور اس کی جلد ہی نہیں، دل بھی پتھر بن رہا تھا۔

جہاں تک نظر کام کرتی تھی زمین و آسمان کے سوا اور کوئی شئے موجود نہ تھی اور یہ دونوں افق پہ غروبِ آفتاب کی خونیں رنگ لکیر کے ساتھ مل جاتے تھے۔ اس وقت صحرا کے پتھر اس گرمی کو فضا میں لوٹا دیتے تھے جو وہ دن بھر جذب کرتے رہتے تھے۔ خاکستری رنگ ناگ پھنی

کے سائے لامحدود بینت تک طویل ہو جاتے تھے اور 'ہر دنہ جوآن' ان تمتماتے فاصلوں میں گھوڑے پر سوار، ہولے ہولے داخل ہوتے ہوتے اپنے گیت سے یوں منسلک تھا جیسے کوئی محبوب سے منتصل ہو۔ آندھیوں کے شور نے موت اور رات کی آمد آمد کا اعلان کرنا شروع کر دیا تھا۔ توہم اور خوف چپکے چپکے اس کی رگ و پے میں سرائت کر گئے تھے لیکن 'ہر دیجوآن' کا دل مصروف تھا۔ وہ اک مقصد کے ماتحت آہستہ آہستہ اک خاص مقام کی طرف رخ کیے ہوئے جا رہا تھا۔ ہوا میں اک بو آ رہی تھی جس کی رہنمائی میں اس نے ناک چڑھا کر ہوا کو سونگھا تو اس میں مردار گوشت کی بُو تھی۔

آسمان پر تاریکی چھا گئی، بہت دور کہکشاں چمک رہی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا فضائے بسیط میں کہکشاں نہیں شبنم چمک رہی ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ تاروں کے جنگلے کے سامنے کھڑا تھا، جو غیر مرئی حدود تک پھیلا ہوا تھا ــــ صحرا میں ایک گرد آلود لوہے کی سرحد۔ وہ گھوڑے کو اس تک لے جاتے ہوئے چند گز ادھر ہی کھڑا ہو گیا۔ اس نے گیت ختم کر دیا اور جامد و ساکت بیٹھ گیا۔ وہ لوہے کی خار دار تار کو تک رہا تھا۔ گھوڑے کی لگام ڈھیلی تھی۔ اس نے سخت زمین پر ٹاپ مارنے شروع کر دیے اور گھڑ سوار سڑن سے بھری ہوئی دم گھٹنے والی ہوا میں محصور تھا۔ بھیڑیوں کی گنتی کر کے مسکرا دیا۔ بارہ تھے۔ بارہ بھیڑیئے جنگلے سے لٹک رہے تھے۔ نیچے ایک دوسرے پر پڑے ہوئے دُمیں سخت، سر سینوں میں دھنسے، اس حال میں جانور دھوپ میں سڑ رہے تھے۔

سرخی مائل بادامی رنگ کی سکڑی ہوئی تھوتھنیوں پر خشک خون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہوا میں کھیتوں کے ڈراؤنے کوے یا جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ جب بیابان میں آندھی چلتی تھی تو ان کے سوکھے ہوئے بالوں سے کھیلتی تھی۔ بال کانپتے، ہلتے اور مردہ جسموں میں زندگی کے یہ آثار ظالمانہ ستم ظریفی کے مترادف تھے۔ 'ہر دیجوآن' کے ہاتھ بڑے بڑے اور کھردرے تھے۔ گندے ناخن اور ٹھنٹھوں جیسی انگلیاں لیے ہوئے۔

یہ اسی کے ہاتھ تھے جنھوں نے تیزاب کھنگالا تھا اور کھالوں اور کچے چمڑے کی تندوں کے سخت ریشے کھینچ ڈالے تھے یہی تھے۔ وہ جو بچھڑوں کی ریشمیں کھالوں پر جلتے نشان لگاتے تھے اور جن سے نشانوں کے بعد جلتے گوشت کی بو آتی تھی اور یہ اسی کے پھٹے ہوئے کھردرے ہاتھ تھے جو سال بسال لاتعداد جانوروں کے لیے اذیت کا سامان بنتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ اس کی ذات میں حیوانوں کا اندھا تشدد۔ خاموش ضدیت اور مقصد کی پرکھار دگی وحیدیت آ جمع ہوئی تھی۔ بیابان کی بے پناہ وسعتوں میں کھوئے رہنے اور تنہا مارے مارے پھرنے سے اس کی کائنات اتنی سمٹ گئی تھی کہ اس کی ٹوپی کے اندر سما سکتی تھی، تمباکو۔ شراب۔ خیالات اس کے علاوہ جو بھی شئے تھی۔ آسمان۔ بیابان۔ تنہائی ــ وہ محض اک وحشتناک اور خوف انگیز استفہام تھی اور بس!

اس روز وہ انھیں گننے کے لیے بڑی دور سے آیا تھا۔ یہ بھیڑیے ایہ رات کے آسیب، چاند پر ہوا نکھ ہو انکھ کر رات کی خاموشی کی بنیادیں ہلا ڈالتے تھے۔ یہ شکاری اپنی چھوٹی چمکیلی آنکھوں سمیت ریوڑوں کی گھات میں لگے رہتے تھے۔ یہی ہر درجواں کے قدرتی دشمن تھے اور جب وہ جال اور بندوق سے ان کا شکار کرتا تھا تو جو پکڑے جاتے تھے انھیں بڑی بربریت کے ساتھ فنا کے گھاٹ اتارتا تھا کہ دوسروں کے لیے عبرت پیدا ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر وہ انھیں تار کے چمکتے خاروں سے لٹکا دیتا تھا۔ تار کے ساتھ ساتھ ان کا خون سیاہ قطرے بنا تا چلا جاتا تھا اور ان کے سامنے شام کے ستارے کی بنفشئی روشنی میں اور طویل ہو کر صحرا پر ہلاکت کی لکیریں کھینچ دیتے تھے۔ ہر درجوآن اس سفاک تار پر تیرہ بھیڑیے دیکھنے کی خاطر کبھی اپنے آپ سے باتیں شروع کر دیتا اور کبھی مسکراتا، دھمکاتا اور کوستا۔ سب سے قد آور بوڑھا بھیڑیا ۱۳ بڑا شاطر، محتاط اور سرکش تھا اور اسے ہمیشہ جُل دے کر صاف نکل جاتا تھا۔ اک چٹان کے سنگ و خاک سے ایک اور چٹان بن گئی تھی۔ وہ مسلسل راتوں کو کبھی اس چٹان پر کبھی جھاڑیوں کے کنج میں چھپ کر اور کبھی سوکھی ہوئی دریا برآمد مٹی پر کھڑے ہو کر چاند پڑا دیا کرتا تھا اور ہر درجوآن کی آنکھیں ستاروں پر جمی ہوتیں اور اس کی آوازوں پر کان لگائے سردی کے مارے اپنے کمبل میں کانپ رہا ہوتا اسے

اپنے خیالوں میں یوں نظر آتا کہ بھیڑیا ۱۲ کی پیٹھ کبڑی ہوگئی ہے، دُم سخت اور تھوتھنی نوکیلی! اسے یوں معلوم ہوتا کہ وہ اسے بیابان میں دوڑتا پھرتا دیکھ رہا ہے۔ خونخوار اور ناباں۔ جب مہینوں بعد وہ اپنے 'سان انتوینو' کے تیل کے بیوپاری آقا کے سامنے حساب کتاب پیش کر رہا ہوگا تو اسے کہنا ہی پڑ جائے گا کہ ایک معمر بھیڑیا ایک سے زیادہ بچھڑے اٹھائے گیا ہے۔

'ہر درجوان' خدایا ابلیس سے دعائیں مانگتا تھا کہ بھیڑیا ۱۲ اس کے ہاتھ لگ جائے۔ اس نے آخری گولی کو بندوق کی نالی کے اندر ڈالا اور اس کریہہ منظر سے منہ موڑ کر بھیڑیوں کو وہیں چھوڑ دیا جو ہوا میں جھول رہے تھے۔ اور جن کی سرخی مائل کھالیں شفق کی آخری روشنی کو منعکس کر رہی تھیں، لیکن ان کا نقش اس کے ذہن پر کندہ تھا، قائم دائم تھا اور تنہا آدمی کی یادوں کی طرح امٹ۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ بھیڑیا ۱۲ لٹک رہا ہے پنجے ایک دوسرے پر پڑے ہیں اور سر ڈھلکا ہُوا ہے اور خود مغلوب ہو کر ختم ہو گیا ہے۔ اس خیال سے اسے اک گونہ راحت ہوتی تھی اور یہ خیال درد تھکن اور تنہائیوں کے نشان مٹا کر اس کے دل میں آباد ہو جاتا تھا۔ تمازتِ آفتاب نے اسے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔ اور اس کی جلد لاتعداد آڑی ترچھی لکیروں کا جال بنی ہوئی تھی۔ وہ راہب اور کھیتی کے جانور کی مخلوط نسل تھا۔ اور اس کے چوڑے چکلے چہرے پر حیوانیت کے آثار آشکارا تھے۔ اس کی ڈاڑھی سرخی مائل تھی اور دھوپ نے بھووں کا رنگ اڑا رکھا تھا۔ اور یہ دونوں چیزیں اس کی جھریوں میں سے روشنی کے کرچے بالوں کی مانند ابھرتی تھیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی پتلیاں سورج کی خیرہ کن روشنی کی وجہ سے سکڑ گئی تھیں۔ ان کا رنگ خاکستری مائل نیلا تھا۔ معصوم ہونے کے باوجود سخت اور خشک تھیں۔ اگر ان میں کوئی چیز جھلکتی تھی تو وہ تھا صحرا۔ بے پایاں تنہائی کی ہندسی اور مجرد، سپاٹ سطح۔ بآخر بیابان کی جوت جاتی رہی اور نتھری رات نے ڈیرے ڈال دیئے۔ 'ہر درجوان' گھوڑے سے اترا اور ناگ پھنی کے پیچھے چھپ گیا۔ آگ کی روشنی سے پرہیز کرنے کی خاطر اس نے تمباکو کا ایک ٹکڑا لے کر چبانا شروع کر دیا۔ اس کی انگلیاں بندوق کے گھوڑے سے کھیل رہی تھیں۔ وہ آنے والی مسرت کا مزا پہلے ہی سے

لے رہا تھا اور محوِ انتظار تھا۔ تھوڑے سے ہی عرصے میں چاند اپنے غیر متغیر مدار میں نمودار ہوگا اور بھیڑیا اپنی پچھلی ٹانگوں کے سہارے بیٹھ کر اپنی گنٹھے والی گردن کو رات کے نغموں کے لیے اُوپر اُٹھا دے گا اور وہیں ایک فولاد میں ملفوف تیز رو گولی اس کی آواز کو گلے یا سر ہی میں ختم کر ڈالے گی۔ یہ تھی ہر زجوان کی سوچ۔ وہ کمبل میں پڑا مسکرا رہا تھا چُپ چاپ منتظر تھا۔ چاند اور بھی بلند ہوگیا مگر بھیڑیئے کا کہیں اتا پتا نہ تھا۔ اس کی بندوق کا فولاد انگلیوں میں سرد تھا۔ تعجب تو اس امر کا تھا کہ وہ ابھی تک باہر کیوں نہیں نکلا۔ صحرا کس قدر سنسان، مرگ آسا اور بے جان دکھائی دیتا تھا۔ پتھر تھے یا یہ آدمی فضا سے لپیٹ تھی یا یہ آدمی۔ اس کی ایک ٹانگ سو گئی تھی۔ منجمد خون کی سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ وہ مزاحم نہ ہوا اور ساری کی ساری لات سُن ہوگئی۔ ایک خاموشی، عظیم خاموشی اس کی روح کو تاخت کر رہی تھی۔ یہ کوئی غول نہیں تھا جو اس کے ظاہر پہ تخلیق ہو رہا تھا بلکہ اس کی اپنی ذات ہی کی حرارت تھی۔ اس کے باطن کی ہر غیر محسوس شئے کا فرار تھا۔ ہر در جوان کو محسوس ہوا کہ کوئی شئے اسے چھوڑ رہی ہے۔ کوئی اہم شئے اس سے جدا ہو رہی ہے۔ اس کے بھدے بوٹ خالی خالی ہیں۔ اس کی پتلون اور کمبل اندر سے کھوکھلے ہوگئے ہیں اور ایک غیر متحرک تودے کی بے لوچ صورت، جسم کے آثار باقیات کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ 'ہر در جوان' سورج کی تپش میں جلے بھنے پتھروں کی مانند جو دن کو فضا میں دن بھر کی جذب شدہ حرارت کو لوٹا دیتے ہیں، روح کے بغیر رہ گیا تھا۔ اس نے سوچنے، یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اسے بے روح لمحی صورتوں کی جھلکیوں کے سوا اور کچھ یاد نہ آیا۔ تیل کے کنوؤں کے عجیب سے روئیں مینارے، بیئر کا نزنش مزا، تیل کے کنوئیں کھودنے والوں کے موٹے جسم اور سفید دھڑ۔ مبہم ریوڑ جو پاس سے گزرتے ہوئے مٹی کے بادل اٹھا جاتے تھے، بچھڑے کی کھوپڑی جو پیاس کے مارے دم توڑ گیا تھا۔ ان لڑکیوں کے ہوس انگیز بدن جن سے وہ وقتاً فوقتاً بیابان کی سرحدوں کے جنگلوں میں آشنا رہا تھا۔ یہ سب اس کے ذہن کے بے رنگ پردے پر ابھر رہے تھے لیکن یہ ساری صورتیں اتنی کھوکھلی اور بے جسم تھیں کہ اس کے لیے ناکارہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ خاموشی مکمل اور قطعی ہوگئی اور ہر در جوان، سرد رات میں کانپتا رہا۔

روح اس سے مفارقت کر گئی اور وہ اس کے بغیر اک دھبا تھا جو تنہائی میں کھو گیا ہو۔ اپنی بندوق کو گھٹنوں کے ساتھ پیوست کرتے ہوئے، اس نے منہ میں بچے ہوئے ترش تنبا کو کو پھر چبانا شروع کر دیا۔ وہ منتظر رہا۔ وہ مایوسانہ منتظر تھا کہ معاً ہوانکنے کی مختصر آواز آئی۔ وہ اسے سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سیدھا کھڑا تھا۔ لرزاں۔ ہاتھ میں بندوق لیے چاروں اور دیکھ رہا تھا۔ بھیڑیا ۱۲ آ پہنچا تھا۔ کہیں نزدیک ہی اس کی زرد آنکھیں چمک رہی ہوں گی۔ اس نے بندوق کی نالی سے حفاظتی نلی کو اتار ڈالا اور میدان میں بھاگنا شروع کر دیا۔ ہوانکنے کی آواز بار بار آئی اور پھر آئی۔ وہ بڑی احتیاط سے اس جگہ پہنچا جہاں سے آوازیں آئی تھیں۔ اسے محسوس ہوا کہ زندگی لوٹ آئی ہے اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے ہاتھ اس کے اپنے ہی ہیں اور اس کے بڑے بڑے پاؤں اپنے جانے پہچانے پرانے بوٹوں کے اندر موجود ہیں۔ وہ ابھی راستے کی سدھ لے رہا تھا۔ متامل تھا کہ اک درد انگیز آواز سنائی دی جس کے سہارے وہ جھاڑی کے زرد چھدرے ہوئے سائے کے پاس پہنچ گیا۔ یہ رہا بھیڑیا ۱۳ - قدآور اور خاکستری رنگ۔ اس کی غراتی ہوئی تھوتھنی سے مضبوط اور سفید دانت دکھائی دیتے تھے۔ اس نے پیٹھ کو کبا کر رکھا تھا۔ پنجوں سے خون جاری تھا اور سیاہ اور سوجی ہوئی زبان باہر لٹک رہی تھی۔ وہ بھاگ جانے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نفرت اور خوف سے چمک رہی تھیں اور اپنی طرف ہولے ہولے آنے والے آدمی کو تک رہی تھیں۔ اس کی پیٹھ کے بال کھڑے ہو گئے تھے اور وہ مختصر گلو گرفتہ آوازیں ہوانکتا تھا۔ 'ہر در جوآن' نے حالات کا اندازہ لگایا۔ بندوق اٹھائی اور شست باندھ لی۔ جانور مارے پیاس کے مرا جا رہا تھا۔ درد سے اتنا کمزور پڑ گیا تھا کہ اب چاند پر ہوانکنے کی ہمت نہ رہی تھی اور آج کی رات اس کی آخری رات تھی 'ہر در جوآن' مسکرا دیا۔ اسے تمام مصلوب بھیڑیوں کا خیال آ گیا۔ وہ ان کے متعفن ماس کی بدبو تک سونگھ سکتا تھا۔ ہولے ہولے بندوق کے گھوڑے پر اس کی انگلیوں کی گرفت سخت ہو گئی گویا بندوق نہیں کمان کھینچ رہا تھا۔ یوں جانور اور آدمی ایک دوسرے کو کتنے ہی ثانیئے تکتے رہے۔ مگر گولی کبھی بھی اپنے نشانے تک نہ پہنچی۔

بھیڑیا

بُہر درجوان نے معاً اپنا ارادہ بدل دیا اور گولی آسمان کی طرف ہوا میں چھوڑ دی۔ خلائے بسیط میں آواز گونج اٹھی۔

بھیڑیا ہانپ رہا تھا۔ اس کے دونوں پہلو دھونکنی کی طرح ابھرتے اور بیٹھتے تھے۔ وہ جھاڑیوں میں زندہ سلامت موجود تھا۔ آدمی نے اک نظر دیکھا۔ چند محبت بھرے الفاظ کہے اور پانی لانے کے لیے چلا گیا۔ جب وہ ایلومینیم کے پیالے پر جھک کر پانی ڈال رہا تھا۔ تو جانور وحشت کے مارے پیچھے ہٹ گیا۔ بُہر درجوان اپنی ناگ پھنی کی طرف لوٹ آیا کہ وہ اطمینان سے پانی پی لے۔ وہ کمبل میں لیٹا پڑا تھا۔ ستاروں کی روشنی سیدھی اس کی پیشانی پر پڑ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا اگر وہ اسے مار ڈالتا تو پھر دنیا میں اور کام ہی کون سا اس کے کرنے کو رہ جاتا اور پھر اس رات والی وہی صحرائی خاموشی لوٹ آتی جس کے ہاتھوں اسے اس قدر اذیت پہنچی تھی۔ وہ خوش خوش سکون سے سو گیا اس کے پاؤں بوٹوں میں جمے ہوئے تھے اور پیاسے بھیڑیے کے پانی پینے کی شپ شپ کی سہانی آواز اسے لوری دے رہی تھی۔

سو یہی وجہ کہ بھیڑیا اِک خاصی مدت تک شاید سالہا سال زندہ سلامت رہا۔ اور جب آسمان پر چاند پورا ہوتا تو مسلسل اوہانکا کرتا اور بچھڑوں پر حملہ زن ہوتا اور بُہر درجوان طیش کھا کر اس کا پیچھا کیا کرتا۔ لیکن اس آدمی نے بیابان کی وسعت میں اس رات والی صحرائی تنہائی کو پھر کبھی محسوس نہ کیا اور اس کی نظر میں بھیڑیا ایک مقدس، قابلِ احترام دشمن تھا۔

صاحبِ کردار

شب کے بارہ بجنے کو تھے کہ مارٹن اپنے دوستوں سے رخصت ہوا۔ اس کی روز کی عادت بن گئی تھی کہ مے خانے میں اس وقت تک ضرور ٹھہرا رہتا تھا۔ شراب پیتا اور مصری سگرٹوں کے کش پہ کش اڑاتا اور اس دوران میں اپنے مختلف النوع اور کثیر التعداد معاشقانہ معرکوں کا تذکرہ چھیڑے رکھتا۔ وہ شیخی بگھارتے ہوئے بڑے فخر سے کہتا۔ عورتیں تو اپن جانب پرلوٹن کبوتر ہو رہی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس ڈھب کی زندگی اس کا نصب العین بن چکی تھی۔

دو کرائے کی موٹریں جنھیں کیرا کس کی بولی ٹھولی میں 'الو' کے نام سے پکارتے ہیں — گرجے کے سائے تلے کھڑی تھیں۔ ان کے ڈرائیوروں نے اسے اپنی خدمات پیش کیں۔

"کیا خیال ہے مارٹی، گھر کو نہ چلیے گا؟"

"میں منتظر اور تیار ہوں، مارٹن!"

قصبے کے بے فکرے نے جواب دیا۔ "برخوردارو! آج شب ہمارے لہو کی اک بوند بھی نچوڑ لو تو کمال ہوگا۔"

"ارے کیا بالکل ہی صاف ہو گئے ہو؟ تو پھر کیا ہوا!"

"ارے میاں! پھر دے دنیا، تم جانو —"

"ابھی نہیں رہنے دو تم! میں اپنے دو سلنڈروں پر رواں دواں ہوتا ہوں۔ یہ رہیں گے بھی بڑے پُرلطف!"

دونوں ڈرائیور اس کی لطیف سی پھبتی پر ہنس پڑے جس میں اس نے "کیراکس" والوں

کی شگفتگی بکھیر دی تھی - ایک نے پیچھے سے آواز دے کر کہا "دیکھیو، کہیں راستہ نہ بھول جانا۔"

"برخوردار، راستہ نہ بھولا ہیں، اگر بھول بھی گیا تو یقین کرو، کھو نہیں جاتا ہیں - اپنے سائے سے بھی زیادہ آشنا ہوں راستے سے!"

وہ اپنی ہر دلعزیزی کے زعم میں راستے پر سڑک کو جاتے ہوئے بڑے اکڑ اکڑ کر چل رہا تھا! یہی خیال دل میں سمایا ہوا تھا کہ اب کوئی نہ کوئی ڈرائیور دوسرے سے بولا کہ لولا۔" بھئی یہ مارٹی! کیا بات ہے بھئیا اس کے دل کی! کیا ٹھاٹ کا آدمی ہے واللہ! اپنے تن کا کپڑا بھی اتار کر دے ڈالنے نہیں۔"

احساسِ برتری کی اک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے مونچھوں سے بے نیاز لبوں پر کھیل رہی تھی - اس کی ایڑیوں کی میخ نلی کھٹ کھٹ بڑے شاہانہ طور پر پٹڑیوں پر سنائی دیتے ہوئے، آدھی رات کی خاموشی میں گونج رہی تھی - اگرچہ وہ کسی ذہنی دقیقہ سنجی کے قابل نہیں تھا مگر اسے سنسان راہوں پر اپنی رفتار کی گونج سننا بڑا پسند تھا - اس سے اس کے دل میں اک مبہم سا احساس پیدا ہوگیا تھا کہ وہ اپنے وطنِ مالوف کی روح پر اپنی شخصیت کا نقش ثبت کر رہا ہے - جس کے باسیوں کے مسرور و لطیف کردار، عناد و ظرافت سے بھرپور، اس کے اپنے کردار سے ہمنوا تھے!

یہ خیال مارٹن کے افتخار کی انتہائی مسرت خیز اساس تھی۔ وہ سینہ تان کر کہتا تھا۔" میں اصل اصیل باشندۂ کارا کس ہوں فکر و سنجیدگی کی قبولیت سے عاری مستقل کھلنڈرا عیش و عشرت اور بلند معیارِ زندگی کا دلدادہ، دونوں ہاتھوں سے زر و دولت کو لٹانے اور ہر ایک کے دل کو موہ لینے والا!" اسکا کافی وافی ثبوت اس کی وہ مقبولیت تھی جو اُسے شوفروں، کرائے کی موٹروں کے ڈرائیوروں اور مے خانوں کے مغبچوں میں نصیب تھی!

وہ ان ناموں میں دو اور کا بھی اضافہ کر سکتا تھا۔ جواری اور دلال - اگرچہ اپنے وقار پر اک تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے وہ انھیں فراموش کر چکا تھا مگر دل میں ان کا خیال گزرا

ضرور تھا، لیکن وہ خلافِ معمول کی حیاداری ــــ وہ چنگاری جو وقتی طور پر انتہائی تاریک اور فسق و فجور سے معمور زندگیوں کو بھی تابناک کر دیتی ہے اور ان کے خون میں خوابیدہ شاید صدیوں کی رُوگی شرافت کا آنکھ جھپکنے میں غائب ہو جانے والا ادعا بیدار کر ڈالتی ہے بہرحال وہ خلافِ معمول کی حیاداری ہی تھی جس کے احساس کے ماتحت اسے تائیدِ ذاتی کے طور پر کہنا ہی پڑا۔ "اعلیٰ طبقے میں بھی تو میرے مداح موجود ہیں۔ 'لوئی ساترے سا آولا'۔ کار اکس کی جان محبوبی، اس بات کی تصدیق کر سکتی ہیں۔ وہ مجھ پر جان چھڑکتی ہیں اور آنتا گرے شی آ آرگندی گوئی ــــ اور یہ اور وہ !"

حقیقت یہی ہے کہ وہ تھا بھی محبوبِ نظر۔ اس کے نفیس قطع کیے ہوئے کپڑے۔ صاف ستھرے خدوخال، منجھے ہوئے اوضاع و اطوار ان لڑکیوں کو موہ لینے کو کافی تھے جو ابھی بہارِ شباب کے دورِ اوّل میں قدم رکھ رہی تھیں۔ جب انھیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی مرد کی نظرِ التفات کا مرکز ہیں تو وہ بڑے رازدارانہ طور پر دل ہی دل میں محبت کے اولیں جذبات سے حظ اندوز ہو جاتی تھیں۔ جس طرح ان کا شیریں پسند کام و دہن قندنبات کی میٹھی لطافت سے واقعی لُطف اندوز ہوتا ہے اسی طرح انھیں یہ چیز بھی قطعی طبعی نظر آتی تھی کہ مارٹن جیسا جامہ زیب اور شاہد باز ان کے جمالیاتی ذوق کا روپ دھارے ہوئے ہو۔ وہ مارٹن جو کپڑوں کے متعلق اس قدر محتاط تھا کہ کیا مجال ان میں کوئی شکن پڑے یا بھولے سے کبھی داغ نظر آئے۔ جو مصری سگریٹ پیتا تھا اور گلاب کی طرح عطر بیز تھا۔

بہرکیف اس رات مارٹن کار اکس کی شریف اور نوجوان و منفرد شخصیت کے برعکس جمعیت خاطر کو کھویا کھویا نظر آتا تھا کہ اس کے محبوب یا ربائش آرزائے تاتے، ملاقات کے وعدے کو نبھایا نہیں تھا۔ اس نے کہہ رکھا تھا کہ وہ کار میں نو اور دس کے درمیان اسے لینے کے لیے مے خانے پہنچے گا مگر آیا نہیں۔

اک خیال سے نجات حاصل کرنے کی بدترین سے بدترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اسے دل میں آنے نہ دیا جائے۔ مارٹن کی بھی آرزو تھی کہ وہ اک ناخوشگوار خیال کو دل میں جگہ نہ دے

مگر خیال تھا کہ اس کے ذہن کے آس پاس کاوے کاٹ رہا تھا، تنگ کر رہا تھا اور بالآخر ہوا یوں کہ وہ چوری چھپے اس کے نفسِ شعور کی روشنی میں پوری طرح اُگھسا! آرزائے تانے اس کی ملاقات سے اعراض اس لیے کیا کہ وہ ریتا کے عشق و معاشقے میں مصروف تھا جو اس کے گھر کی لڑکیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔

مارٹن اس بات کو حق الیقین سمجھے ہوئے تھا، اک روز یہی بات دل میں لیے ہوئی تھی کہ اس سے آرزائےتا کو آ لیا، جو اس کے مکان کے دریچے تلے اس کی بہن سے مصروفِ گفتگو تھا اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے!

اس سے مہذب انسان کے لیے ظالم بھائی کا کردار ادا کرنا انتہائی مضحکہ انگیز شئے تھی مگر قدیم الایام کی دوستی کو نبھاتے جانا بھی اس سے کچھ کم بے طرح نہیں تھا۔

"اُف خدایا! آخر یہ سارا کام میرا ہی تو نہیں ہے۔ بڑے میاں بھی تو ہیں۔ وہ لڑکیوں کے نگران ہیں! اور وہ ذمہ دار . . . . "

ذمہ دار؟ اس اصطلاح کو وہ استعمال میں لایا ہی کیوں؟ اتفاقیہ ہی سہی مگر تھی بھی کوئی شئے جو ذمہ داری کی تقاضہ دار تھی؟ 'آرزائےتا' اک شریف ـــــ ہوںہم۔ آرزائےتا۔

اک ناقابلِ بیان ذہنی تذبذب کے بعد، سگریٹ کا دھواں اندر کھینچتے اور کندھے جھٹکتے ہوئے گویا اس سخت کوفت سے نجات کی آرزو ہے جو کاراکن روح کردار کے قطعی منافی ہے۔ وہ آرام سے اک نتیجہ پر پہنچ گیا۔ "میں عرض کر رہا ہوں کہ بڑے میاں جو ہیں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ اس دردِ سر کو مول لوں۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ـــــ "

ایک اچھے دین آزولی کی طرح اس نے فرائض کے تصوّر کو حقوق کے تصور میں خلط ملط کر دیا۔ یا یوں کہہ لیجیے تو بہتر رہے گا کہ اس کے لیے حقوق ہی حقوق تھے فرائض نہیں تھے۔

(۲)

جب گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اتنی رات گئے، سامنے کا دروازہ ابھی تک چوپٹ

ہے! اک فوری اور قطعی نیم شعوری خوف نے پٹڑی پر ہی اس کے قدم پکڑ لیے۔ وہ انتہائی غور سے اندر سے آنے والی آوازوں کو سن رہا تھا۔ آواز تھی کہاں؟ روشن ڈرائنگ روم سے آوازوں کی بھنبھناہٹ تک نہ آرہی تھی۔ وہاں کوئی ملاقاتی موجود نہیں تھا۔ اس کا دل ڈوب گیا جس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ خیالوں کی عدم موجودگی شدید خلش اضطراب کا باعث تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ سوچنے سے ڈر رہا ہے! آخر ایک خیال آ ہی گیا۔ "کہیں بڑے میاں کو پھر تو غشی کا دورہ نہیں پڑ گیا۔"

اس امکانی بات میں کسی قسم کی تسکین نہیں تھی۔ مگر اس خیال کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہی اسے تسکین سی ہو گئی۔ بالآخر اس نے گھر کے اندر جانے کی ٹھان لی۔

اس کی دو بڑی بہنیں ڈیوڑھی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔ گالوں کو ہاتھوں کا سہارا دیئے تھیں اور خالی خالی نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ فضا میں نحوست چھائی تھی۔ کوئی چیز جس نے انہیں گھیر رکھا تھا ان جھکے ہوئے سروں کو جھکا رہی تھی۔ ان کے سروں پر زندگی کے غیر مرئی پر کسی حادثے کے منحوس دائروں میں چکر کاٹ رہے تھے!

مارٹن دہلیز پر متذبذب تھا۔ اسے حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ اسے پار کر جائے۔ اک خوف کی لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اک موت کی سی خنکی تھی جس نے اس کا بند بند ہلا ڈالا تھا۔ اور کسی پنجے کی طرح گلے کو گرفت میں لے رکھا تھا۔

اک بہن اسے یوں ملنے کو آئی، جیسے کچھ بات کہنے کو ہے لیکن اس نے مارٹن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اک ناقابلِ بیان جذبے کے ساتھ جوابوں کی طرح تکنا شروع کر دیا۔ مارٹن نے بھرپور کوشش کرنے کے بعد پوچھا "کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

بہن نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا گویا قبر سے بول رہی ہو "کلاریتارات کے کھانے کے بعد باہر کو جاتے ہوئے کہ گئی تھی کہ میں بازار کے اس پار "اورزکو" کے گھر جا رہی ہوں۔ یہ وقت ہونے کو آیا مگر وہ لوٹی نہیں۔"

" لیکن اُسے بلا کیوں نہ بھیجا تم نے، اب تو آدھی سے بھی زیادہ رات جا چکی ۔"

مارٹن نے جواب تو دے دیا مگر اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس نے کہا کیا ہے ۔ اس نے فقط اس لیے کہا تھا کہ اس کے دل میں خفیہ طور پر اک خیال اس بات کا آرزومند تھا کہ خدا کرے کہ اس کی بہن اورزکو کے یہاں ہی موجود ہو اور واقعہ یہ ہے کہ وہ دیکھ بھی چکا تھا کہ ان کے سامنے کا مکان بند پڑا تھا ۔

اس کی بہن ہچکیاں لیتے ہوئے بولی " کلاریتا بھاگ گئی ہے مارٹن ۔"

مارٹن منجمد کھڑا تھا ۔ اس کا منہ نیم وا تھا ۔ گویا وہ ناکارہ الفاظ جنہیں وہ کہنے کو تھا اس کے لبوں پر جم گئے ہیں ۔ اپنے آپ کو تسکین وہ الفاظ سے فریب دینے کا کچھ فائدہ نہیں تھا ۔ حقیقت آشکارا ہو چکی تھی ۔ جو پیش اندیشگی گھر میں آنے سے پہلے اس پر حملہ زن ہوئی تھی ۔ اب اک واقعہ بنی ہوئی تھی ۔ اُسے اک احمقانہ سا خیال آیا کہ پوچھے : اسے کون بھگا کر لے گیا ہے ! مگر اسے بیان کرنے سے پہلے ہی وہ منفعل تھا ۔ اس سے بڑھ کر بھلا اور کون جان سکتا تھا کہ اسے کون بھگا کر لے گیا ہے — وہی بدمعاش اُرزاسے تا !

وہ دروازے پر کھڑے کھڑے ذرا کی ذرا گھبرایا سا اور پھر کٹھ پتلی کی طرح اپنے کمرے کو چل پڑا ۔ اسے اپنے والدین کے سامنے آتے ہوئے ڈر سا لگتا تھا ۔ جو کچھ ان سبھوں پر آ ٹوٹا تھا اس سے متعلقہ الزام کے سلسلہ میں اسے اپنے حصّے کی اک مبہم سی آگاہی تھی ۔

کچھ دیر کے بعد اس کے باپ نے کہا ۔ " تو خیر — باہر کے دروازے میں تالا ڈال دو ۔"

برادرانہ شفقت سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ! اس کے دل میں کوندے کی لپک کی تیزی اور قوت کے ساتھ باپ کے یہ الفاظ کہ باہر کے دروازے میں تالا ڈال دو اپنی پوری ہولناک اہمیت سمیت گزر گئے ! ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ " اب کوئی اُمید باقی نہیں رہی ، ہماری ناقابلِ تلافی بے عزتی کی جو انتہا ہونی تھی ، ہو چکی !"

اسے اک فوری خیال آیا کہ اپنے والدین کے پاس جا کر ان کی گود میں گر پڑے اور اپنی

مشترکہ بدنصیبی پر ان کے ساتھ آنسو بہائے لیکن کسی مبہم اور پختہ تر خیال نے اسے روک لیا۔ اگرچہ اسے اپنے حصّے کی خطا کاری کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا مگر اس نے یہ سوچنا گوارا نہ کیا کہ وہ کیوں کر متہم ہے۔

وہ چارپائی کے سرے پر بیٹھ گیا۔ ابھی تک سر سے ٹوپی بھی نہ اتاری تھی۔ یکے بعد دیگرے کئی سگریٹ جلائے اور پھونک ڈالے! اس کا دماغ ایک چکر تھا جو کسی دیوانہ وار قوت سے گھوم رہا تھا۔ کبھی دیوانگی کے بگولوں کو حرکت بن لاکر سخت غیض و غضب کے ساتھ گھومنے لگتا اور کبھی معاً کھڑا ہو جاتا اور یوں معلوم ہوتا کہ اس کی ساری زندگی پوری پوری زبوں حالی و پستی اور قطعی بے اعتنائی کے تحت الثریٰ میں ڈوب گئی ہے ازالہ حیثیت عرفی کی تلافی ہو کر رہے گی، اور بدنامی کا دھبہ خون سے دھل کر رہے گا۔ چاہے وہ خون دغاباز 'آورزانے تا' ہی کا کیوں نہ ہو! وہی 'آرزانے تا' جو یارانِ بزمِ عشرت کی متعدد صحبتوں میں اس کا یارِ باش رہا ہے!

ایک دفعہ جب دونوں دھت ہو رہے تھے تو بدمعاش نے اپنا نکتۂ نظر واضح الفاظ میں بیان کر دیا تھا۔

"نہ بھیّا! چاہے کوئی گولی سے کیوں نہ اڑا دے۔ شادی نہیں کروں گا۔ زندگی عیش و عشرت کے لیے بنی ہے اور عورتیں زندگی کا ایک حصّہ ہیں۔!"

"کیا سبھی، آرزانے تا!؟"

"ہاں سبھی سبھی، ایک ایک، اگر میں انھیں کچھ کہوں اور وہ 'ہاں' کہہ دیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بھی 'اسی' کی آرزو مند ہیں اور جو وہ نہ قبول کریں تو پھر بھی وہ اتنا ہی اپنے آپ کو میری ممنون محسوس کریں گی!"

حد ہے بے حیائی کی۔ بے غیرتی کی! اسی وقت اس کی ایسی کی تیسی نہ کر دی میں نے! کہ ہم دونوں کو خوب معلوم تھا کہ کس کی بابت پوچھا جا رہا ہے۔ اور جب اس نے جواب دیا تھا "ہاں ہاں! سبھی سبھی، ایک ایک"، تو کس کی ذات محلِ نظر تھی! بہن کی اور بیک وقت بھائی کی بے عزتی

پر اسی وقت سے مہر ثبت ہو چکی تھی۔ معاملہ قطعاً عیاں تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ یہ معاملہ اس پر اب واضح ہو رہا تھا بلکہ اسے تو پوری قوتِ یقین کے ساتھ کبھی کا پتہ تھا۔ مگر اتنا تردد ہی نہ کیا کہ حفظِ ماتقدم کے تقاضوں کو پورا کرتے! کس قدر بدبخت تھا وہ!

جس طرح تاریک کوئیں سے صاف ستھرا پانی بر آمد ہوتا ہے اسی طرح زندگی میں پہلی بار مارٹن نے اپنی حقیر اور پست روح کے لیے روحانی طہارت کی آرزو کو شدت سے محسوس کیا!

مگر یہ آرزو بھی وقتی ثابت ہوئی۔ بآخر اس نے کپڑے بدلے اور سونے کے لیے بستر پر دراز ہو گیا!

(۳)

وہ دوسرے روز دیر سے اٹھا۔ تمام رات بڑے بھیانک خواب آتے رہے اور بہت سے خوابوں کو گزشتہ رات کے واقعہ کے تاثرات کی حدت و شدت نے جنم دیا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اپنے سر کو لوشن سے تر بہ تر کر کے اک پُر نشاط اثر محسوس کرنے لگا جس سے پراگندگیٔ خیال سے نجات سی ہو گئی۔ اس نے شیو کرنا شروع کر دیا۔ پھر یک قلم اپنی صورتِ حال کا خیال آ گیا۔ جب وہ باہر نہیں جا سکتا تھا تو پھر شیو کیوں؟

یہی تھا وہ وقت جب حقیقی مارٹن، روزمرہ کے مارٹن نے اس بدقسمتی کی وسعت کو پہچانا جس نے اسے اور اس کے باقی کے اہلِ خاندان کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا! اب وہ باہر نہیں نکل سکنے لگا! وہ اتوار والی ذاتی نمائش سے محروم رہے گا۔ قبل از دوپہر، پلازا بولیور میں جلوہ آرائی نہ کر سکے گا۔ بعد از دوپہر راڈائی ز بول وارڈ میں موٹر کی سیر نہ ہو گی، سینما نہ ہو گا، راتوں کو جلسے نہ ہوں گے۔ خدا ہی جانے کب تک دوستوں کی صحبت سے احتراز ہو گا۔ کب تک اپنے آپ کو زندہ درگور کرنا ہو گا۔ کب تک نسیاً منسیا کا عالم رہے گا۔ شاید مدتِ دوام تک! آہ! یہ حادثۂ عظیم!

وہ اپنے آپ سے باتیں کیے جا رہا تھا کہ اس کی ماں آ گئی اور سلسلۂ خیال منقطع ہو گیا بیچاری بدقسمتی کی چکی میں پس رہی تھی۔ بے خوابی اور رونے سے آنکھیں سوج رہی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو اس کے بازوؤں کے حوالے کر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ پڑی!

یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ماں کے سینے کی مقدس گرمی نے اس کے افسردہ دل میں جذبۂ غیرت کو بیدار کر دیا ہے۔ وہ چلّا اٹھا: "میں اس بدمعاش کو مار ڈالوں گا۔"

"نہ بیٹے! خدا کے لیے اس بات کا دل میں وہم بھی نہ لاؤ! خدا نہ کرے کہ تم ایسی حرکت کر بیٹھو!"

"لیکن ماں! یہ بے عزتی! تمھارا کیا خیال ہے میں اسے برداشت کر سکتا ہوں؟"

"آہ بیٹے! یوں تو تم ہماری مصیبتوں میں اور بھی اضافے کرو گے! یوں تو تم مجھے مار ہی ڈالو گے۔ مجھے مار کر ہی چین لو گے؟ — نا! نا! ایسی بات کو سوچو بھی نہ تم!"

"اُف خدایا — ایسی بات کو سوچو بھی نہ تم! اور لوگ پڑے ہنسیں ہم پہ! نہ ماں، یہ نہ ہو گا مجھ سے، ناممکن ہے جو تم کہہ رہی ہو! یہ میری مردانگی پر ایک حرف ہے! ایک لعنت!"

اِن الفاظ کو بار بار دہرانے سے اسے ان کے مبنی بر صداقت ہونے کا یقین ہو گیا۔ اپنے تھوڑے بہت مطالعہ پر انحصار کرتے ہوئے، اس نے خطیبانہ انداز اختیار کر کے کہنا شروع کر دیا۔ "میری زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ برباد ہو گئی ہے۔" اور ساتھ ہی فرش پر ایک ایکٹر کی طرح ٹہل رہا تھا جو پسِ پردہ کے لقموں کا منتظر ہو۔ نسلِ انسانی کوئی یکساں رنگ ٹکڑا نہیں ہے — اس میں بُرے لوگ بھی ہیں اور بھلے بھی، اسے اک مستحسن خیال سوجھا کہ اپنے آپ ہی کو کیوں نہ گولی سے اڑا دوں!

جب اس نے اس خیال کا اظہار ماں کے سامنے کیا تو وہ چونک اٹھی اور اسے گلے سے لگا کر منت سماجت سے کہنے لگی "مارٹن! خدا کا واسطہ ہے تمھیں دکھوں کے ماروں کو اور دکھی نہ کرو! جو بیت گئی ہے، اسی نے کمر توڑ رکھی ہے اور مووں کو کیوں، بار رہے ہو! ذرا اپنے

غریب بیمار باپ کا تو خیال کرو! وہ تو سنتے ہی ڈھیر ہو جائے گا۔"

" ماں! اس کے سوا اور کوئی راہِ فرار بھی نہیں۔ خیال تو کرو آئندہ جینا کس قدر دوبھر ہو جائے گا میرے لیے۔ مَیں کسی سے آنکھ تک نہیں ملا سکتا! یہاں اب رہا نہیں جا سکے گا!"

"کہیں باہر چلے جاؤ مارٹن۔ کاراکس چھوڑ ہی دو!"

"کدھر جاؤں؟ تمھارا مطلب ہے کسی فضول سے گاؤں میں دب کے مر جاؤں؟ اس سے یہ بہتر نہیں ہوگا کہ گولی کا نشانہ بن جاؤں۔"

"کسی دوسرے ملک کو چلے جاؤ۔ یورپ ہو آؤ۔ کل رات تمھارا باپ اور میں یہی باتیں کر رہے تھے۔ تمھارا یہاں رہنا سخت مشکل ہو جائے گا۔ وہ تمھاری خاطر قربانی پر آمادہ ہے۔ وہ تمھارے سفر کے اخراجات برداشت کرلے گا۔ ہم ہر تنگی ترشی کو سہہ لیں گے۔ میں تمھیں جانتی ہوں اور جانتی ہوں کہ اگر اس نامراد سے تمھاری مڈبھیڑ ہو گئی تو نہ جانے تم کیا کر بیٹھو۔ اب 'نہ' نہ کہو۔ جو کچھ کر رہے ہیں ہم تمھاری بہتری ہی کے لیے کر رہے ہیں۔ میں تمھیں منت کروں گی کہ انکار نہ کرنا۔"

سیر اور پھیر یورپ کی! اس کا سنہرا خواب پورا ہو رہا تھا۔

جب کبھی کاراکس کی زندگی دیوارِ زنداں کی طرح اِک بوجھ، اِک وبال ثابت ہوتی تھی تو وہ بے اختیار یورپ کے لیے آہیں بھرا کرتا تھا!

کل رات ہی کی تو بات ہے کہ وہ مے خانے میں یارانِ عشرت سے اسی بات کا ذکر چھیڑے ہوئے تھا اور کون جان سکتا تھا کہ چند گھنٹے بعد، انگلی تک ہلائے بغیر یورپ کی سیر اک حقیقت بن جائے گی۔

اس نے سر نہوڑا لیا اور بے بس سا ہو کر بولا "ماں!"

لفظ یوں منہ سے نکلا جیسے اک محزوں، شکست خوردہ کی فریاد ہو۔

"ہاں بیٹے! تمھارے باپ نے کافی سوچ بچار کے بعد اس بات کا فیصلہ کیا ہے۔

فیصلہ کیا تھا پاک مریم کی طرف سے القا تھا۔"

مارٹن نے جیسے اس معاملے کو اچھی طرح سے جانچ تول لیا ہو۔ بآخر کہنے لگا۔"بہت بہتر ماں! میں چلا جاؤں گا ۔"

اور پھر شیو کرنی شروع کر دی !

ریکارڈو پالما

دولڑاکا فاختائیں

نُچوکی ساکا' میں ننھی بیوہ' دانا کے تالی نادی شیلوز' سب سے بڑھ کر اشتہا انگیز تھی ۔ ٹیفی (باشندۂ ویلز) کے سے سنہری بال تھے اور شاہ دانے کا سا سرخ دہن اور آنکھوں سے بڑھ کر دو آنکھیں تھیں جو دو سپاہی تھے کہ وہیں آپ کو اپنی تحویل میں لے لیں گے ۔ میں تو کہتا ہی چلا جاؤں گا مگر آپ بھی تو اپنے زورِ تخیّل سے کچھ کام لیں ۔ اپنی عمر کی ۲۲ ویں بہاریں تھی اور مکانات اور زرخیز زمینیں اس کی دولت ۔

جب بہی کھاتے کے جمع خانے میں ایسی ایسی کئی رقمیں موجود ہوں تو آپ آپ ہی اندازہ لگایئے کہ یہ کام آپ پر ہی چھوڑتا ہوں کہ کتنا شمار ہوگا ایسے حساب دانوں کا جو کسی ارادے سے سرشار، ان رقوم کا میزان لگانے پر آمادہ ہوں گے اور آرزومند ہوں گے کہ بیوہ بیوگی کا لباس چھوڑ کر عروسی جوڑا پہن لے ۔

وہ کون سا آسمان ہوگا جس پر کوئی نہ کوئی بادل کا ٹکڑا موجود نہ ہو ۔ اسی طرح حسن بے داغ میں بھی ایک ہلکا سا داغ ہوا کرتا ہے یعنی اس کی ایک ٹانگ دوسری سے چھوٹی تھی ۔ جب چلتی تھی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ نرم رو سمندر پر کشتی ہلکورے کھا رہی ہے ۔

کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے ۔ اسی لیے اس کی شادی کے طلب گار جو ابتک مایوس نہیں ہوئے تھے کہتے تھے کہ یہ لنگ تو دلربا ہے اور اس کے حسن و جمال میں اضافے کا باعث ۔ اس کی ذات میں ہزاروں دلربائیاں موجود تھیں جن کے جلووں کو وہ بآسانی بکھیرتی چلی جاتی تھی ۔ نامراد عشاق کھٹے انگوروں والی لومڑی کی طرح جواباً کہتے ۔

جس لڑکی کے لنگ نہیں ہے
اگر اس سے کبھی کبھار لغزش ہو جائے
اور اس لغزش کو کبھی کبھار کی لغزش نہ کہا جائے
تو آپ خود ہی اس کی لغزشوں کا حساب لگا لیں۔

بہرحال ہماری محبوب ' دانا کے تالی نا ' فیشن کی رانیوں میں سے ایک تھی۔ میں نے اسے فیشن کی واحد رانی اس لیے نہیں کہا کہ اسی شہر میں ' دانا فرانسسکا مرمولی جو ' رہتی تھی جو آرڈر آو سنتیاگو کے نائٹ ' دان پے دررودی اندرید ' کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی۔ اس کا خاوند لی آموز کے نوابوں کے خاندان سے تھا۔

دانا فرانسسکا مختلف انداز کی عورت تھی۔ اس کی رنگت ہمارے نجات دہندہ مسیح کی سی سانولی تھی اور اگرچہ وہ ' دانا کے تالی نا ' جتنی نوعمر نہیں تھی۔ مگر خوبصورتی اور لباس کے فیشن میں اس سے کسی طرح کم نہ تھی کہ ان دونوں کے لباس اور دوسرے ملبوساتی لوازمات پیرس میں نہیں لائما میں تیار ہوتے تھے جو اندنوں فیشن کی دنیا میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتا تھا۔

دانا فرانسسکا پوتوسی کے کان کن کی بیٹی تھی اور شادی کے وقت جہیز میں پچاس ہزار پیسو لائی تھی پھر بھی بعض اس کے باپ کو دوسروں کے مقابلے میں کنجوس کہتے تھے اور وقائع نگار ' مارتی نیز ویلا ' کا کہنا ہے کہ جب یہی دوسرے اپنی لڑکیوں کو ایسے ہسپانوی شریف زادوں سے بیاہنا چاہتے تھے۔ جن کے بدن پہ چھیتڑا بھی نہ ہوتا تھا مگر ہوتے تھے عالی نسب تو اک اک لڑکی کو دو دو یا تین تین لاکھ دے ڈالتے تھے۔ کان کنوں کی بڑی آرزو یہی تھی کہ انھیں اپنی لڑکیوں کے لیے ایسے بر ہاتھ آئیں جو آسٹریاز اور گالسیا کے خطاب یافتہ ہوں اور جن کی شرافت ان کے انتہائی عالی نسب ہونے پر مبنی ہو۔

شیطان کہ جس کا کام ہر پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانا ہے، سمجھ گیا تھا کہ یہ بات ' دانا فرانسسکا ' کے کان میں پہنچ گئی ہے کہ اس کا خاوند ان لاتعداد نکھٹوں میں شامل ہے جو

بیوہ کے شہد کے برتن پر بھنبھناتی ہیں اور کتاب کے کیڑے کی طرح حسد کے کیڑے نے اس کا دل چاٹنا شروع کر دیا۔ چونکہ میں دیانت دار قصہ گو واقع ہوا ہوں اس لیے حقیقت کی خاطر یہ لکھے دیتا ہوں کہ اس نے اندر بد کے احتجاج پر ذرا کان نہ دھرا۔

شروع شروع میں تو ان کی رقابت ظاہر بینی تک محدود رہی کہ تعیش میں کون کس سے بڑھا ہوا ہے مگر شہر کی مسلسل افسانہ طرازیوں اور ریشہ دوانیوں نے آخر کار دشمنیوں کا بند پورے طور پر توڑ ڈالا۔ دانا فرانسسکا' کے گول کمرے میں " کانوجا" کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور اگر دانا کے "تالی نا' کی نشست گاہ میں" پانچا" کا تذکرہ ہو رہا تھا تو ناشائستگی پر کوئی قدغن نہیں تھی۔

یہ تھی صورت حال ۱۶۱۶ کی خیراتی جمعرات کے دن۔

سان فرانسسکو کا گرجا بڑی شان سے سج رہا تھا اور وہاں عبادت گزاری کے لیے چوکی سا کا طبقۂ امرا جمع تھا۔ مصائب مسیح کی تمثیل کا جلوس تھا جس میں دو سین پیش کیے گئے تھے۔ ایک "آخری کھانے" کے متعلق تھا اور دوسرے میں دکھایا گیا تھا کہ یہودی مسیح کو سولی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اس میں یہودی سرخ خام سروں کے ساتھ منہ میں لہسن کی پوتھیاں بیے تھے اور عدالت کے سانولے چہروں والے منظورِ نظر ساتھ ساتھ تھے اور قدرتی طور پر تمثیل میں انہی کا حصہ نمایاں تھا۔

ہماری دونوں ہیروئین جنگلے کے ساتھ جھکی ہوئی تھیں جو تابوت گاہ کے حفاظتی کٹہرے کا کام بھی دے رہا تھا۔ دن کے تین بجے تھے۔ دونوں نے اک دوسرے کو سر سے پیر تک دیکھنا شروع کیا۔ نظریں کھنچے خنجر تھیں۔ پھر کھانسیوں اور تحقیر آمیز مسکراہٹوں کا پشتہ ٹوٹ پڑا۔ انھوں نے زور سے آگے بڑھنا شروع کر دیا اور بہانہ یہ تھا کہ اپنی محافظ عورتوں سے سرگوشیوں میں باتیں کرنی ہیں۔

آخر دانا فرانسسکا' نے بھرپور حملہ کرنے کی ٹھان لی اور زور سے یوں بولی گویا اپنی محافظہ

سے مخاطب ہے: "یہ جو سنہری بالوں والیاں ہیں انھیں اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ وہ یہودیوں کی نسل سے ہیں اور اسی لیے اس قدر فریب کار ہیں۔"

'دانا کے تالی نا' اس حملے کا جواب دیے بغیر کیوں خموش رہتی۔" اور ان دوغلوں کو بھی اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ وہ یہودیوں کی اس جماعت کی نسل سے ہیں جو مسیح کو سولی کی طرف لے گئی تھی اور اسی لیے ان کا منہ بھی ان کی روح کی طرح سیاہ ہے۔"

"بہتر یہی ہے کہ یہ ہونق پھوہڑ لنگڑی اپنی زبان کو قابو میں رکھے کہ کوئی بھی خاتون اس سے بات کرنے کی خاطر اپنے آپ کو پست کرنے کے لیے تیار نہیں۔"

تو، میرے معبود! کیا کہا آپ نے، لنگڑی! اولیاؤں کی پناہ! بیوہ نے سکارف گرا دیا۔ ناخن بے نیام کر دیے اور اپنے مدمقابل پر پل پڑی۔ حریف نے سکون سے حملے کو برداشت کیا اور 'دانا کے تالی نا' کے گرد بازو حمائل کر دیے۔ وہ متوازن نہ رہ سکی اور اوندھے منہ گر پڑی۔ پھر اس نے آناً فاناً اپنا ننھا سلیپر اتارا، اپنے مغلوب حریف کے سایا کو اوپر اٹھایا اور عریاں سطح مرتفع کے دیدارِ عام کی دعوت دیتے ہوئے چٹاخ پٹاخ سلیپر جڑ دیئے!

"یہ لے سورنی اور یہ اور یہ۔ اب سبق تو مل گیا اپنے سے برتر کے ساتھ گستاخی کرنے کا۔"

یہ سب کچھ آنکھ جھپکتے میں ہوا اور عبادت گزاروں کے مجمع میں اک شور اک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ عورتیں ارد گرد جمع ہو گئیں اور وہ کڑکڑاک تھی کہ مرغیوں کا ڈربہ بھی پناہ مانگے۔ آخر کار دونوں مقابلہ زن حریفوں کے دوستوں نے بڑی مشکل کے ساتھ ان کو ایک دوسرے سے الگ کیا، اور 'دانا کے تالی نا' کو ایک طرف لے گئے۔

کوئی رویا چلایا نہیں۔ کسی کو غش نہیں آیا، لیکن بے عزتیاں تھیں کہ بس ہونے میں نہ آتی تھیں۔ اس سے تو مجھے یہی ثابت ہوتا ہے کہ چوکی ساکا کی عورتیں بڑی جگر دار واقع ہوئی ہیں۔

اس اثنا میں مردوں کو وقوعہ کا علم ہو گیا اور گرجے کے باب داخلہ پر وہ اپنی اپنی ہمدردیوں کے لحاظ سے دو گروہوں میں بٹ گئے۔ سنہری بال والیوں کو ترجیح دینے والوں

کی قطعی اکثریت تھی۔

دانا فرانسسکا کو ان کی جانب سے انتقامی کارروائی کا ڈر تھا۔ رات کے آٹھ بجے تک اسے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر کار اس کا خاوند چند افسروں کی معیت میں، آرڈر آف مالٹا کے نائیٹ، صدر بلدیہ، دان رافے ایل اور تردی سوتومیئر کو لیے آیا کہ بیوی کو ان کی محافظت میں گھر لے جائے۔

ابھی وہ پلازا میئر کے قریب پہنچے ہوں گے کہ دونوں کے ہوا۔ خواہوں میں تلواروں کی جھنکار اور لڑائی کے شور نے صدر کو مجبور کر دیا کہ وہ خاتون کو وہیں چھوڑ کر اپنے سپاہیوں کے ساتھ قیامِ امن کی خاطر جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہو جائے۔

ہر ایک چوک کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ دانا فرانسسکا اپنے خاوند کے بازو پر جھکی ہوئی تھی اور سخت مشکل سے چل رہی تھی۔

ہر طرف شور برپا تھا۔ ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایک قدیم امریکی پوری رفتار کے ساتھ دوڑتا ہوا آیا اور جب خاتون کے پاس سے گزرا تو اپنے اس ہاتھ کو بلند کیا جس میں استرا پکڑ رکھا تھا اور شپا شپ اس کے چہرے پر ح کا نشان بنا کر گال اور ناک اور ٹھوڑی کو زخم زخم کر دیا۔ رات کی تاریکی، جمِ غفیر اور افراتفری سے فائدہ اٹھا کر ملعون حملہ آور کوفت بھری فضا میں غائب ہو گیا۔

(۲)

حسبِ توقع قانون نے مجرموں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی مگر یہ تو ریت کے تودے میں کوڑی کی تلاش کے مترادف تھا۔ چونکہ خیال یہی تھا کہ 'دانا کے نالی نا' اس جرم کے اشتعال کا باعث ہوئی ہے عید الفصح کی سوموار کو سرکاری وکیل اس کے گھر میں وارد ہو گیا۔ وہ اِدھر اُدھر کی بہت سی باتوں کے بعد اور اپنے مقصد کی معذرت خواہی کے ساتھ جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے آنا پڑا تھا کہ یہ بھی منجملۂ فرائض تھا۔ پوچھنے لگا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے خیراتی جمعرات

کی شب کو 'دانا فرانسسکا مرمولی جو کے گھاؤ لگانے والا کون تھا؟"

وہ بلا تامل بولی "جی سرکار جانتی ہوں اور آپ بھی تو جانتے ہیں۔"

"میں بھی جانتا ہوں، کیا معنی؟" سرکاری وکیل 'دان والین تن تروسی ادز' تاؤ کھا کر مداخلت کرتے ہوئے بولا "آیا آپ اشارۃً یہ کہنا چاہتی ہیں کہ میں بھی اس جرم میں شریک ہوں۔"

'دانا کے تالی نا' نے مسکرا کر کہا "ابھی نہیں۔ میں کوئی یہ تھوڑا ہی کہتی ہوں۔"

"چلیے جی ختم کریں یہ قصہ، خاتون کو زخمی کس نے کیا؟"

"ایک استرے نے۔ جسے کسی شخص کے ہاتھ نے چلایا تھا۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہی ہے۔"

"تو صاحب! مجھے بھی اتنا کچھ ہی معلوم ہے۔"

قانون کی پہنچ یہیں تک تھی۔ اگرچہ 'دانا کے تالی نا' کی شخصیت مشکوک تھی مگر ثبوت کے بغیر اسے مجرم کیسے ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

بہرکیف حریفوں نے تاعمر اس معاملے کو زندہ رکھا اور مجھے تو یقین ہے کہ انھوں نے اسے اپنے پوتوں پڑپوتوں تک منتقل کر ڈالا تھا۔

لا ٹما کی 'کون کو ردیا' رجمنٹ کا کپتان 'دان جو آکین میر یا فے رر' جو بعدہ 'ایس پار تے رو' کی قائم مقامی کے دوران سپین کا وزیر امور خارجہ بھی تھا۔ اپنی دلچسپ کتاب مطبوعہ ۱۸۲۱ء میں اس روایت کی سچائی کی تصدیق تو کرتا ہے مگر واقعہ کہیں بیان نہیں کرتا۔ میرا مبنی برحقیقت خیال یہ ہے کہ بعض لوگ زیرِ نظر مفاد کی نسبت زیادہ اصول کی خاطر قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

'دانا کے تالی نا' اپنے دوستوں اور آس پاس کے گپی ساتھیوں کے سامنے بڑی شیخی سے کہا کرتی تھی۔ "اگر کافوری پولٹس نے ابھی تک ان ضربوں کے نشانوں کو صاف نہیں کر دیا، تو پھر کیا ہوا۔ میرا سایا انھیں ڈھانپ دے گا مگر 'دانا فرانسسکا' اس

بدنما داغ کو کہاں چھپاتی پھرے گی جس نے اس کے چہرے کے حلیے کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے ۔"

اس سارے قصے سے صاف ظاہر ہے کہ چوکی ساکا کی یہ دو خواتین دولڑاکا فاختائیں تھیں ۔

نے ایک اخبار میں وہ تبصرہ دیکھا جو اس کتاب پر لکھا گیا۔ مبصر رقمطراز ہے۔ کہ مجرم سر کٹاتے وقت ایک لفظ بھی زبان پر نہ لایا۔ بہت خوب! لیکن میں نے ایک مجرم دیکھا جو قتل گاہ میں شور مچا رہا تھا۔

فلسفی :۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں بھی کچھ کہوں۔

مرد لاغر :۔ ٹھہریئے! حضرات!! تختۂ دار اور زندان دونوں کو رذوقی اور بدمذاقی کی دلیل ہیں۔ کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مصنف ہمارے مذاق کو خراب اور ہمارے قلب کو صحیح احساسات سے عاری کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جو اپنے تئیں ادیب سمجھتے ہیں۔

میں فرانس کے ادارہ علمیہ کا رکن بننے کیلئے تیار ہوں۔ میرے ساتھ ارگا سطے بھی تیار ہے۔ کیوں ارگا سطے! پھانسی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

ارگا سطے :۔ مجھے اپنی عزت کی قسم! میں اسے ہرگز پڑھنے کیلئے تیار نہیں۔ لوگوں کا خیال ہے۔ کہ اس کتاب کے بعض ابواب کلیسا اور ریاست کے خلاف ہیں۔ اگر میں شاہی وکیل ہوتا تو.............

عسکری :۔ خوب! شاہی وکیل! کیوں جناب پروانۂ آزادی کے متعلق کیا فرماتے ہیں آپ :۔ اور کیا خیال ہے آپ کا آزادیٔ مطبع کے بارے میں۔

اس زمانہ میں ایک شاعر تنسیخ موت پر ایک کتاب لکھتا ہے جس کی ہم سب مخالفت کرتے ہیں۔ آہ! قدیم شخصی حکومت میں ایسی کتاب کیوں کر شائع ہو سکتی۔

تسخیر بیسٹائیل کے بعد ہم اس قسم کی کتب لکھ سکتے ہیں۔ کتابیں بہت خوفناک نقصان پہنچاتی ہیں۔

مرد فربہ :۔ خوفناک! ہم خاموش تھے۔ کسی سطر پر غور نہیں کر رہے تھے۔ یہ سچ ہے

کو ہم فرانس میں گاہے بگاہے ایک آدھ سر تن سے جدا کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ بغیر کسی شور و غوغا کے ہوتا ہے کوئی شخص بھی اس مسئلہ پر غور نہیں کرتا۔ اس کتاب کی اشاعت سے قبل ہم نے ان معاملات پر کبھی غور و فکر نہیں کی۔ لیکن اس کتاب نے ہمارے لئے درد مزید اکر دیا ہے۔

مرد لاغر:۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد جیوری کے اراکین کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔

ارگاسطے:۔ یہ ان کے ضمیر کو تکلیف دیگی۔

مادام: آہ! کتابیں! کتابیں!! ناول کا کس نے ذکر کیا تھا۔

مرثیہ گو:۔ بعض کتابیں ہمارے معاشری نظام کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔

مرد لاغر:۔ جس کو پڑھ کر رومان پسند بغیر سوچے سمجھے انقلاب کرنا چاہتے ہیں۔

مرثیہ گو:۔ ان رومان پسندوں پر غور کیجئے۔

مرد لاغر:۔ کور ذوقی! کور ذوقی!!

ارگاسطے:۔ بالکل صحیح!

فلسفی:۔ اس کتاب میں غیر ممکن الامر واقعات کا تذکرہ ہے۔

ارگاسطے:۔ قابل نفرت ——— قابل حقارت کتاب۔

مادام:۔ اسے نظر آتش مت کیجئے۔ یہ مستعار لی گئی ہے۔

عسکری:۔ ان قصوں کو چھوڑیئے۔ عادات و رسوم سب خراب ہو چکے ہیں۔

مادام:۔ آپ کو ہمارے وقتوں کی یاد باقی ہے کیا؟

عاشق مزاج! ہم عیش پرست تھے۔ ہمارا کام شعر و شراب سے تھا۔ ایم دی للکا سے بہترین ترانہ کس کا ہو سکتا ہے۔ جو اس نے ایک ناچ سے متاثر ہو کر لکھا۔

مرد فربہ:۔ آہ! مسرت بخش ایام!! اب عادات تبدیل ہو چکی ہیں۔ کتابیں ملتی ہیں تو اس قسم کی۔ بولیو کیا خوب لکھتا ہے۔

آرٹ کے انحطاط کے ساتھ تہذیب و تمدن کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے "۔

فلسفی ۔ کیا یہاں جامِ صحت پیا جا سکتا ہے۔

شاعر ۔ ہاں! آہستہ آہستہ۔ }(ہم پیس ہیں)

مرد لاغر ۔ وہ سزائے موت کی تنسیخ کے خواہاں ہیں۔ اور اسی امر کیلئے " پھانسی ایسی خوفناک کتابیں لکھ کر اپنی کور ذوقی کی مثال پیش کرتے ہیں۔

مرد فربہ ۔ میرے اچھے دوست! ہم اس خوفناک کتاب کے متعلق مزید گفتگو کرنے کیلئے تیار نہیں ——— خیر! یہ تو بتلائیے کہ اس آدمی کا کیا حشر ہوا جس کی درخواست ہم نے تین ہفتے پیشتر رد کی تھی۔

مرد لاغر ۔ صبر کیجئے! میں ابھی جاتا ہوں۔ اور واپسی پر اپنے افسر کو لکھونگا۔

"خادم داخل ہوتا ہے:

کھانا حاضر ہے

زنداں

سزائے موت

زنداں کی چار دیواری میں متواتر پانچ ہفتوں سے یہی ہولناک حقیقت میرے لئے سوہانِ روح رہی ہے۔ اسی دہشت ناک خبر نے مجھ تنہا بے یار و مددگار کو دبا رکھا ہے۔

کبھی وہ بھی دن تھا جب کہ میں بھی آپ ہی کی طرح تھا۔ میرا دل جس میں ہر طرح کے ولولے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ مناظرِ فطرت کا متلاشی تھا جب کہ ہر ساعت میرے لئے مژدہ لاتی۔ اور ننھی ننھی دوشیزگان کی یاد میرے دل میں چٹکیاں لیتی جبکہ میں اُن حسن کی دیویوں کے ساتھ چھٹکی ہوئی چاندنی میں شاہ بلوط کے گھنے درختوں کی اوٹ میں گلگشت کرتا —— جبکہ میں آزاد تھا۔

مگر اب قید و بند میں ہوں۔ آہنی زنجیروں سے جکڑا ہوا تنگ و تار کوٹھڑی میں بے بال و پر پرندہ کی طرح اسیر کیا گیا ہوں۔ یہ تو ہے جسمانی قید۔ مگر میرے خیالات بھی اسی طرح مقید ہیں۔ صرف .... اور صرف ایک خیال —— ہیبت ناک عجیب ہے۔ اور ناقابلِ برداشت خیال مجھ پر پوری طرح مسلط ہے۔ جس کی خوفناک یاد ایک گھڑی یا پل کیلئے بھی میرے دل سے محو نہیں ہوتی جس کی صحت کا مجھے کامل یقین ہے۔ یعنی سزائے موت .... آہ!

اس کا نام لیتے ہی میری رگوں میں خون منجمد ہو جاتا ہے۔ میں ہزار اپنا دل بہلاؤں اس کے بہلانے کیلئے اپنی آنکھیں بند کر لوں۔ مگر اس خیال —— اس حقیقت نفس الامری کے دو ورق ایسے ہاتھ مجھے پھر اسی وحشتناک حالت میں لے آتے ہیں بکھیرے

نیچے کسی بدروح یا بھوت کی طرح پڑا ہوا ہے۔ اگر خوش قسمتی سے کسی دن آنکھ لگ جاتی ہے۔ تو یہ کمبخت ڈراؤنی اور خون سرد کر دینے والی خوابوں میں خنجر کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

میں ابھی ابھی ایک دہشت خیز خواب دیکھ کر بیدار ہوا ہوں۔ میں نے اپنے دل کو ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔ حوصلہ رکھو۔ یہ تو محض خواب تھا۔

لیکن میری خواب آلودہ آنکھوں کے سامنے خوفناک حقیقت میرا منہ چڑا رہی ہے مجھے اپنی قسمت کا فیصلہ آنکھوں کے سامنے نظر آ رہا ہے۔ قیدخانے کی زرد اور مرطوب دیواریں۔ اندھی سی لالٹین کی مدھم شعاعیں ——— لوہے کے بھاری بھرکم دروازے جیل کے سنتری کی خوفناک صورت ——— میرے کپڑوں کی ہیئت کذائی کیا اس گھناؤنی حقیقت کی پر زور تائید نہیں کر رہی ہے۔؟

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ جو مجھے سزائے موت ایسا لرزہ خیز پیغام دے رہی ہے۔

(۲)

اگست قریب الاختتام تھا۔ موسم سہانا اور خوشگوار

میرا مقدمہ تین یوم تک عدالت میں پیش ہوتا رہا۔ ہر روز کمرہ عدالت تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا جیسے کسی مرگ پر لوگ ماتم پرسی کرنے آئے ہوں ان تین ایام میں منصف، وکیل، گواہ اور افسر ہر روز میری مصیبت زدہ آنکھوں کے سامنے گذرتے رہے میری دھندلی اور نحیف آنکھیں اس نظارہ کی تاب نہ لا سکیں خوف وہراس کے مارے میں نے دو دلکش راتیں آنکھوں ہی میں کاٹیں۔ مگر آخر انسان تھا تین دن کی متواتر ذہنی کوفت اور ماندگی نے مجھے مردہ سا کر دیا تھا۔ لہذا نیند نے اس نیند سے جو مجھے ہفتوں سے نصیب نہ ہوئی تھی سلا دیا۔

میں ابھی اس غفلت کی نیند سے بیدار نہ ہوا تھا۔ کہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے مجھے بلا بھیجا خفیف آہٹ آج سے پہلے مجھے گہرے خیالات سے چونکا کر دیتی تھی۔ مگر آج محافظ کے لوہے کے بوٹ کی بھاری آواز — آہنی بنچوں کی لرزہ خیز جھنجھناہٹ بھاری بھرکم دروازے کی خوفناک رگڑ مجھے اس بیہوشی سے خبردار نہ کر سکی اچانک میں نے اپنے کندھوں پر کوئی سخت سا ہاتھ محسوس کیا۔ اور کانوں میں کسی شخص کو درشت لہجہ میں پکارتے ہوئے سُنا۔

"اٹھو! تمہیں بلایا ہے۔ انہوں نے"

میں نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اور تنکوں کے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا جیل کے محافظ کی ڈراؤنی شکل میرے سامنے تھی۔

سامنے والی کھڑکی سے میں نے باہر دھندلی سی روشنی دیکھی۔ دن چڑھ گیا تھا۔ اور یہ روشنی سورج کی تھی۔ آہ! مجھے پھر ایک دفعہ دن کی روشنی دیکھنے کی کتنی تمنا ہے۔!!

"موسم خوب سہانا ہے۔" میں نے محافظ سے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ خاموش رہا۔ شائد اس لئے کہ وہ مجھ بدبخت کی خاطر اپنی زبان سے لفظ نکالنا اس کو بے فائدہ ضائع کرنا سمجھتا تھا۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد ایسے کہ جیسے اس کی ضمیر نے ملامت کی ہو وہ بولا۔

"بہت خوشگوار ہے"

میں بے حس و حرکت سورج کی ان مدھم شعاعوں کی طرف حریفانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جو میرے قفس کی چھت پر آزادانہ کھیل رہی تھیں۔

"کیسا پیارا دن ہے۔" میں نے پھر محافظ سے کہا۔

"درست ہے"۔ مگر وہ تمہیں بلا رہے ہیں۔

ان الفاظ نے مجھے میری اصلی حالت سے خبردار کر کے خوف و ہراس کے اُسی تنگ و تاریک اور عمیق گڑھے میں پھینک دیا۔ تب میں نے اپنے دماغ میں عدالت کی کرسیوں پر ججوں کو شاہانہ لباس پہنے ہوئے دیکھا۔ وہ میری طرف گھور رہے تھے۔ یہ جیوری کے ارکان تھے جن کے ہاتھوں میں میری قسمت کا فیصلہ تھا۔ جب میں سو رہا تھا۔ وہ میری قسمت کا فیصلہ مرتب کرنے میں مصروف رہے میں اُٹھا۔ مگر میری ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ جسم کا ہر عضو ارتعاش پذیر تھا۔ گرتے گرتے بچا۔ مگر قہر درویش برجان درویش۔ محافظ جیل کے ساتھ ہو لیا دروازے کے باہر دو اور سپاہی کھڑے تھے۔ ان سب کی معیت میں عدالت کی طرف روانہ ہوا آسمان نکھرا ہوا تھا۔ سورج کی شعاعیں بلند و دوکشوں سے چھن چھن کر مختلف سمتوں پر پڑ کر اس منظر میں عجب دلفریبی پیدا کر رہی تھیں ——————

خوب پیارا دن تھا۔

ہم کو عدالت میں داخل ہوئے۔ میری آمد پر ہال عجیب غریب آوازوں سے گونج اٹھا۔ تمام لوگوں کی توجہ کا مرکز صرف میں ہی بدنصیب تھا۔ ہر طرف سے میری جانب انگلیاں اُٹھا رہی تھیں۔ یہ نظارہ میرے دل و دماغ پر نشتر کا کام دے رہا تھا میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ تو ہال پر پوری خاموشی چھا گئی۔ یہ دیکھ کر میرے دل کو بھی قدرے تسکین ہوئی اس وقت تک میں نے یہ بھی نہ سوچا۔ کہ میں یہاں اپنی قسمت کا فیصلہ لینے آیا ہوں۔ اگر خیال آیا بھی تو میں اس سے خوفزدہ نہ ہوا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں تازہ ہوا ہال میں بھر رہی تھی۔ ساتھ کے بازار سے لوگوں کے چلنے پھرنے کی آواز —— خوشی کے قہقہے اچھی طرح سے سنے جاتے تھے۔ سامنے جیوری کے ارکین بیٹھے تھے۔ مگر ان کے بشرے سے تو ایسا معلوم نہ ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی کی موت کا فیصلہ سنانے والے ہیں

جب کہ میرے ارد گرد ایسا تسلی بخش ماحول تھا۔ تو پھر میں کسی ہولناک خیال سے کیوں ڈرتا۔ اگر میرے دل میں اس وقت کوئی خواہش تھی۔ تو صرف ایک آزادی کی ———— امید کی آخری کرن اب میرے دل میں نمودار ہو چکی تھی۔ اور میں اپنے فیصلہ کا ایک ایک لفظ سننے کیلئے تیار تھا۔ اب مجھ میں ایک بلا کی طاقت بدرجہ اتم موجود تھی اسی اثنا میں میرا وکیل جس کی غیر حاضری سے ابھی تک کارروائی رکی ہوئی تھی نمودار ہوا۔ اور میرے قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ کر میری طرف جھکا۔ اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "کچھ فکر نہ کرو مجھے امید ہے۔ کہ خدا بہتر کریگا"

میں نے بھی اسے اسی انداز میں جواب دیا۔ یقیناً"

"مجھے ابھی تک ان کے فیصلہ کے متعلق کچھ علم نہیں۔ تاہم میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ وہ سزائے موت نہیں دیں گے۔ اب صرف حبس دوام کی بات ہے"

"آپ کا کیا مطلب جناب! میں تو موت کو ایسی ذلیل زندگی پر ترجیح دونگا" میں نے وکیل سے طیش میں آکر کہا۔

موت! ہاں موت! مجھے یہ کہنے میں کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ سزائے موت تو آدھی رات کے وقت خوفناک ہال میں جس میں کہ گندی شمعیں جل رہی ہوں۔ اور موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ سنائی جا سکتی ہے۔ مگر اس خوبصورت ہال میں اگست کے پر کیف مہینے میں آج ایسے خوشگوار اور سہانے دن اور ایسی شریف جیوری کے ہوتے ہوئے کیا سزائے موت سنائی جائیگی؟ نہیں! ہرگز نہیں یہ خیال کرتے وقت میری آنکھیں سورج کی منور صورت دیکھنے کو ترس رہی تھیں۔

اتنے میں ریڈر نے کھڑے ہو کر میرا فیصلہ جو کہ جیوری نے میرے سوتے وقت مرتب کیا تھا۔ سنانا شروع کیا۔ میرے تمام جسم میں خوف و ہراس کی سرد لہر دوڑ گئی میں نے دیوار کا سہارا لے لیا۔ تا کہ زمین پر نہ گر پڑوں کیونکہ اب میری طاقت

جواب دے چکی تھی۔

"کیا آپ کو اس بارے میں کچھ کہنا ہے کہ کیوں نہ یہ سزا ملزم کو دی جائے"۔
صاحب صدر نے میرے وکیل سے دریافت کیا۔

مجھے بہت کچھ کہنا تھا۔ مگر میری زبان تالو سے چمٹ گئی۔ میں ایک حرف بھی زبان سے نہ نکال سکا۔

میرا وکیل کچھ کہنے کیلئے اٹھا۔ غالباً وہ میری سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرانے کی ناکام سعی کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا۔ کہ اس کو روک دوں اور بھری عدالت میں پکار کر کہہ دوں "مجھے ہزار بار موت پسند ہے۔ میں عمر قید کیلئے سجدہ سائی کرنا نہیں چاہتا"۔ مگر یہ الفاظ میری زبان پر آ کر رہ گئے۔
میں اپنے وکیل کا بازو پکڑ کر خفیف آواز میں صرف اتنا کہہ سکا "جانے دیجئے"۔

جیوری نے میرے وکیل کی سفارش پر کوئی کان نہ دھرا۔ بلکہ دوسرے کمرے میں تھوڑی دیر ٹھہر کر پھر واپس آئے۔ اور میری موت کا فتوےٰ سنا دیا۔

"سزائے موت"! ہجوم نے چلا کر کہا۔

میں نیم بیہوشی کی حالت میں ہجوم سے نکل کر باہر آیا۔ میرے اندر ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ سزائے موت کا حکم سنائے جانے سے پیشتر میں اوروں کی طرح ہوش و حواس میں تھا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ مجھ میں اور دنیا میں اب ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ دھلا ہوا آسمان وہی اونچے اونچے دو دکش وہی خوبصورت روشنی جو اس سے چند ساعت پیشتر میرے لئے موجب فرحت تھی۔ اب باعث اذیت ہے۔ وہی دلخوش کن سماں بھیانک، زرد اور خوفناک جو آدمی میرے پاس سے گذر رہے تھے غول بیابانی معلوم ہوتے تھے۔ سیڑھیوں کے نیچے قیدخانہ کی مہیب اور ڈراونی گاڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ دو نو عمر لڑکیاں

میری طرف غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے خوشی سے تالی بجاتے ہوئے کہا۔
"باجی! اس آدمی کو چھ ہفتہ کے بعد پھانسی دی جائیگی۔ ہم بھی دیکھیں گے خوب تماشا ہوگا۔"

(۳)

منزلِ موت!! کیا ہوا! کیا دنیا فانی نہیں؟ کیا ہر شخص کے لئے موت یقینی امر نہیں! تو پھر خوفزدہ ہونا کیا معنی!

میری موت کا حکم سنانے سے اب تک کیا ان اشخاص کی اموات نہیں ہو چکیں جو زندگی کو عزیز جانتے تھے!

کیا نوجوان۔ تندرست اور آزاد انسان نہیں مر چکے جو میرا سر قلم ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔

کیا اور شخص موت کے شکار نہ ہوں گے جو کہ اب تازہ ہوا میں آزادانہ چلتے پھرتے ہیں۔

تو پھر زندہ رہنے سے مجھے کیا مل جائیگا جو میں اپنی موت پر اظہار افسوس کروں۔ اگر زندہ رہوں۔ تو سوائے اس کے کہ محافظ کا ہر روز منحوس چہرہ دیکھوں ریت ملی ہوئی روٹی کو پانی جیسے شوربے سے زہر مار کروں جیل کے افسروں سے دھتکارا جاؤں۔ کسی ایسے شخص سے نہ مل سکوں جس کے دل میں مجھ سے بدبخت کا تھوڑا سا درد بھی ہوتا اور کہیں اس سے میں اپنا دکھ نہ بٹا لوں۔ اور کیا ہو سکتا ایسی زندگی سے ـــــ ذلیل اور ناپاک زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہے۔
آہ ایا یہ زندگی ناقابل برداشت اور ہولناک ہے!

(۴)

قید خانے کی سیاہ ماتمی اور منحوس گاڑی مجھے اس زندان میں لے آئی جس

ہیں کہ اب اپنی زندگی کے قلیل ایام بسر کر رہا ہوں۔

دور سے اگر دیکھو۔ تو یہ ایک عالیشان اور شاہی عمارت معلوم ہوتی ہے
لیکن جوں جوں آپ نزدیک آتے جائیں گے۔ آپ کو افسوسناک حقیقت معلوم
ہوتی جائے گی۔ اور شاہی عمارت ایک بدنما کھنڈر میں تبدیل ہو جائیگی جس
کی کھڑکیوں میں شیشے کی بجائے آپ کو لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں جڑی ہوئی
نظر آئیں گی جن کے پیچھے آپ کو مجرموں کے بھیانک اور مردار چہرے نظر آئینگے
یہ زندگی ہے۔ زندگی — جو موت کا بھیس بدل کر پھر رہی ہے۔

(۵)

اس جیل میں منتقل ہوتے ہی مجھ پر بہت سی پابندیاں عاید کر دی گئیں کھانے
کیساتھ چھری اور کانٹے آنے بند ہو گئے۔ پہلا لباس اتروا کر چھوٹی قمیض پہننے
کے لئے دی گئی صرف اسی خیال سے کہ میں خودکشی نہ کر لوں جیل کے محافظ
اب میری زندگی کے ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ میرا سر قلم کرنے کے لئے میری صحت اور زندگی لازمی ہے
پہلے دو تین دنوں میں انہوں نے ہر طرح میرے آرام و آسائش کا خیال کیا۔
میرے ساتھ تہذیب یافتہ شخص ایسا سلوک کرتے مگر مجھے یہ ظاہرداریاں بہت
بری معلوم ہو رہی تھیں۔ میں خوب جانتا تھا۔ کہ یہ سب میرے سر کو کٹنے کے وقت تک
محفوظ رکھنے کی خاطر کیا جا رہا ہے۔ ورنہ پھانسی کی کوٹھری کا محافظ دوسرے حصوں میں
جلاد اور ایسی نرمیاں! خوش قسمتی سے ان دنوں میں ایسی چاپلوسی سے مانوس ہو گیا ہوں۔
اور جیل کے پادری نے مجھے ہفتہ میں ایک بار دوسرے قیدیوں کی معیت میں باہر جانے
کی اجازت بھی دیدی ہے۔ لکھنے کا متعلقہ سامان بھی بڑی سوچ بچار کے بعد اب
مہیا کر دیا گیا ہے۔ ہر اتوار کو دوسرے قیدیوں کیساتھ جیل کے صحن میں ٹہلتا ہوں
وہ بدبخت بہت اچھے آدمی ہیں۔ مجھے اپنی اپنی کہانیاں سناتے ہیں۔ مگر

ان کی سرگذشت میرے لئے بھلا کیا دلچسپی رکھ سکتی ہے میرے لئے جسکی موت تھوڑے عرصہ بعد واقع ہونی ہو میرے لئے جس کے سر کو تھوڑے دنوں بعد دوسرے کا کھونا بننا ہو۔ وہ گاتے ہیں راگ الاپتے ہیں۔ راگ غلیظ راگ جن کو سنکر میری ایسی حالت ہوتی ہے جیسے کوئی گرد و غبار سے لٹا ہوا قالین میری ناک کے قریب جھاڑ رہا ہو۔ لیکن باایں ہمہ وہ مجھے رحم کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

مجھے محافظ اور دار ڈر سے بغض و عناد نہیں۔ لیکن پھر بھی وہ میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں ہنستے ہیں۔ گویا میں ان کے لئے نئی چیز ہوں چڑیا گھر کا عجیب جانور۔

(۶)

جب تحریر کے تمام ذرائع مجھے میسر ہیں تو کیا وجہ ہے۔ کہ اپنے افکار و حوادث کو صفحۂ قرطاس پر نہ لاؤں لیکن مجھے کس موضوع پر قلم اٹھانا چاہیئے؟

جبکہ جیل کی چار دیواری کے اندر میری مقید میری حد نظر دیوار سے اس پار نہیں جا سکتی میری نگاہیں نیلگوں آسمان کا تماشا نہیں کرسکتیں میرے ذہن میں ہمیشہ اور ہر وقت ایک ہی خیال موجزن ہے۔ موت کا خیال جب صورت یہ ہے۔ تو مجھے کیا لکھنا چاہئے مجھے اس دنیا سے کوئی سروکار نہیں ہیں اذیت رساں ذہن کے احساسات کو صفحۂ قرطاس پر کیوں کر لا سکوں گا؟

کیوں نہیں! اگر میرا ماحول پرسکون اور خاموش ہے۔ تو کیا میرے دل میں درد ہے میرے ذہن میں ہیجان ہے میری روح بیتاب ہے۔ میں جیتی جاگتی المناک داستاں ہوں۔ کیا یہی ایک خیال مجھے میری داستان حیات بیان کرنے میں محرک نہیں ہوسکتا یہ خیال تو مقررہ وقت کو قریب سے قریب تر آتے دیکھ کر مزید تقویت پکڑتا ہے یقیناً تمام سامان مہیا ہے۔ میری زندگی مختصر سہی۔ تاہم وہ ایک انسان کی

برائے حسرت داستان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے ناکافی نہیں۔ مصائب و نوائب میں مرنا سی صورت میں نمایاں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ کہ میں اپنے زخم پنہاں کو ہویدا کردوں۔ میں اپنی ذہنی ہیجان کی تصویر کو انسانیت کے سامنے پیش کردوں شاید ایسا کرنے سے میری تکالیف کی رفتار سست ہو جائے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ میں جو کچھ لکھونگا۔ وہ بے سود نہ ہوگا۔ میں اپنی مشکلات کی تکلیف دہ داستان اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک مکمل کرنے کی کوشش کردوں گا۔ اگر یہ غیر مکمل بھی رہ گئی۔ تو کیا یہ حکایت سبق آموز ثابت نہ ہوگی!

اس شخص کی ذہنی کیفیت، روحانی اذیت جسے موت کی سزا کا حکم سنایا جا چکا ہو۔ ان افراد کیلئے بھی جنہوں نے سزائے موت کا فتویٰ صادر کیا۔ سبق نہ ہوگا شاید اس حکایت کے تاثرات سے وہ مجرموں کی جانچ پڑتال نام نہاد ترازوے عدل میں صحیح طور پر کر سکیں شاید وہ بتدریج ارتقائے مصائب کا بغور مطالعہ نہیں کرتے جب وہ اپنی عدالت سے کسی مجرم کے خلاف موت کا حکم نافذ کرتے ہیں جب وہ کسی مجرم کو سزا دیتے ہیں۔ تو اسوقت وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں کہ وہ جس شخص کی زندگی کا خاتمہ کرنیوالے ہیں۔ اسکے اندر ایک غیر فانی روح موجود ہے جو موت کی دسترس سے بالاتر ہے۔ جنکے پیش نظر سوائے عدل و انصاف کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ مجرم کی اندرونی و بیرونی کیفیت سے بے پرواہ رہتے ہیں۔

یہ کاغذات انہیں اس حقیقت سے آگاہ کردیں گے۔ شائع ہونیکے بعد میرے خیالات ان کے دماغوں کی عنان توجہ اپنی طرف منعطف کرائیں گے۔ وہ انسانی جسم کو خاک میں ملاکر اپنی کامرانی کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ ذہنی پستی کی عیاں مثل جسمانی اذیت ذہنی تکلیف کے مقابلہ پر کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

وہ دن آنے والا ہے جب میرے سوانح حیات لوگوں کو......

اگر میری زندگی کے بعد تیز ہوا ان کاغذات کو صداقت میں نے آخری یا یہ کاغذات

محافظ کے کمرہ کی بدنما کھڑکیوں پر چسپیاں ہو کر ابر و باراں سے ضائع ہو گئے۔

(۷)

فرض کر لیا جائے۔ کہ میری داستان زندان ایک روز دوسروں کیلئے مفید ثابت ہو ـــــ ججوں کو سزائے موت کا فتوٰی دیتے وقت کپکپی پیدا کر دے۔ مجرموں اور بے گناہوں دونوں کو اس مصیبت سے جس میں کہ میں ان دنوں گرفتار ہوں۔ بچالے تو مجھے اس سے کیا فائدہ ؟ جب کہ میرا سر تیز دھار چھرے سے کاٹا جا چکا ہوگا۔ میں کسی خاموش قبرستان میں منوں مٹی تلے سو رہا ہونگا تو مجھے کیا ؟ میری طرف سے وہ ہزاروں کی جانیں لیں۔ لاکھوں کے سر قلم کریں۔ میں تو اسوقت اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا ہونگا۔ کیا میں نے مقتل کی اس جگہ کو جس جگہ کہ میرے جسم کا خون بہیگا۔ اُٹھنے کی ناکام سعی کا خیال کیا ہے ؟ جبکہ سورج کی زندگی بخش روشنی۔ بہار کا سہانا موسم ہرے بھرے کھیت۔ پرندوں کا چہچہانا نیلگوں آسمان۔ لا ینے درخت۔ برسات کی کالی کالی گھٹائیں۔ قدرت کی نیرنگیاں۔ زندگی اور موت میرے لئے نہ ہوگی۔ نہیں ! نہیں ! یہ سب کچھ میرے لئے ہے۔ میں زندہ رہونگا زندہ رہنے کی کوشش کروں گا۔

یہ ضروری ہے۔ کہ میں ضرور موت کے گھاٹ اتار دیا جاؤں گا ؟ آہ ! میرے پروردگار ! اس خیال کے آتے ہی دیوار سے سر پھوڑنے کو جی چاہتا ہے۔

(۸)

اب مجھے یہ سوچنا چاہیے۔ کہ میری زندگی اور موت کے درمیان کے روز باقی ہیں۔ تین دن سزائے موت کے حکم کے بعد ملزم کو رحم کی درخواست کیلئے ملتے ہیں ایک ہفتہ کاغذات کی جانچ پڑتال کیلئے ـــــ دو ہفتہ وہ کاغذات وزیر کی میز پر فضول پڑے رہتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا۔ کہ وہ کاغذ میں کس بارے

میں بحالانکہ مقدمہ کی تمام کارروائی اس کے پاس اسلئے بھیجی جاتی ہے۔ کہ وہ اس کا مطالعہ کر کے ان پر اپنی طرف سے رائے لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیجدے ——
دو ہفتے اس حکم کی نظر ثانی کرنے میں صرف ہوتے ہیں تاکہ کہیں کسی سے بے انصافی نہ ہو جائے ——————

اس کے بعد شاہی عدالت کا اجلاس منعقد ہوتا ہے جس میں وہ عموماً ان تمام درخواستوں کو رد کر دیتے ہیں۔ جو ان کی خدمت میں رحم کیلئے گذاری گئیں ——
وہ ان ردی کاغذات کو وزیر کے پاس بھیجدیتے ہیں جو فوری عملدرآمد کیلئے انہیں جلاد کے سپرد کر دیتا ہے۔

اب صرف تین دن باقی رہ گئے ——————————

چوتھے دن سرکاری وکیل اپنے دل میں کہتا ہے۔ "اس معاملہ کا جلد خاتمہ ہونا چاہئے چنانچہ اس کے حکم سے اسی صبح بازار کے چوک میں پھانسی دینے کا چبوترہ تیار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ راہ گزروں کے لئے خونیں چبوترہ بہت دلچسپی پیدا کر دیتا ہے —————— اس کے بنتے وقت بہت سے تماشائی اس کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں۔

کل چھ ہفتے ہوئے! زندگی اور موت کے درمیان صرف چھ ہفتے!! اس بھولی لڑکی کا اندازہ بالکل درست تھا!

(۹)

میں نے آج اپنی وصیت مرتب کر لی ہے۔ فضول ہے! میری تمام جائداد تو وکیل کے اخراجات بھی پورے نہ کر سکے گی پھانسی! پھانسی!! بھی کتنی گراں ہے۔ میرے پسماندگان میں صرف ماں - بیوی اور بچہ ہونگے۔
ایک ننھی سی لڑکی تین سال کی معصوم بچی۔ جب میں نے اسے چھوڑا تھا، تو

وہ ابھی دو سال اور ایک ماہ کی تھی۔

چنانچہ میری موت کے بعد والدہ اپنا لڑکا، بیوی اپنا خاوند اور لڑکی اپنا باپ کھو بیٹھے گی۔ تین عورتیں مختلف شکلوں میں یتیم ہو جائیں گی۔

مجھے اپنی والدہ کا اتنا غم نہیں وہ بیچاری عمر رسیدہ ہے۔ اس دردناک واقعہ کی تاب نہ لا سکیگی۔ مر جائیگی۔ غم و اندوہ کی پردرد تکالیف سے نجات پالیگی نہ مجھے اپنی بیوی کا ہی فکر ہے۔ وہ پہلے ہی سے صاحب فراش ہے یہ واقعہ اس کے عقل و ہوش کو چھین لے گا۔ میری یاد پھر اسے نہ ستائیگی۔

اگر فکر ہے تو اپنی ننھی معصوم بچی کا اس بھولی بھالی سی میری کا جو اس وقت بھی اس ہونے والے حادثہ جانکاہ سے بے خبر گھر میں کھیل رہی ہوگی جس کے کان برائی کے لفظوں سے نا آشنا ہیں۔

آہ اصرف اُسکی یاد مجھے بزدل بنائے گی۔

(۱۰)

میری تنگ و تاریک کوٹھڑی کا نقشہ بھی لگے ہاتھوں ملاحظہ ہو یہ جگہ آٹھ مربع فٹ ہے۔ اس کی دیواریں سیمنٹ اور بجری سے کوٹی ہوئی ہیں۔ ایک کونے میں تھوڑی سی گھاس پڑی ہوئی ہے۔ یہ بدنصیب قیدی کے سونے کی جگہ ہے خواہ کڑ ملکے کی سردی ہو یا جون اگر گرمی قیدی کو اسی جگہ بغیر کسی اوڑھنی کے سونا پڑتا ہے۔ میرے سر کے اوپر پتھر کی بنی ہوئی چھت ہے اور بجائے پردوں کے اس میں مکڑیوں کے جالے لٹک رہے ہیں۔

کھڑکیوں اور روشندانوں سے یہ کمرہ محروم ہے سامنے بڑا سا آہنی دروازہ ہے جسکی شکل دیکھتے ہی بدن پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔

نہیں! نہیں میں غلطی پر ہوں۔ دروازے کے اوپر ایک چھوٹا سا سوراخ

ہے۔ رات کے وقت یہ بھی احتیاطاً بند کر دیا جاتا ہے۔

یہ اُن غاروں یعنی کمروں کی تفصیل ہے جن میں میرے جیسے بدنصیب جنہیں سزائے موت کا حکم مل چکا ہو مقید ہیں۔

دن ہو یا رات۔ میرے کمرے کے باہر ہر وقت سنتری پہرہ دیتا ہے جب کبھی بھی اس طرف نگاہیں اٹھتی ہیں۔ اسی سنتری کا منحوس چہرہ نظر آتا ہے۔ جب دیکھو مجھے بڑی بڑی آنکھیں نکالے گھور رہا ہے۔

(۱۱)

رات کی سیاہی نے میری کوٹھڑی میں اندھیرا کر دیا تھا۔ آہ! مجھے دن کی روشنی کتنی پسند ہے۔

بیٹھے بیٹھے یہی خیال آیا۔ کہ کیوں نہ اپنی کوٹھڑی کی دیواروں کا جائزہ لوں اب وہی منحوس محافظ مجھے اندھی سی لالٹین دے گیا تھا۔

لالٹین لے کر اٹھا تو دور ہی سے دیواروں پر بہت سی عبارتیں لکھی ہوئی معلوم ہوئیں۔ ان کے لکھنے میں کوئلہ پنسل اور کھڑیا مٹی استعمال کی گئی تھی معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہر اس بدنصیب شخص نے جو اس کوٹھڑی میں چند دن رہ گیا تھا۔ اپنی یادگار ان نقطوں میں چھوڑنی چاہی تھی۔

میرے بستر کے اوپر دو آتشیں دل بنے ہوئے ہیں جن میں ایک تیر پیوست ہے۔ ان کے نیچے "او بدنصیب! تیری زندگی کے دن بہت تھوڑے ہیں۔" لکھا ہوا ہے۔ اور بہت سے دہکتے ہوئے دل۔ بہت غمناک اور دردناک عبارتیں سامنے دیوار پر ایک آزادی کا جھنڈا بنا ہوا ہے اس کے نیچے ملک کے ایک جان نثار کا نام کھدا ہوا ہے۔

آہ! میرے اللہ! میں نے تو سچ مچ خون بہایا تھا۔ قتل کیا تھا مگر اس

نے قوم اور وطن کی فلاح کیلئے قدم اٹھایا ۔ پھانسی دیدی گئی ۔ اس کے لئے بھی وہی خوفناک سزا تجویز کی گئی ۔ یہ ظلم ہے ۔ سراسر ظلم ہے

مجھ سے اب کچھ نہیں دیکھا جا سکتا ۔ کیونکہ میں نے ابھی ابھی اسی دیوار پر پھانسی کے چبوترہ کی شکل بنی ہوئی دیکھی ہے ۔ کیسی ہیبتناک ، ڈراونی اور مہیب شکل ہے ۔ اسی چبوترہ کی شکل جو میرے لئے بھی اس وقت تیار ہو رہا ہوگا ۔ ٹانگیں کانپ رہی ہیں طاقت جواب دے چکی ہے ۔ آہ ! آہ ! لالٹین میرے ہاتھ سے گر رہی ہے ۔ بھاسنا احد کیلئے ذرا مجھے تھامنا !

(۱۲)

تنکوں کے بستر پر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد میرا خوف و ہراس دور ہو گیا ۔ اور نامعلوم طاقت مجھے پھر دیواروں کی طرف لے گئی میں نے پھر اپنی خوفناک عبارتوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا ۔ دیوار کے کونے میں مکڑیوں کے جالے تلے مجھے کچھ لکھا ہوا سا نظر آیا ۔ میں نے اس جالے کو ہاتھ سے پونچھ دیا ۔ اس کے نیچے مجھے پانچ نام نظر آئے ہیں ان کے لکھنے والوں کو اچھی طرح جانتا ہوں ۔ ان میں پہلا شخص وہ تھا جس نے اپنے بھائی کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کا سر نالی میں اور باقی کا دھڑ دریا میں پھینک دیا تھا ۔

دوسرا قیدی ایک حکیم تھا جس نے اپنے دوست کو زہر دیدیا تھا اور اس کا علاج کرتے وقت دوا دینے کی بجائے اسے زہر پلا دیا تھا

تیسرا ایک دیوانہ تھا خوفناک دیوانہ جو چھوٹے بچوں کو چاقو کی ایک ضرب سے ہی ہلاک کر دیا کرتا تھا ۔

جب یہ خیال آیا کہ وہ سب کسی زمانے میں اسی کوٹھری میں موجود تھے تو میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا ۔

لیکن اب تو وہ جیل کے ملحقہ قبرستان میں خاموشی سے سو رہے تھے مجھے بھی ان کے ساتھ تھوڑے سے دنوں بعد جا ملنا ہے۔ میں تو ہمات کا قائل نہیں ہوں لیکن پھر بھی ان اشخاص کے حالات نے مجھ پر عجب کیفیت طاری کر دی میرے جسم کی حرارت تیز ہو گئی۔

میں ابھی ان پر قیاس آرائی ہی کر رہا تھا۔ کہ ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ نام جو اس تھوڑی دیر پیشتر پینسل کے لکھے ہوئے تھے۔ آگ کی طرح دہک رہے ہیں۔ ہر ایک لفظ ایک شعلہ معلوم ہوتا تھا جو میری طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا میرے کانوں میں عجیب عجیب آوازیں آنی شروع ہوئیں جو کہ تیزی کے ساتھ شور و غل میں بدل گئیں آنکھوں میں سے چنگاریاں نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

اب مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ میرا کمرہ آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ بالکل ناآشنا ہستیوں سے ہر ایک اپنا سر ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہے جس میں سے لہو کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ اب مجھ سے زیادہ نہ دیکھا جا سکا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ مگر ایسا کرنے سے وہ ہیبت ناک نظارہ اور بھی صاف دکھائی دینے لگا۔

خواب، واہمہ حقیقت جو کچھ بھی ہو۔ مگر اس وقت تو وہ مجھے پاگل بنا رہی تھی میں گرنے کے قریب تھا۔ کہ میں نے کسی ٹھنڈی سی چیز کو اپنے پاؤں پر سرکتے دیکھا یہ مکڑی تھی جو کہ اس جالے سے گر پڑی تھی۔ اس واقعہ نے ان خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرے آوارہ اوسان پھر مجتمع ہو گئے۔

"معدوم۔ معدوم بڑی حفاظت سے اب زمین میں مدفون ا—— —— مرقد —— در و دیوار سے بے نیاز جیل.........

یہ کہہ کر میں نے اپنے تئیں تسلی دی۔

(۱۳)

طلوع آفتاب کے ساتھ جیل میں بھی ہنگامہ شروع ہوا. مجھے بھاری بھرکم آہنی دروازوں کے بند اور کھلنے کی آواز آئی قیدی ایک دوسرے سے ہمکلام تھے. میری ہمسائے قیدی بھی غیر معمولی طور پر مسرور تھے. جیل میں بہت زیادہ رونق تھی. ہر طرف خوشی خوشی نظر آتی تھی. تمام قیدیوں کے چہروں پر انبساط کے جذبات ہویدا تھے. صرف میں خاموش تھا. میں اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں سکوت سے اس تماشا کو دیکھ رہا تھا.

محافظ جیل میرے پاس سے گزرا. میں نے جرأت سے دریافت کیا. "کیا جیل میں کسی جشن کی تیاری ہو رہی ہے؟"

"جشن؟ ہاں! اگر تم اسے یہ نام دے سکو. آج کے دن عمر قیدیوں کو طوق و سلاسل میں جکڑا جائیگا. کیونکہ انہیں کل طویوں جانا ہے. کیا تم انہیں دیکھنا چاہتے ہو؟ یہ نظارہ میرے خیال میں تمہارے لئے باعثِ راحت ہوگا."

محافظ نے جواب دیا."

ایک تباہ شدہ اور واژگوں بخت انسان جسے تنہائی میں مقید رکھا ہو. اس کے نزدیک بدترین قسم کا اجتماع بھی قابل دید ہوتا ہے. میں نے محافظ کی دعوت کو قبول کر لیا.

محافظ مجھے با احتیاط تمام ایک خالی کمرے میں لے گیا. کمرہ میں صرف ایک کھڑکی تھی - اس کھڑکی سے انسان بیرونی حالات و واقعات کا بآسانی مطالعہ کرسکتا ہے. محافظ نے مجھے اس کمرہ میں بیٹھ کر قیدیوں کا تماشا دیکھنے کیلئے کہا

"تم اکیلے یہاں بادشاہ کی مانند مزے لو"

یہ کہتے ہوئے وہ کمرہ سے باہر چلا گیا - اور باہر سے قفل لگا دیا گیا.

کھڑکی کے سامنے ایک بلند عمارت ہے جس کی چار دیواری سے رنج و الم ٹپک رہا ہے۔ انسان اسے دیکھتے ہی خائف و ہراساں ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ تکلیف دہ منظر انسانی چشم نہیں دیکھ سکتی اس عمارت میں انسانی روحیں مقید کر رکھی ہیں آج کے دن کے تمام قیدی اپنے قیدی ...... بھائیوں کا تماشا دیکھنے کیلئے باہر آئے ہوئے ہیں .... ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مجروح روحوں نے دوزخ کی طرف ٹکٹکی لگا رکھی ہے !!

قیدی خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف تک رہے تھے۔ ان میں سے ایک دو کی چشمہائے شعلہ بار ان کی اندرونی کیفیات کو ظاہر کر رہی تھیں بارہ بجے سب سے بڑا دروازہ کھلا ایک بہت بڑی گاڑی اندر داخل ہوئی جس پر مسلح سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ گاڑی عمر قیدیوں کے لئے تھی۔

اسی اثنا میں طوتوں جانے والے قیدی فوجی ضبط میں باہر نظر آئے ان کے دیکھتے ہی دوسرے قیدیوں نے شور مچانا شروع کیا۔

محافظوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ تمام قیدیوں کو بیڑیاں پہنائی گئیں قیدیوں نے ان آہنی زنجیروں کو بخوشی قبول کیا۔ اور کوئی لیس وپیش نہ کی۔ ہر دلعزیز قیدیوں کو رخصت کے وقت ادب سے سلام کیا گیا جس کا جواب وہ نہایت متانت اور خندہ پیشانی سے دیتے رہے۔

اسی اثنا میں طبی معائنہ کیلئے ڈاکٹر آدھمکے۔ ان کی آمد پر قیدیوں نے آخری مرتبہ ناکام سعی کی۔ کہ وہ طوتوں نہ جاسکیں۔ بعض نے خرابی صحت کا بہانہ تراشا اور بعض نے آنکھ، پیٹ یا ٹانگ میں درد کا عذر پیش کیا لیکن ڈاکٹروں کے سامنے ان کی ایکسپیرینس نہ چل سکی۔ قہر درویش برجان درویش قیدیوں کو ان کے آہنی حکم کے آگے سر جھکا دینا پڑا۔

اب قیدیوں کو نیم برہنہ کر دیا گیا۔ تاکہ طوقوں کے لئے انہیں مخصوص لباس پہنا دیا جائے۔ قیدیوں کے اجسام کا برہنہ ہونا تھا۔ کہ سرد ہوا زور سے چلنی شروع ہوئی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سرد ہوا بھی آمادۂ انتقام ہے۔ بارش بھی خوب زور سے ہونے لگی۔

غریب قیدی کانپ رہے تھے۔ لیکن ان کی تکلیف کی کوئی پروا نہ کی گئی۔ اور ان کو مخصوص لباس پہنا دیا گیا۔ اور گردنوں میں آہنی کالر لٹکا دیئے گئے۔

کاروان جرائم روانہ ہو چکا تھا۔ میں تنہا کھڑکی میں بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ ان کی نگاہوں نے میری طرف رُخ کیا۔

"مجرم، قاتل، مستحق موت" سب نے یک زبان ہو کر کہا میں حیران و سراسیمہ تھا۔ کیا وہ میری طرف مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے؟

"الوداع شب بخیر" کہتے ہوئے سب آگے نکل گئے۔ ایک نوجوان قیدی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ خوش قسمت ہے۔ کیونکہ عنقریب اس کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ "شب بخیر رفیق من" میں کھڑکی میں بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ طولوں جانے والے قیدیوں کا پانچواں گروہ میری کھڑکی کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

آہنی زنجیروں کی آواز سے میرا قلب لرز رہا تھا مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوج شیاطین میری طرف بڑھتی آ رہی ہے۔ میں زور سے چیخا

اب مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں انسانی کھوپڑیوں میں گھرا ہوا ہوں اس خیال کی دہشت نے میرے قلب کے اندر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی میں نے ایک دو چیخ ماری اور بیہوش ہو گیا۔

---

(۱۴)

جب میں ہوش میں آیا۔ تو اپنے تئیں ایک بستر پر لیٹا ہوا پایا۔ سقفی لیمپ کی مدھم روشنی میں میں نے بستروں کو قطار در قطار دیکھا۔ تو اندازہ لگایا کہ میں دارالشفا میں ہوں۔ میں چند لمحات تک جاگتا رہا۔ میں غور و فکر سے محروم تھا۔ یقیناً چند ایام پیشتر زنداں کا یہی دارالشفا، میرے لئے ہلاکت اور رنج خاطر کا سرچشمہ ثابت ہوتا۔

بستر اس قدر گندہ تھا۔ کہ تعفن سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ بہت معمولی قسم کے کمبل تھے۔ تاہم میں نے محسوس کیا۔ کہ میرے اعضا کے درد میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ میں پھر سو گیا۔

اگلے روز بہت بڑے شور و غوغا نے مجھے خواب سے بیدار کیا۔ کیونکہ میرا بستر کھڑکی کے قریب تھا۔ اس لئے چیخ و پکار کا سبب تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ یہاں سے تقریباً تمام جیل کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ طولوں جانیوالے قیدیوں کو چھکڑوں میں سوار کیا جا رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے ان کے کپڑے تر بتر ہو رہے تھے۔ اور وہ سردی کے مارے اپنے گھٹنوں کو اندر کی طرف کئے ہوئے تھے۔ ان کی بڑی بڑی داڑھیاں بارش سے تر ہو چکی تھیں حسرت و یاس کا مرقع بنے ہوئے کانپ رہے تھے جولائی کے لباس میں ستمبر کی سردی کا مقابلہ کر رہے تھے۔

محافظ سپاہی عصاء کے آزادانہ استعمال سے ضبط و نظم کو قائم کئے ہوئے تھے۔ بے کس و لاچار قیدی! ان کی آنکھوں میں آتش انتقام کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں یہ تھی ان کی انتہا!

میرے وکیل نے مجھے کیسی رائے دی تھی! اُف میرے اللہ!!

موت ہزار بار بہتر ہے۔ اس زندگی سے ــــــ عمر بھر اسیری سے اس جہنمی زندگی سے! موت اعلیٰ و ارفع ہے۔ آہ!!

(۱۵)

بدقسمتی سے میں اب تندرست تھا۔ اس لئے مجبوراً مجھے ہسپتال کو خیرباد کہنا پڑا۔ اب وہی منحوس کوٹھڑی تھی۔ اور اس کی مرطوب دیواریں۔

تندرست ہوں! یقیناً تندرست ہوں۔ اس لئے کہ نوجوان ہوں مضبوط ہوں، خون میری رگوں میں آزادانہ گردش کرتا ہے۔ میرے طاقتور بازو میری اطاعت کرتے ہیں۔ میرا جسم زیادہ عمر تک چلنے کے لئے بنا ہوا ہے۔ آہ لیکن وہ نہیں جانتے کہ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے مجھے ایک روگ ہے۔ بیماری ہے جو مجھے روز بروز دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ یہ بیماری مجھے اپنے بھائیوں سے عطا ہوئی۔

جس دن ہسپتال سے خارج ہو کر اس منحوس چار دیواری میں آیا ہوں ایک خیال ہر وقت ستاتا ہے۔ خیال جو مجھے دیوانہ بنائے دیتا ہے، وہ یہ ہے۔ کہ اگر میں کچھ دن اور وہاں قیام کرتا تو...... شاید فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا!!

ان حکیموں، تیمارداروں اور نوکروں کی نظروں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ میری جوانی کو رحم کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ان کی سرد آہیں۔ اُن کا ازراہ شفقت میرا ہاتھ دبانا کیا اس پر دال نہیں ہے؟

کتنا تعجب ہے کہ وہ لوگ انسان کو بخار کی تکلیف سے تو بچا سکتے ہیں لیکن پھانسی کے حکم سے نہیں بچا سکتے جب کہ ان کیلئے ایسا کرنا بالکل آسان ہے۔ صرف نماز کھول لینے سے ایک بدقسمت انسان کی جان بچ سکتی ہے صرف ایک نسواز کھول لینے!! اب میرے لئے تمام دروازے بند ہیں موت سے بچنے کے لئے کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر رحم کی درخواست گزاروں، تو وہ مسترد کر دی جائیگی کیونکہ میں بالکل درست تھا میرے خلاف پختہ ثبوت موجود تھے گواہوں کے بیان صحیح پر مبنی تھے لیا اگر ما سرے دقوق سے حماقت ہے!!

کاش میں رحم کی درخواست منظور کرانے میں کامیاب ہو جاؤں مگر کس سے اور کس بنا پر! اور کون فریق ہے!

جب یہ سوچتا ہوں۔ تو اُن سب کے جواب میں مجھے پھانسی کے چبوترے کا نقشہ آنکھوں کے سامنے نظر آجاتا ہے۔

اب میرے لئے صرف دو چیزیں باقی ہیں۔

اس منحوس کوٹھڑی میں چند روزہ قیام ——— گلا کاٹنے کا چبوترہ۔

(۱۶)

میں نے دار الشفاء کا تمام وقت کھڑکی میں بیٹھ کر گذار دیا۔ موسم تبدیل ہو چکا تھا۔ اور آفتاب کی جان بخش شعاعیں میرے لئے کسی حد تک لطف اندوز ثابت ہو رہی تھیں۔ اپنا بھاری سر ہاتھوں میں لئے کہنیوں کو گھٹنوں پر ٹیکے پاؤں کو کرسی کے بازوؤں پر رکھے حسرت و یاس کی جیتی جاگتی تصویر نظر آرہا تھا۔ زندان کا خیال مجھے رہ رہ کر ستا رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ گویا میرے اعضاء میں طاقت ہی نہیں۔ کانوں میں ابھی تک ان قیدیوں کی زنجیروں کی آواز گونج رہی تھی۔

اس وقت میری انتہائی خواہش یہ تھی۔ کہ ریاض ہستی کا باغبان کسی خوش الحان طائر کو میرے بالمقابل کمرہ کے بام پر لا بٹھائے۔

میری دعا قبول ہو گئی جونہی میری زبان سے یہ الفاظ نکلے میں نے اپنی کھڑکی کے نیچے کسی کی صدا سنی ہوش ربا سی۔ یہ نغمہ کسی طائر کا نہ تھا۔ بلکہ کسی آتش نفس مغنیہ کا راگ تھا۔ جو درد ناک ترنم میں اس کو گا رہی تھی۔

میں نے اپنے سر کو اٹھایا۔ تاکہ گانا سن سکوں۔ راگ فضا کو حسرت و الم کے جذبات سے لبریز کر رہا تھا۔

میں نے بلند شاہ بلوط کو کاٹا
مجھے شعلوں پر لوٹنے کیلئے کہا گیا

میں نے انسانی زندگی کا خاتمہ کیا
مجھے زنداں میں پھینک دیا گیا

میری رگ رگ نے حیات سے التجا کی
خدا نے اسے نامنظور کر دیا

مجھے ایسے کمرے میں ناچ کرنا ہے
جو در و دیوار ، سقف و فرش سے عاری ہو

....

مجھے تختۂ دار پر لٹکنا ہے۔

میں اب کچھ نہ سُن سکا۔

زنداں! آہ زنداں۔ بدترین مسکن ، ذلیل ترین جاہ پناہ

جیل اپنی حد نظر تک کی اشیاء کو زہر آلود بنا دیتی ہے۔ یہاں ہر خوبصورت چیز اپنی اصلیت اور حقیقت زائل کر لیتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک حسینہ کا آتشیں نغمہ بھی اور زنداں میں تمہاری نظر کسی ابر ندی پر پڑے تو وہ بھی پر و بال بریدہ ہوگا۔ اگر تم کسی خوشبودار پھول کو سونگھو تو اس میں تمہیں زہر کی خاصیتیں نظر آئیں گی ؛

(۱۷)

گر جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں تو کس طرح میں ہرے بھرے کھیتوں میں دوڑتا پھروں گا۔

" نہیں، نہیں مجھے دوڑنا نہیں چاہئے۔ اس طرح تو لوگ مجھ پر شک کریں گے جیل سے بھاگا ہوا قیدی سمجھیں گے۔ میں آہستہ آہستہ سر جھکا کر چلوں گا۔ ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی سیٹی بھی بجاتا جاؤنگا اس طرح مجھے کوئی نہ پہچان سکے گا۔

جیل سے نکلتے ہی میں جیل کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں رات ہونے تک پناہ لوں گا۔ وہ جگہ بہت محفوظ ہے۔ کسی زمانے میں اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں مینڈک پکڑنے آیا کرتا تھا۔

جب پوری طرح تاریکی مسلط ہو جائیگی۔ تو میں وہاں سے نکل کر سیدھا انگلستان کی راہ لوں گا۔

ایک سپاہی میرے پاس گزر رہا ہے۔ اس نے مجھ سے پروانہ راہداری طلب کیا ہے۔ آہ! میرے پروردگار!! میں تباہ ہو گیا۔

او۔ ہوا میں قلعہ بنانے والے پہلے اپنی منحوس کوٹھری کی تین فٹ چوڑی پتھر کی دیوار کو توڑ۔ آہ! نا امیدی!! موت!!! بھیانک موت!!!

مجھے یاد ہے کہ میں اس وقت ایک کم عمر بچہ تھا جب میرا والد مجھے جیل کی دیوار دکھلانے لایا تھا۔ مگر کسے معلوم تھا کہ میں اسی لوہے، اسی چار دیواری میں اس بے سرو سامانی کی حالت میں قید کر دیا جاؤں گا۔ آہ!!!

(۱۸)

میں ابھی یہ کہہ رہا تھا۔ کہ میری لالٹین کی روشنی مدھم پڑ گئی۔ دن کی روشنی اس روشنی پر غالب آگئی تھی۔ مگر گھر کی گھڑی کی مدھم آواز چھ بجنے کا پتہ دے رہی تھی۔

دروازہ کھلا۔ محافظ جیل اندر داخل ہوا۔ ٹوپی اتار کر سلام کرتے ہوئے اس نے میرے تخلیہ میں مخل ہونے کی معافی چاہی۔ وہ میرا ہر روز ناشتہ لے کر آتا

مگر آج!

آج اس کے بستر سے کچھ اور ہی ہویدا تھا۔

اپنی کرخت آواز کو ملائم بناتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا چیز کھانا پسند کروں گا۔ اس کا کہنا تھا۔ کہ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی —— کیا وہ —— وہ خوفناک واقعہ کل پیش آنے والا ہے؟

(۱۹)

ایسا نرم سلوک صرف ایک دن کے لیئے ہے۔

جیل کا گورنر خود مجھے ملنے آیا۔ اس نے میرے آرام و آسائش کیلئے محافظ جیل کو کچھ ہدایات دیں۔ اس نے مجھ سے یہ بھی دریافت کیا۔ کہیں اس سے ناراض تو نہ تھا۔ بھلا مجھے اس سے کوئی شکایت تو نہ تھی۔

شکایت اور مجھے؟ —— جس کی زندگی اور موت کے درمیان صرف چند گھنٹوں کا فاصلہ ہے۔ قریب المرگ انسان کو کسی سے کوئی شکایت ہو سکتی ہے۔

واپس جاتے ہوئے اس نے بڑے ادب سے "جناب" کہا۔

میں اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ ایسا نرم سلوک صرف ایک دن کے لیئے ہے

(۲۰)

محافظ جیل خیال کرتا ہے۔ کہ مجھے اس سے اور اس کے ہم پیشہ لوگوں سے شکایت نہیں۔ وہ درست خیال کرتا ہے۔

اُن کے بارے میں کچھ شکایت کرنی سراسر بے وقوفی ہے۔ کیونکہ انہوں نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔

وہ میری جان کی حفاظت کرتے رہے ہیں۔ کیا مجھے ان کا شکر گزار نہ ہونا چاہیئے؟

لیکن محافظ، اس کے ملائم الفاظ اور خوشامدانہ لہجہ رکھتے ہوئے بھی میری نظروں

میں جیل کی کوٹھڑی سے کم نہیں۔

میرے گرد ونواح کی سب چیزیں مختلف اشکال میں زندان ہیں۔ یہ دیوار پتھر کا قید خانہ ہے، یہ دروازہ لکڑی کا جیل، قید خانہ! انسان اور چونے پتھر کی عمارت کا مرکب ہے۔ میں اس کا شکار ہوں۔ اس نے مجھے اپنی دیواروں میں قید کر لیا ہے۔ اس کے قفل مجھے فرار ہونے نہیں دیتے۔ اور یہ محافظ کی تیز بین نگاہوں سے میری حفاظت کرتا ہے۔

آہ! میں بدنصیب تو پہلے ہی اسے ہوں۔ الٰہی! میرا کیا حشر ہوگا۔ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے!!

(۲۱)

اب مجھے کامل سکون حاصل ہو گیا ہے۔ تمام امیدوں کا خاتمہ ہو چکا ہے آج سے پہلے میرے دل میں امید کی آخری کرن باقی تھی۔ سو وہ بھی چلی گئی۔ خدا کا شکر ہے۔ ہزار بار شکر ہے۔ کہ امید کا وہ موہوم خیال جو میرے لئے سوہان روح ہو رہا تھا۔ اب باعث تکلیف نہ ہوگا۔ ساڑھے چھ بجے۔ نہیں! نہیں پونے سات بجے میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک معمر شخص اندر داخل ہوا۔ وہ بڑا سا لبادہ پہنے تھا میں نے اس کے لباس سے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی پادری ہوگا۔

وہ میرے مقابل چارپائی پر بیٹھ گیا مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ اپنی آنکھیں چھت کی طرف اٹھاتے ہوئے۔ اس نے کہا "میرے بچے! کیا تم تیار ہو؟"

"میں بالکل تیار ہوں"۔ یہ کہتے ہی میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ ایک سرد لہر میرے جسم میں سرعت سے دوڑ گئی۔ میری کنپٹیوں کی رگیں پھول گئیں اور کانوں میں شور برپا ہونے لگا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ پادری کچھ کہہ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے لب جنبش کر

تھے۔ اور وہ ہاتھوں سے کچھ اشارے کر رہا تھا۔

کوٹھری کا دروازہ پھر کھلا دو آدمی اور داخل ہوئے ان کے آنے سے میرے پراگندہ اور آوارہ خیالات پھر جمع ہونے شروع ہو گئے میں اب دیکھ اور سُن سکتا تھا۔ ان میں سے ایک جو ہاتھ میں بڑا سا کاغذ پکڑے ہوئے تھا میری طرف آیا اور جھک کر سلام کہنے لگا "جناب میں شاہی دربار کا نقیب ہوں اور حضور کے واسطے سرکاری وکیل کی جانب سے ایک پیغام لایا ہوں"۔

میری بے ہوشی اب بالکل دور ہو گئی تھی "پیغام لائے ہو؟ خیر! اسے میرا سر ابھی ابھی دو رکا ہے کیا یہ مجھے امید ہے۔ کہ میری مرگ سے اُسے بہت خوشی حاصل ہو گی۔ کیوں نہ ہو بیچارے نے اس کی خاطر تھوڑی تکلیف اُٹھائی ہے"۔ یہ کہہ کر میں نے آواز کو اور مضبوط بنایا۔ اور کہا جناب اس پیغام کو پڑھ کر سنا دیجئے۔

اس پر اس نے وہ کاغذ پڑھنا شروع کیا۔ جو شروع سے آخر تک بڑے بڑے لفظوں سے پُر تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا۔ کہ میری درخواست رحم شاہی دربار نے مسترد کر دی ہے۔ اور پھانسی اسی دن عمل میں لائی جائے گی۔

"آپ میرے ساتھ ساڑھے سات بجے تشریف لے جائیں گے کیا؟" اس حکم کو پڑھنے کے بعد مودبانہ لہجہ میں کہا۔

کچھ دیر تک تو میں اس کو بالکل نہ سن سکا۔ کیونکہ جس وقت اس کی آنکھیں کاغذ پڑھنے میں مصروف تھیں۔ اس وقت میں دارو دروازے کی طرف پر امید نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن آہ! بدقسمتی!! ایک نہیں چار سنتری کمرے کے باہر پہرہ دے رہے تھے۔

شاہی ہرکارہ نے پھر وہی سوال دُھرایا تو میں نے آہستگی سے جواب دیا جیسے آپ کی مرضی ہو۔ میں ہر وقت تیار رہوں "

"تو پھر میں نصف گھنٹے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ تیار رہیئے آپ" ہرکارے نے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا:"

وہ سب مجھے تنہا اس منحوس کوٹھری میں چھوڑ کر چلے گئے۔

کاش! میں فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں میرے پروردگار! کوئی ذریعہ مہیا کر دے۔ کہ میں یہاں سے بھاگ نکلوں۔

مجھے فرار کا کوئی نہ کوئی ذریعہ ضرور پیدا کرنا چاہیئے۔ وہ دروازے سے ہو یا چھت سے، کھڑکیوں سے ہو یا زمین سے۔ مگر مجھے یہاں سے بھاگ نکلنا چاہیئے خواہ ایسا کرنے میں مجھے اپنا گوشت ہی قربان کیوں نہ کرنا پڑے۔

ایسا خیال کرنا سراسر بے وقوفی ہے جہالت ہے۔ بہترین ہتھیاروں کی مدد سے بھی اگر اس دیوار کو توڑنے لگیں۔ تو بھی تین ماہ کے عرصہ سے کم کم وقت خرچ ہو گا۔ مگر مجھے جس کے پاس ایک کیل تک نہیں۔ ایک گھنٹہ تک وقت نہیں۔ آہ! ظالم شیطانو!! سفاکو!!! میں پاگل ہو رہا ہوں!!!!

(۲۲)

اب اس جگہ منتقل کر دیا گیا ہوں۔ اب صرف ایک اور صرف ایک چیز باقی ہے یعنی گلا کاٹنے کی مشین دوران انتقال میں جو سفر طے کیا۔ وہ اس قابل ہے۔ کہ صفحہ قرطاس پر لایا جاتے۔

پورے ساڑھے سات بجے سرکاری ہرکارہ دبلائے بے درماں کی طرح نازل ہو کر یوں گویا ہوا۔

"جناب میں حضور کا انتظار کر رہا ہوں"

میں اٹھا اور دروازے کی جانب بڑھا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے میری طاقت بالکل سلب ہو چکی ہے۔ سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ جسم کے تمام اعضاء

بالکل مردوں جیسے تھے دوسرا قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔

مگر میں نے بڑی جرأت سے کام لیکر اپنی زائل شدہ طاقت پر فتح پانے کی کوشش کرتے ہوئے دروازہ کی جانب بڑھنا شروع کیا۔

اس منحوس کوٹھری کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنے سے پیشتر میں نے اس پر آخری نگاہ ڈالی جس میں میری زندگی کا قلیل مگر اہم حصہ گزرا تھا۔ وہ اب بالکل سنسان معلوم ہو رہی تھی —— زنداں کی کوٹھری کیلئے خالی رہنا بھی تعجب سے کم نہ تھا۔ غلام گردش کے اختتام پر ہمیں جیل کا پادری ملا۔ اور ہمارے ساتھ ہولیا۔

زندگی کے درمیانی دروازہ پر ڈاکٹر مجھے بہت محبت و شفقت سے ملا۔ اور خاص میری حفاظت کے لئے چار آدمی متعین کر دیئے دروازے سے گزرتے ہوئے ایک بوڑھا قیدی اپنے پنجرے سے بولا۔ آئندہ ملاقات تک خدا حافظ! کتنی مضحکہ خیز الوداع تھی۔ شاید وہ بوڑھا نہیں جانتا تھا کہ یہ سفر جو میں اب اختیار کر رہا ہوں میرا آخری سفر ہے۔ آئندہ ملاقات عالم بالا میں ہو سکتی ہے۔ اب ہم صحن میں پہنچ گئے جہاں کہ میں آزادانہ طور پر کھلی فضا میں سانس لے سکتا تھا۔ لیکن میں اس فضا سے بہت دیر تک لطف اندوز نہ ہو سکا۔ کیونکہ دروازے کے باہر ہی منحوس گاڑی میرا انتظار کر رہی تھی جس سے ایک دفعہ پہلے بھی میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس متحرک قبر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے صحن پر نگاہ ڈالی —— وہ نگاہ جو کسی اچانک شعبدہ کی طالب تھی۔

میری روانگی پر تماشائیوں کا اچھا خاصا گروہ گاڑی کو حلقہ بنائے ہوئے تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی جو موسم کو اور تند اور سرد بنا رہی ہے۔ ہم سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہرکارہ اور ایک محافظ سامنے والی نشست پر میں پادری اور دوسرا محافظ اس کے مقابل بیٹھے پر اس کے علاوہ چار اور محافظ گاڑی کے پائیدان پر کھڑے تھے کوچوان کو شمار نہ کرتے ہوئے ایک کے مقابلہ میں آٹھ تھے۔ گاڑی خوفناک گڑگڑاہٹ

سے متحرک ہوئی ۔ اور زندان کے بھاری بھرکم دروازے بند ہو گئے
میں اس آدمی کی طرح تھا جو بیہوشی کے عالم میں ہی زندہ در گور کیا جا رہا ہو۔ جو
سن سکتا ہو۔ مگر طاقت گویائی نہ رکھتا ہو۔
گھوڑوں کی گھنٹیوں کی آواز کوچوان کی چابک کی فٹرسٹر اور گاڑی کی گڑگڑاہٹ
مجھے اس خوفناک منظر کی طرف تیزی سے لے جا رہی تھی ۔ میں خدا جانے کن خیالات
میں غرق تھا ۔ کہ اچانک گاڑی نے رخ بدلا ۔ آہنی سلاخوں والی کھڑکی میں باہر کی طرف
جھانکا ۔ تو نوترے ڈیم کے بلند مینار نظر پڑے ۔ جو کہ پیرس کی دھند میں ملبوس مدھم
مدھم سے نظر آ رہے تھے ۔
اس منظر کو دیکھتے کر میرے خیالات یک لخت نوترے ڈیم کی طرف پلٹ پڑے
جو لوگ اس مینار پر موجود ہوں گے ۔ وہ میری گردن اُترنے کا منظر بخوبی دیکھ سکیں گے
میں نے مجنونانہ ہنسی ہنستے ہوئے اپنے آپ سے کہا ۔
اسی وقت پادری نے بھی مجھ سے کچھ کہا ۔ میں نے اُسے اطمینان سے بولنے دیا
کیونکہ میرے کان تو پہلے ہی سے گاڑی کے پہیوں ، کوچوان کی چابک اور گھوڑوں کی
متواتر آوازوں سے پُر تھے ۔ اس لئے پادری کی آواز میرے لئے ان شوروں میں
ایک شور تھی ۔ میں خاموشی سے اس کی سنی ہوئی آواز سنتا رہا ۔ جو میرے احساسات قلب کو
مردہ کر رہی تھی ـــــــــ اس کی وعظ اس ندی کے شور کے مشابہ تھی ۔ جو کسی
ویران جنگل میں بہ رہی ہو ۔ میں نے اس کو سُنا ۔ مگر آہ ! وہی الفاظ وہی عبارت اصنوبر
کے بڑھے اور بڑے ہوئے درختوں کی طرح میرے لئے نئے نہ تھے ۔ میں انہیں کئی
مرتبہ سن چکا تھا ۔ بجائے اثر کرنے کے وہ میرے خیالات کو اور مجروح ، پریشان
اور آوارہ کر رہے تھے ۔
یکایک سرکاری ہرکارہ کی درشت آواز نے مجھے اپنے گہرے خیالات سے چونکا

دیا۔ وہ پادری سے مخاطب ہونا چاہتا تھا۔

"موسیو آپ نے سنی۔ آج کی تازہ خبر؟" اس نے مجسسانہ لہجہ سے کہا۔ پادری چونکہ میرے ساتھ وعظ و نصیحت میں مصروف تھا۔ اس کو نہ سن سکا۔ لہٰذا ہرکارہ نے پھر ایک دفعہ اس سے مخاطب ہو کر کہا:

"مقدس باپ! کیا آپ کو اس تازہ خبر کا علم ہے۔ جس نے آج پیرس بھر کو اپنی طرف متوجہ کیا ہوا ہے۔"

میں سر سے پیر تک کانپ گیا۔ کیا اس خبر کو میرے ساتھ تعلق تھا۔ مجھے بھی تو آج ....
....

"نہیں تو! مجھے صبح کے اخبار دیکھنے کا وقت نہیں ملا۔ شام کو سارے اخبار ایک بار ہی دیکھ لونگا۔" پادری نے آخر کار جواب دیا۔ "جہ خوش! میں کچھ اور عرض کر رہا ہوں جناب۔ آج کی تازہ خبر و مخبر جس نے پیرس بھر کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی ہے۔" ہرکارہ نے اسی انداز سے کہا۔ "میرا خیال ہے۔ مجھے اس کا علم ہے۔" میں نے ہرکارہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہیں؟ کیا واقعی؟ ہاں تو اس معاملہ کی بابت تمہاری کیا رائے ہے؟"

"معاف کیجئے۔ میں کچھ اور سمجھا تھا۔" میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اس خبر کا میرے مجوزہ کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔"

"لیکن تم تو ابھی کہہ رہے تھے۔ کہ تمہیں کسی خبر کا علم ہے۔ ماخوذ کیا ہے؟" ہرکارے نے مجھ سے دریافت کیا۔

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ اپنے کاندھوں کو ہلکی سی جنبش دے کر پھر اپنے خیالات میں غوطہ زن ہو گیا۔

ابھی چند منٹ نہ گزرنے پائے تھے۔ کہ ہرکارہ پھر ایک دفعہ مخاطب ہوا۔ "اللہ

کہنے لگا "کیا سوچ رہے ہو تم؟"

"اپنی قسمت کے فیصلے کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ کہ آج شام کے بعد میں کچھ سوچ نہ سکوں گا"

"یہ بات چھوڑ دو۔ چھوڑو۔ ان خیالات کو موقوف کر دو ورنہ تم تو بہت غمگین ہو رہے ہو۔ نوجوان آدمی! بہادر بنو۔ اور اس کا مردانہ وار مقابلہ کرو ——"

"نوجوان! میں اور نوجوان! بھول رہے ہیں۔ آپ۔ میری عمر آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک ایک منٹ میری عمر میں سال بھر کا اضافہ کر رہا ہے"

"دیکھو! تم مذاق کر رہے ہو۔ میں تمہارے دادا کی عمر کے برابر ہوں"

میں حقیقت عرض کر رہا ہوں مجھے آپ سے مذاق کرنے کی کوئی خواہش نہیں"

"جناب خفا مت ہوں آپ رنجش کو تھوک ڈالئے" اس نے میری سنجیدگی سے متاثر ہو کر کہا۔

وہ رنجش دیر تک قائم نہ رہے گی بخاطر جمع رکھیں" میں نے جواب دیا۔

ہماری گفتگو گاڑی کے اچانک ٹھہر جانے سے بند ہو گئی۔ گاڑی محکمہ چونگی کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ ایک انسپکٹر آیا۔ اور اس کا معائنہ کر کے چلا گیا اگر گاڑی میں ہماری بجائے قربانی کی بھیڑ ہوتی تو وہ یقیناً محصول کی دستبرد سے محفوظ نہ رہتی — گاڑی چل پڑی۔

گرجا گھر کا گھڑیال ساڑھے آٹھ بجا رہا تھا۔ کہ ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے عدالت کی عمارت ہی میری روح قبض کرنے کیلئے کافی تھی۔ مگر میں غیر معمولی جسارت سے کام لیتے ہوئے۔ گاڑی سے اترا۔ اور سپاہیوں کی دو رویہ قطار سے گذرتا ہوا۔ اسی عمارت میں داخل ہو گیا۔

---

(۲۳)

شاہی ہرکارہ کی معیت میں گیلری سے گزرتا ہوا ڈائرکٹر کے کمرے میں پہنچا تو یہ وہ گیلری ہے جس سے صرف وہی اشخاص گذرتے ہیں جن کو سزائے موت جیسا لرزہ خیز حکم سنایا جا چکا ہو۔ دوسرے الفاظ میں جن کا گلا تھوڑے سے عرصہ کے بعد بریدہ کیا جاتا ہو۔ ہرکارہ بحفاظت تمام مجھے ڈائرکٹر کی نگرانی میں چھوڑ گیا اس نے مجھے اپنے ملحقہ کمرے میں بند کر دیا۔ اور باہر سے کمرے کو مقفل کر دیا۔

میں خدا جانے کن خیالات میں مستغرق تھا۔ نہ معلوم اس کمرے میں کتنے عرصہ سے موجود تھا۔ کہ یکایک کسی انسانی قہقہہ نے مجھے اس وارفتگی سے چونکا دیا۔

میں نے فوراً ہی اپنی نگاہیں اٹھائیں تو اس حقیقت سے آشنا ہو گیا۔ کہ میں کمرہ میں اکیلا نہ تھا۔ بلکہ میرے سامنے پچاس ایکسپریس کا متوسط قد آدمی کھڑا میری طرف تیز اور چمکتی ہوئی نگاہوں سے گھور رہا ہے۔

اس کا لباس تار تار ہو رہا تھا۔ جسم بے حد کثیف اور گندہ۔ اس کی موجودہ ہیئت گدائی عجیب گھناؤنا منظر پیش کر رہی تھی۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ میری بے خودی کے عالم میں یہ بدنصیب شخص اس کمرہ میں ٹھونسا گیا تھا ــــ کاش موت کا فرشتہ ہی اس کی جگہ آ گیا ہوتا۔ !!!

ہم تھوڑی تھوڑی دیر کیلئے ایک دوسرے کو غور سے دیکھتے رہے مگر میرا تعجب اور خوف لحظہ بہ لحظہ بڑھتا گیا۔ کیونکہ وہ اس دوران میں پہلے سے زیادہ خوفناک اور شیطانی قہقہے لگا رہا تھا۔

"تم کون ہو"۔ بالآخر میں نے اس سے دریافت کیا۔

"میں! میں وہ شخص ہوں جس کے سر کو آج سے ٹھیک چھ ہفتہ بعد دوسروں کا کھلونا بننا ہے۔ اپنی طرح ہی سمجھو۔ خوش ہونا ہے۔ کہ تمہارا سر چھ گھنٹے کے بعد قلم

ہوگا۔ اور میرا جھ ہفتہ کے بعد"۔ اس بڈھے نے شیطانی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے سرد لہر تمام جسم میں بجلی جیسی سرعت سے دوڑ گئی۔ تو یہ میرا وارث تھا ــــ میری چھوڑی ہوئی کوٹھڑی کا وارث۔

"کوئی فکر مت کرو اپنا تعارف کرائے دیتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے اپنے سوانح حیات سنانے شروع کیے:۔

میں ایک مشہور چور کا بیٹا ہوں۔ بدقسمتی سے ایک دن میرے باپ کو جلاد سے واسطہ پڑ گیا جس نے اسکی گردن کو پھانسی کے پھندے میں دیدیا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے۔ جب کہ خدا کے فضل سے پھانسی کی سزا رائج تھی۔

چھ سال کی عمر میں میں نے اپنے آپ کو بالکل خانماں برباد پایا۔ والد تو اسطرح مر گیا والدہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی متواتر تین سال تک سڑکوں پر بھیک مانگتا رہا۔ مجھے اس غرض کیلئے ننگے پاؤں غلیظ گلیوں میں سفر کرنا پڑتا۔ اور کیچڑ میں گھٹنوں تک گھسنا پڑتا۔ میرے تن پر صرف پھٹے چیتھڑے تھے۔ میری کمزور ٹانگیں پتلون سے بخوبی نظر آسکتی تھیں۔ سردیوں کے دنوں میں اپنا یخ خستہ جسم لوگوں کو دکھاتا۔ لیکن افسوس اس طرح کچھ حاصل نہ ہوا۔

نو سال کی عمر میں یعنی تین سال کے بعد اس پیشہ سے تنگ آکر اٹھائی گیری شروع کی۔ لوگوں کی جیبیں خالی کیں۔ شروع میں بھونڈا پن تھا۔ ایک سال کے بعد میں پورا جیب کترہ بن گیا۔

تب میں نے اپنی واقفیت بڑھانی شروع کی حتے کہ میں سترہ برس کی عمر میں ایک ڈاکو بن گیا۔ اسی زمانہ میں ایک قفل توڑتے وقت گرفتار ہو گیا۔ اور قیدخانہ میں سزا کے ایام بھگتنے لگا۔

کسقدر ذلیل زندگی ہے جیل خانہ کی خالی تختوں پر سونا۔ ریتا ملی ہوئی روٹی زہر مار

گر نیلا اور محافظوں کی چابکیں ننگے بدن پر کھانا۔ ان تکالیف کا وہی اندازہ لگا سکتا ہے جسے اس منحوس جگہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو۔

خیر قہر درویش بجان درویش میں نے اپنی سزا کے پندرہ برس —— اس کا خیال کرتے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اس گھناؤنی جگہ بسر کیئے۔

قید خانہ کو خیر باد کہنے سے پیشتر انہوں نے میری سہولیت کیلئے ایک نقشہ اور پروانہ راہداری دیا۔ اس کے علاوہ مجھے چھیاسٹھ فرانک بھی دیئے گئے جو میری پندرہ سالہ محنت اور مزدوری کا معاوضہ تھے۔ سولہ گھنٹہ فی دن تیس دن فی مہینہ اور بارہ ماہ فی سال عرق ریزی کا معاوضہ!!!

اس منحوس جگہ سے نکلتے ہی میں نے ارادہ کر لیا۔ کہ اب نیک زندگی بسر کرونگا اس قلیل رقم پر ہی اکتفا کرونگا۔ اس وقت ان چیتھڑوں میں ملبوس میرے پہلو میں ایسا دل تھا۔ جو آپ کسی پادری کے لمبے اور شاندار چغے میں نہیں پا سکتے مگر وائے حسرتا! اس زرد رنگ پاسپورٹ کا ستیاناس ہو۔ اس پر رہا شدہ مجرم ایسے خوفناک الفاظ جلی قلم سے لکھے ہوئے تھے۔ جہاں کہیں بھی جاتا۔ یہ منحوس کاغذ میرے نامۂ اعمال کی طرح ہر شخص پر میری شخصیت کو واضح کر دیتا۔ اپنی نوعیت کی ایک سفارش تھی —— "رہا شدہ مجرم" یہ الفاظ ہی لوگوں کو مجھ سے متنفر کرنے کیلئے کافی تھے وہی ہوا جس کی مجھے امید تھی۔ میری شکل سے ہی لوگ خوفزدہ ہونے لگے مجھے دیکھتے ہی بچے ڈر کے مارے بھاگ جاتے۔ لوگ مجھے دیکھتے ہی اپنے دروازے بند کر لیتے۔ یہ حال تھا۔ تو ملازمت کی توقع رکھنا سراسر بے وقوفی تھی۔ وہ قلیل رقم اب بالکل خرچ ہو چکی تھی۔ ہر ایک کو اپنے مضبوط اعضا مزدوری کی توقع پر دکھلائے۔ مگر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے دن بھر کی مزدوری کا معاوضہ مانگا۔ جو کہ اپنے پیسے۔ پانچ پیسے پر کرنی قبول کی

مگر انہوں نے میری فریاد پر کان نہ دھرا۔ اب مرتا کیا نہ کرتا۔ آخر پیٹ پوجا بھی تو ضروری تھی۔

تین دن کی فاقہ کشی سے تنگ آ کر آخر ایک روز نانبائی کی دوکان پر سے روٹی چرانی چاہی مگر نانبائی نے مجھے پکڑ لیا۔ اور پولیس کے حوالے کر دیا۔

کھاتا تو در کنار میں نے روٹی کو چھوا تک بھی نہ تھا۔ مگر عمر بھر کیلئے اسیر کر دیا گیا اور تین حرف میرے کاندھوں پر داغ دیئے گئے۔ چاہو تو دکھا دوں؟

اس اسیری کی صعوبتیں اٹھانے کی طاقت نہ تھی۔ اس لئے یہاں سے بھاگ نکلنے کا تہیہ کر لیا۔ میرے پیش نظر صرف تین دیواریں اور وہ آہنی زنجیریں تھیں۔ میرے پاس صرف ایک کیل تھی۔ مگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا وہاں سے بھاگ نکلا

اب کی دفعہ اس نے دیروانہ راہداری کی لعنت تو نہ تھی۔ مگر پیسہ نام تک کو نہ تھا۔ راستہ میں مجھے چند دوست مل گئے جو سب میری طرح ہی تھے۔ یعنی فرار شدہ۔ اس گروہ نے مجھے دعوت شمولیت دی جسے میں نے قبول کر لیا۔

عرصہ تک ہم لوگوں کے جان و مال پر اپنی شکم پری کیلئے ڈاکہ ڈالتے رہے۔ لیکن اب میں بوڑھا ہو چکا تھا۔ میری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ میری تلاش میں سپاہی مصروف عمل تھے میں جھاڑیوں میں چھپ چھپ کر اپنی جان بچاتا۔ مگر پھر بھی آزاد تھا۔ اپنا آقا آپ تھا۔ اس ذلت آمیز زندگی سے یہ ہنگامی زندگی ہزار درجہ بہتر تھی۔

آخر ہر ایک چیز مٹا فانی ہے وہ دور عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ ایکدن بوڑھا اور ضعیف ہونے کے سبب بھاگ نہ سکا۔ پکڑا گیا۔ اور اب اس جگہ لایا گیا ہوں۔

اس بوڑھے کی کہانی سن کر میں بہت حراسان اور پریشاں ہو گیا۔ وہ اب ہنس رہا ہے۔ نہیں نہیں زور سے قہقہہ لگا رہا ہے۔

اسی اثنا میں وہ میری طرف ہاتھ ملانے کیلئے بڑھا اگر میں یک کرنے کیطرف

ہٹ گیا۔

دوست! تم تو مجھ سے خوفزدہ ہو رہے ہو۔ کہیں الیاس چبوترہ پہ نہ کہنا کاش! میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا۔ خیر ایک ہی بات ہے۔ آج نہیں تو کل سہی لیکن تم میرے دوست نہ بنو گے۔ کیا!۔

"جناب یہ آپ کی عنایت ہے"۔ میں نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔

"اخاہ! آپ تو کوئی مار گوئیس معلوم ہوتے ہیں"۔ اس شیطان نے میرے جواب پر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست! مجھے اپنے حال پر ہی چھوڑ دیں خدا جانے کن خیالات میں غرق ہوں"۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میری سنجیدہ گفتگو نے اس پر کچھ اثر کیا۔ اور وہ کچھ عرصہ تک اپنے گنجے سر کو کھجلاتا رہا۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد پھر گویا ہوا۔

جناب آپ امیر آدمی ہیں۔ آپ کے پاس جو یہ بڑا کوٹ ہے۔ آپ کے کسی مطلب کا نہیں۔ اگر مجھے عنایت کر دیں تو میں اسے تمباکو خریدنے کیلئے بیچ دونگا!!

میں نے اپنا کوٹ اتارا اور اسے دیدیا۔ اس پر وہ بچوں کی طرح ناچنے لگا فرطِ انبساط سے زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔ مگر اچانک میری طرف دیکھ کر بولا۔

"جناب آپ تو کانپ رہے ہیں" یہ کہتے ہوئے اپنی بھدی اونی جیکٹ اتار کر مجھے پہنا دی جو کچھ بھی ہوا بسبب بیخودی کے عالم میں میں دیوار کا سہارا لیکر کھڑا ہو گیا۔ اور اس کی حرکات و سکنات کو بغور معائنہ کرنے لگا۔ وہ میرے کوٹ الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اور پھر ملاحظہ کے بعد خوشی کا نعرہ مارا۔

جیبیں بالکل نئی ہیں۔ کالر بدستور ویسا ہی ہے۔ اسے فروخت کرنے سے کم از کم پندرہ فرانک حاصل ہوں گے سکتا خوش نصیب ہوں چھ ہفتہ تک تمباکو

پینے کے لئے یقین نہیں آتا!"

دروازہ پھر کھلا۔ وہ اب اس لئے آئے تھے۔ کہ مجھے اس کمرہ میں پہنچا دیں جہاں کہ مجرم اپنی زندگی کے چند آخری لمحات گذارتا ہے۔ اور اس بوڑھے کو اس جگہ پہنچائیں جسے میں خیرباد کہہ آیا تھا۔

(۲۴)

وہ بوڑھا بدمعاش مجھ سے بڑا کوٹ چھین کر لے گیا چھین کر اسلئے کہ میں نے اسے وہ برضا و رغبت نہ دیا تھا۔ اس کی بجائے یہ بدنما ادبلا بوڑا چیتھڑا دے گیا۔ ہے جس کی شکل سے ہی مجھے نفرت ہے۔ اس ہئیت کذائی میں لوگ مجھے کیا سمجھیں گے میں نے وہ کوٹ خیرات کے طور پر نہ دیا تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ مجھ سے طاقتور تھا مجھ سے کہیں زور آور تھا۔ اگر میں کوٹ دینے میں پس و پیش کرتا۔ تو وہ یقیناً مجھے کاٹتا میری بوٹیاں نوچ ڈالتا۔ یہ ہے ناتواں اور طاقتور میں فرق۔ آج اُسے ایک موقع مل گیا۔ اور اس نے اس سے فائدہ اٹھا لیا شاید وہ اس سے خوش ہو گیا ہو مگر! مگر! وہ کچھ بھی ہو میں حیران ہوں۔ کہ آخر یہ ذلت میں نے برداشت کس طرح کی۔ اگر وہ اب میرے سامنے آئے۔ تو میں اسے پاؤں تلے روند ڈالوں کھا جاؤں ظالم! سفاک! کمینہ!

میرے دل میں غصہ و انتقام کی لہر دوڑ رہی ہے۔

جیل خانہ خصوصاً سزائے موت ایسا ہیبت ناک خیال آدمی کو چڑچڑا اور غصیل بنا دیتا ہے۔

(۲۵)

مجھے انھوں نے اس بدنما کوٹھڑی میں دھکیل دیا ہے جس کے اندر مجھے سوائے مرطوب دیوار ۔۔۔ یا لوہے کی بڑی بڑی سلاخوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا

میں نے کرسی و میز اور لکھنے کا سامان مانگا۔ وہ مجھے دیدیا گیا۔ مگر جب میں نے بستر کیلئے درخواست کی۔ تو وہ حیران ہو گئے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ مگر بہت غور و خوض کے بعد وہ بستر اور چارپائی لے آئے۔ مگر کیا دیکھتا ہوں۔ کہ بستر کے ساتھ ہی اور شخص بھی چلا آ رہا ہے۔ یہ میری جان کا محافظ ہے انہیں ڈر ہے۔ کہ کہیں میں بستر کی چادر سے اپنا گلا نہ گھونٹ لوں!

(۲۶)

اب دس کا عمل ہے۔

آہ! میری پیاری بچی صرف چھ گھنٹے کا قلیل عرصہ باقی ہے۔ اس کے بعد میں مر جاؤں گا بالکل بے ہوش اور غافل ہوں گا۔ میرا جسم کسی ہسپتال کی ٹھنڈی میز پر پڑا ہو گا۔ ایک فریق کے پاس میرا سر ہو گا۔ اور دوسرے کے پاس میرا دھڑ جس پر بہت بے رحمی سے عمل جراحی کیا جائیگا۔ اور جب وہ کسی کام کا نہ رہیگا۔ تو کسی گڑھے کے سپرد کر دیا جائے گا۔

تیرے والد کے ساتھ یہ حالت ہو گی۔ میری بچی! کیا سنتی ہو۔ تیرے پیارے والد کے ساتھ ایسا بے رحمانہ سلوک کیا جائیگا۔ ان اشخاص کے ہاتھوں سے یہ چیزیں عمل میں آئیں گی جو مجھے رحم کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جن کی میرے ساتھ کوئی عداوت نہیں جو مجھے موت سے بچا سکتے ہیں۔ وہی اب موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں مگر ظلم کر رہے ہیں۔ صرف اس خاطر کہ دوسروں کیلئے تجربہ عبرت ہو۔ آہ! اے خدا بھولی لڑکی! تیرا باپ تجھے جان سے زیادہ عزیز سمجھتا جو تیری ننھی سی سپید گردن کو ہر روز بوسہ دیا کرتا جو بڑے شوق سے تیرے گھنگریلے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کیا کرتا۔ اور جو تجھے اپنے گھٹنوں پر بٹھلا کر تیرے ساتھ پہروں کھیلا کرتا۔ آج کچھ عرصہ کے بعد بیجان ہو گا۔ تو اسے ہمیشہ

کیپنے کھو دے گی۔ اسکی گود سے محروم کر دی جائیگی پھر تیرے لئے یہ سب کچھ کون کریگا؟
تیرے ہم عمر بچوں کے باپ ہوں گے، مگر تو یتیم ہو جائیگی تجھے عید کے تحفے اور خوشنما
کھلونے کون لا دیگا؟ سونے والی یتیم لڑکی! تو بغیر باپ کے کسطرح جی سکے گی۔
آہ! اگر تجھے جیوری کے ارکان ایک دفعہ دیکھ لیتے تو میرے جگر کے ٹکڑے
وہ تیرے ساتھ کبھی اتنا ظلم نہ کرتے۔ وہ سمجھ لیتے کہ تین سالہ معصوم بچی کے باپ
کو مارنا واقعی ظلم ہے
جب میری بڑی ہو جائے گی۔ تو اس کا کیا حال ہو گا؟
اس کے باپ کا نام بچہ بچہ کی زبان پہ ہو گا۔ لوگ اسے قاتل اور مجرم کے نام
سے پکاریں گے جب وہ میری نسبت ایسے دل شکن الفاظ سنے گی۔ تو لازماً میری
سوسائٹی اسے حقارت کی نظروں سے دیکھیگی، صرف میری خاطر۔ اس باپ کی
خاطر جو اسے جان سے زیادہ عزیز جانتا تھا۔ اسے اتنی ذلت برداشت کرنی
پڑیگی۔ آہ! میری پیاری میری! کیا یہ سچ ہے کہ تو میرے نام سے نفرت کریگی۔
میرا نام لیتے وقت شرم محسوس کریگی۔
اُف! کیا یہ سچ ہے۔ کہ مجھے آج شام مرنا ہے۔
کیا وہ بدنصیب شخص میں ہی ہوں؟ کیا یہ شور و غوغا جو اس وقت میرے
کانوں کو سنائی دے رہا ہے ان تماشائیوں کا ہے جو میرا مرقلم ہوتے ہوئے دیکھنا
چاہتے ہیں۔
کیا مجھے ——— جو اس وقت اچھا بھلا کرسی پر بیٹھا ہوں۔ آزادانہ
سانس لے رہا ہوں جس کے کپڑے سامنے لٹک رہے ہیں۔ آج شام کو مر جانا ہے
(۲۷)
مجھے معلوم نہیں کہ یہ چبوترہ کس طرح تیار کیا جاتا ہے۔ اور کس طرح ایک

انسان کو اس پر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ آہ! وہ منظر کتنا خوفناک ہوگا!
اس کا خیال کرتے ہی میری رگوں میں خون منجمد ہو جاتا ہے۔ میں حیران ہوں
کہ میں نے اس کا نام زبان سے کس طرح نکالا جبکہ اس خونی چیز کا نام لیتے ہی جان
ہوا ہو جاتی ہو۔ اور اس کے الفاظ اور اس کی ظاہری شکل ہی انسان کو پاگل بنا دیتی ہو
میں اس کی بابت ایک سوال کرنے کی بھی جرات نہیں رکھتا لیکن یہ سب سے
زیادہ خوفناک ہے۔ کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس تختہ پر میرے ساتھ کیا سلوک
کیا جائیگا۔ سوائے اس کے مجھے اور کچھ علم نہیں۔ کہ میرے ایسے بدقسمت انسانوں کو
پیٹ کے بل اس تختہ پر لٹا دیا جاتا ہے۔ اور ایک تیز دھار چھرا ان کے سر کو ۔۔۔
آہ! اس سے پہلے کہ میرا سر تن سے جدا ہو میرے بال سفید ہو جائیں گے۔

(۳۸)

مجھے اس ہولناک تختہ دار کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک روز میری گاڑی
اس چوک سے گذر رہی تھی۔ کہ یکلخت ٹھہر گئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ تو
مجھے بہت سے آدمیوں کا گروہ نظر پڑا۔ ان کے درمیان دو شخص ایک بڑا سا
چبوترہ بنانے میں مصروف تھے۔ کیونکہ اسی روز ایک مجرم کا گلا کاٹا جانیوالا تھا۔
میں دوسری طرف دیکھنے کیلئے منہ پھیرا۔ ایک عورت کو اپنے بچے سے مصروف
گفتگو پایا۔ دیکھو۔ یہ چھرا ٹھیک کام نہیں کرتا۔ اس لئے اب وہ اسے تیل دے
رہے ہیں۔ تاکہ اس کے گرنے میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو جائے۔
وہ اس وقت اس چھرے کو تیل دے رہے ہوں گے۔ کیونکہ اب گیارہ بج
چکے ہیں۔ اور وقت قریب آرہا ہے۔
آہ! بدنصیب شخص! تو اس چھرے کی ضرب سے اپنا سر نہیں بچا سکتا!!

---

(۲۹)

آہ! معافی!!

شاید وہ مجھے معاف کر دیں۔ بادشاہ کو میرے خلاف کوئی بغض و عناد نہیں میرے وکیل کو تلاش کرو! تو خدا کے لئے جلدی تلاش کرو!!! اس کا مشورہ حق و صداقت پر مبنی تھا مجھے عمر قید کی سزا کو قبول کر لینا چاہیے۔ وہ پانچ سال کیلئے ہو یا بیس سال کے لئے اگر عمر بھر کیلئے بھیجدیا جاؤں تو کیا خوب ہو۔ میری زندگی۔ آہ میری زندگی مجھے واپس دیدو!!۔

"عمر قیدی" چل سکتا ہے۔ گفتگو کر سکتا ہے۔ آفتاب کی جان بخش شعاعوں کو دیکھ سکتا ہے۔

(۳۰)

پادری میرے کمرہ کی طرف آ رہا ہے۔ وہ بہت متین صورت اور نیک شخص ہے۔ ابھی کل صبح کا ذکر ہے۔ کہ میں نے اسے قیدیوں کو خیرات دیتے ہوئے دیکھا مگر کیا وجہ ہے۔ کہ اس کا وعظ میرے دل پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ کیا وجہ ہے۔ کہ اس کے الفاظ مؤثر نہیں ہوتے۔ اس کے وعظ کا ایک لفظ بھی میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جس طرح قیدخانہ کے باہر کی کھڑکیوں پر بارش کے قطرے گر گر کر خشک زمین میں ہمیشہ کیلئے فناہ ہو جاتے۔ اسی طرح اس کے الفاظ میرے کانوں کے پردے سے ٹکرا کر اس منحوس چار دیواری میں صدا بصحرا ثابت ہوتے میں حسب معمول اسی وارفتگی کی حالت میں تھا۔ میرے خیالات طیور آوارہ کی طرح فضا کی بلندیوں میں پرواز کر رہے تھے۔ کہ وہ آیا۔ اور میرے بستر کے قریب بیٹھ کر یوں گویا ہوا۔

"میرے بیٹے" ان دو لفظوں نے میرے گم شدہ آوارہ خیالات کو یکجا کر دیا۔ میں اب اس کے ہر لفظ کو ہمہ تن گوش ہو کر سننے کیلئے تیار تھا۔

"میرے بیٹے! کیا تم خدا پر ایمان رکھتے ہو؟" پادری نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مقدس باپ! کیوں نہیں۔"

"کیا تم کیتھولک، اپوسٹل اور رومن گرجاؤں پر ایمان لاتے ہو؟"

"یقیناً! میں ان مقدس جگہوں کا بہت احترام کرتا ہوں۔"

"کہیں جبراً تو ایسا نہیں کہہ رہے؟"

یہ کہتے ہی اس نے ایک لمبی تقریر کرنی شروع کر دی ——— وہ عرصہ تک بولتا رہا ——— اپنے اس بیان میں جو کچھ بھی کہا۔ وہ پند و نصائح سے پر تھا۔ اس وعظ کو ختم کر کے اس نے پہلی مرتبہ میری طرف نگاہیں اٹھائیں۔ اور کہا "تو اب"

اس کی وعظ کو اولاً میں نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا۔ ثانیاً میں نے اپنے دل و دماغ کے تمام دروازے کھول دیئے۔ تاکہ ایک لفظ بھی سننے سے نہ رہ جائے۔ میں اٹھا اور ادب سے جواب دیا۔ مقدس باپ مجھے کچھ عرصہ کیلئے تنہائی میں رہنے دیجئے میں اسکے لئے جناب سے معذرت چاہتا ہوں۔

"تو پھر میں کب واپس آؤں؟" اس نے دریافت کیا۔

"میں تم کو اس وقت مطلع کروں گا۔"

اس پر وہ خاموشی کے ساتھ سپید سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔ غالباً وہ اس وقت اپنے دل میں یہی کہہ رہا ہوگا "کہ کافر ہے۔"

گو میں اس ذلت آمیز حالات میں زندگی بسر کر رہا ہوں ——— لوگوں کی نظروں میں حقیر ہوں۔ مگر میرا خدا گواہ ہے۔ کہ مجھے اس کی بزرگ ہستی پر ایمان ہے، مگر آہ! اس بوڑھے آدمی نے میرے ساتھ کس پیرایہ میں وعظ و نصیحت کی؟

اس وعظ نصیحت میں جسمیں نام تک کو اثر نہ تھا ـــ جو میری آنکھوں
سے ایک قطرہ اشک نہ لا سکی ـــ جس کے کسی لفظ نے میرے دل میں جگہ نہ
پکڑی ۔ ساون بھادوں کی بارش تھی جو صحرا کی تپتی ہوئی ریت پر چند منٹ پانی
برسا کر اس کو ویسے ہی پیاسا چھوڑ گئی ـــ رٹی ہوئی عبارت جسے وہ ایک
ہی سانس میں کہہ گیا ۔ حالانکہ اس کے برعکس اس کی وعظ موثر اور پرمغز ہونی
چاہیئے تھی جو سخت سے سخت آدمی خوفناک سے خوفناک قاتل کے دل میں
فوراً جگہ کر لیتی جو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تانتا باندھ دیتی۔
مگر وہ ایک رٹا ہوا سبق تھا جو اس سے قبل ہزار ہا مرتبہ سنایا جا چکا تھا ۔ اس کی آنکھوں
اس کی آواز اس کے حرکات و سکنات سے وہ چیز ہویدا نہ تھی جس کا میں متوقع
تھا ۔ اس کا وعظ موثر ہو تو کیونکر وہ جیل کا پادری ہے جسے ہر روز یہی سبق
قیدیوں کو سنانا پڑتا ہے ۔ وہ اس طرح لبِ اوقات کر رہا ہے ۔ قید خانہ
زندان کی تاریک اور مرطوب کوٹھڑیاں اس کی روزمرہ کی گزرگاہیں ہیں ۔ عمر قیدی اور سزائے موت
یافتہ اس کے لئے دو متضاد چیزیں نہیں ۔ کاش وہ میری خاطر ایک ایسے پادری کو
لائیں جس کے دل میں مجھ بدنصیب کا درد ہو ۔ وہ اس کے پاس بغیر کسی اطلاع
دیئے جائیں اور کہیں پادری صاحب چلئے آپ کی ایک گنہگار کیلئے ضرورت ہے
جو اپنے گناہ بخشوانا چاہتا ہے ۔ آپ کو اس وقت موجود ہونا ہوگا جب وقت وہ
اس کے ہاتھ رسیوں سے باندھیں گے ۔ اس خونی منظر میں بھی آپکی موجودگی ضروری
ہے جب اس کا گلا کاٹنے والے چبوترہ پر لٹکایا جائے گا ۔ آپ کو اس کا سر قلم ہونے
سے پیشتر اس کے ساتھ بغل گیر بھی ہونا ہوگا"
یہ کہہ کر وہ اگر اسے میرے پاس لائیں ۔ اس حالت میں کہ اس کا دل فرطِ غم
سے دھڑک رہا ہو ۔ سر سے پاؤں تک کانپ رہا ہو تو میں اس کے مقدس بازو

میں اپنے آپ کو گرا دوں۔ گھٹنوں پر کھڑا ہو جاؤں جھک کر اپنا سر اس کے قدموں پر رکھ دوں
وہ میری حالت پر آنسو بہاتے زار و زار روتے ہیں میں بھی اشک بہاؤں ہم دونوں
مل خوب جی بھر کر روئیں ——— اس طرح میرے تمام گناہ آنکھوں
کے راستے بہ نکلیں گے۔ مجھے وہ اطمینان قلب جس کی مجھے عرصہ سے آرزو ہے نصیب
ہو جائے گا۔

میں نے غلطی کی ہے۔ اگر میں نے پادری کی شان میں کوئی گستاخانہ کلمہ
استعمال کیا اس حالت میں جب کہ وہ پاک اور نیک ہوا در ہیں ——— گنہگار سے
ایک انسان کا قاتل جو کچھ بھی پادری کے متعلق کہہ چکا ہوں۔ اس کے ذمہ دار
مجھے مت گردانیے۔ موت خصوصاً ایسی دہشت ناک موت انسان کو ایسا کرنے پر
مجبور کر دیتی ہے۔

وہ ابھی میرا کھانا لائے ہیں۔ بہت ہلکی اور زود ہضم اشیاء ہیں۔ اس کا ذمہ دار
مجھے مت گردانیے۔ موت خصوصاً ایسی وحشت ناک موت انسان کو ایسا کرنے
پر مجبور کر دیتی ہے۔

وہ ابھی میرا کھانا لائے ہیں۔ بہت ہلکی اور زود ہضم اشیاء ہیں۔ میں نے انہیں
کھانا چاہا۔ مگر پہلا لقمہ اٹھاتے ہی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں زہر کھا رہا ہوں۔
——— میں نے کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا۔

(۳۱)

ایک آدمی ابھی ابھی میرے کمرہ کے اندر آیا۔ اور دیوار کے پتھروں کو ناپنا شروع
کر دیا جب میں نے محافظ سے دریافت کیا۔ کہ وہ شخص کون ہے تو معلوم ہوا کہ وہ
جیل کا معمار ہے۔

وہ اپنے کام میں مشغول تھا۔ اسے ہماری موجودگی کا بالکل علم نہیں اس کا غیر

معمولی انہماک میرے لئے ایک قسم کی دلچسپی پیدا کر رہا ہے۔

اپنے کام کے دوران میں اس نے ایک دفعہ اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے میری طرف نگاہیں اٹھائیں۔ مگر فوراً ہی کچھ بڑبڑاتے ہوئے ناپنے میں مشغول ہو گیا۔

اپنے کام سے فراغت پا کر وہ میری طرف آیا۔ اور بلند آواز میں کہنے لگا "بڑے اچھے دوست! چھ ماہ کے بعد اس قید خانہ کی حالت درست ہو جائیگی مگر افسوس ہے کہ آپ اس تبدیلی کو نہ دیکھ سکیں گے"

میرے بوڑھے محافظ نے اس کا جواب یوں دیا "جناب! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ پھانسی کی کوٹھڑی میں بلند آواز سے گفتگو کرنا منع ہے"

معمار چلا گیا اور میں

میں ان بے جان پتھروں میں سے ایک پتھر کی طرح جن کی وہ پیمائش کر رہا تھا پڑا رہا

(۳۲)

وہ آئے اور بس بوڑھے محافظ کی جگہ ایک اور آدمی متعین کر گئے میں اپنے خیالات میں اس قدر کھویا ہوا تھا۔ کہ اسے الوداع کہنا بھول گیا۔

اس پیر مرد کے قائمقام کے بشرے سے جہالت اور حماقت کے آثار نمایاں ہیں میں اس کے بارے میں صرف یہی رائے قائم کر سکا۔ کیونکہ اب پھر اپنی ہولناک خیالات میں محو ہو گیا ہوں۔ اور سر کو ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کرسی پر بے جان مورت کی طرح بیٹھا آنے والے حادثہ کے متعلق سوچ رہا ہوں۔

اچانک کاندھے پر کسی ہاتھ کو محسوس کیا۔ مڑ کر دیکھا تو اپنے محافظ کو کھڑا پایا "مجرم! کیا تمہارے پہلو میں حساس دل ہے" اس نے مجھے مجرم کے نام سے پکارتے ہوئے کہا۔

نہیں"

اسے اس نوعیت کے جواب نے جبکہ وہ کسی حالت میں بھی متوقع نہ تھا چونکا دیا۔ اس لئے ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا "انسان اس قدر بے رحم نہیں ہوتا۔ جتنا وہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔

"کیوں نہیں؟ اگر تمہیں اسی قسم کی گفتگو کرنی ہے۔ تو میں کہوں گا۔ کہ مجھے تنہائی میں ہی رہنے دو۔"

"آخر اس گفتگو کا مطلب؟"

مجرم! دولت اور خوشی۔ یہ دونوں چیزیں میری غلام ہو سکتی ہیں۔ مگر تمہارے ذریعے سے دیکھو میں ایک غریب محافظ ہوں۔ تنخواہ اتنی قلیل ہے۔ کہ میرا گذران مشکل سے ہوتا ہے۔ اسی خاطر میں نے کئی دفعہ لاٹری کی ٹکٹیں خرید کر اپنی قسمت آزمائی کی۔ مگر بے سود۔ اگر ۳ نمبر کا ٹکٹ خریدتا تو ۴ نمبر کا انعام حاصل کر لیتا اس سے رہی سہی پونجی بھی تباہ ہو گئی۔ اب صرف ایک ذریعہ باقی ہے جس کا تمام تر انحصار تمہاری مہربانی پہ موقوف ہے۔

تمہیں آج تختہ دار پر لٹکنا ہے۔ یہ ایک مسلّم امر ہے۔ کہ جو شخص بھی اس طرح جان دیتا ہے اسے مرنے کے بعد لاٹری کے ان ٹکٹوں کے نمبر جنہیں انعام پانا ہوتا ہے معلوم ہو جاتے ہیں مجھ سے وعدہ کرو کہ کل شب تمہاری روح مجھے ان ٹکٹوں کے نمبر بتا دیگی۔ معمولی سی بات ہے جب کہ میں بھوتوں سے خائف نہیں ہوں۔ میرا پتہ بھی بطور یادداشت رکھ لو۔ ویسے بھی تم مجھے پہچان سکو گے۔ کیا نہیں؟

اس خرافات کے جواب میں نے کچھ اور ہی دیا ہوتا۔ مگر اسی وقت میرے دل میں امید کی ایک موہوم سی کرن پیدا ہو گئی ——— موجودہ حالت میں ایسی امیدوں کا پیدا ہونا باعث تعجب نہ تھا۔

"سنو! میں تمہیں اس سے زیادہ امیر کبیر بنا سکتا ہوں۔ مگر صرف ایک شرط پر۔

میں نے اسے کہا۔

اس پر اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں "کیا! کیا! وہ شرط کیا ہے؟" اس نے چلاتے ہوئے کہا۔

"میرا کوٹ تم پہن لو۔ اور اپنا کوٹ مجھے دیدو"

"صرف اتنی سی بات؟" اس نے کوٹ کے بٹن اتارتے ہوئے کہا میں کرسی سے اٹھا۔ اور اس کی حرکات دھڑکتے ہوئے دل سے مطالعہ کرنے لگا میں نے ابھی یہ تصور باندھ لیا۔ کہ جب میں نے اس محافظ کی وردی پہنی ہوگی۔ تو جیل کے تمام دروازے میرے لئے کھلے ہوں گے۔ اور پھر میں اس منحوس جگہ سے کوسوں دور ہوں گا۔ لیکن وائے حسرتا! وہ اچانک میری طرف مڑا اور کہنے لگا۔

"دیکھو! کیا یہ کوٹ اس جگہ سے فرار ہونے کیلئے تو نہیں چاہتے؟" اس کا کہنا ہی تھا۔ کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ امید کا وہ موہوم خیالی نیست و نابود ہو گیا۔ مگر بے وقوفوں کی طرح آخری کوشش کی اور کہا: "مگر تمہیں دولت بھی تو مل جائے گی"!

"نہیں! نہیں! میں ایسی دولت نہیں چاہتا تمہیں ضرور مرنا چاہیئے" اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

میں ——— شکستِ امید بدنصیب پھر اپنی خیالات میں غرق ہو گیا

(۳۳)

میں نے آنکھیں بند کر دیں چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور حال کو مستقبل میں محو کرنا چاہا۔

عہدِ طفولیت اور جوانی کے گذرے ہوئے پیارے ایام کا تصور میرے مجروح دماغ میں ان شگفتہ اور تازہ پھولوں سے لدے ہوئے شجروں کی طرح ہے جو کسی

سیاہ سمندر سے گھرے ہوئے ہوں ـــــ کتاب طفولیت کی ورق گردانی
کر رہا ہوں جب کم سنی میں ہرے بھرے کھیتوں میں قلابازیاں لگاتا ہنستا۔
دوڑتا ہر رنج و فکر سے آزاد کھیل کود میں مصروف ہوتا۔

چار سال کے بعد بھی وہی بھولا اور معصوم بچہ تھا مگر فرق اتنا کہ کسی خوبصورت
باغ میں میرے پاس ایک رفیق تنہائی بھی تھا ـــــ ایک نو عمر لڑکی بڑی بڑی
آنکھوں اور شب دیجور ایسی سیاہ بالوں کی مالکہ جس کا حسن غضب کا جوبن لب
لعلیں اور سرخ رخسار جس کی نزاکت اور خوبصورتی گلاب کو شرمندہ کر رہی تھی۔

ہماری مائیں ہمیں سیر کرنے کیلئے بھیجتیں لیکن ہم سیر کی بجائے خلوت میں
باتیں کرتے ـــــ باتیں ـــــ میٹھی میٹھی باتیں میرا اور اس کا جھگڑا
ہر روز ایک نئے سبب پر ہوتا۔ وہ روٹھتی اور اپنی ماں کے پاس شکایت کرنے چلی
جاتی مگر ایک سال بعد وہ میرے بازو کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ اور میں بڑی عمر آدمی کی
طرح اپنے دل میں جذبات اور محبت کا ہجوم لئے ہوئے اس کی شوخ نظروں کی طرف
دیکھ رہا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ ٹہلتے۔ آہستہ بولتے میں اس کے لئے پھول اکٹھے کرتا
اور جب ہم ملتے تو فرط محبت سے ہمارے ہاتھ کانپتے۔ وہ میرے ساتھ پر زرد
نیلے آسمان اور قدرت کی رنگینیوں کی بابت سیس آواز میں گفتگو کرتی!
ہم دنیا سے بے خبر اپنی دھن میں محو ہوتے معصومانہ گفتگو کرتے مگر وہ اچانک
شرما جاتی ـــــ کل کی بھولی بھالی بچی اب جوان ہو گئی تھی۔

بازو میں بازو ڈالے ہم شاہ بلوط کے بلند اور تناور درختوں کی اوٹ میں
گلگشت کرتے تو وہ اچانک چپ سی ہو جاتی میرے بازوؤں سے اپنے
بازو کو ہٹا لیتی اور کہنے لگتی "آؤ ہم دوڑیں"

اس کی تصویر اب بھی آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے اس کے دماغ میں بچوں

جیسا خیال آگیا تھا۔ اور کہا تھا۔ چلو ذرا دوڑیں"
وہ میرے آگے دوڑنا شروع کرتی۔ ایسا کرتے وقت اسکی نازک کمر سانپ کی طرح بل کھا رہی ہوتی کبھی کبھی بادِ نسیم کے جھونکے گستاخانہ انداز میں اس کے مرمریں جسم کو برہنہ کر دیتے۔
آخر کار میں اسے پکڑ لیتا اور ایک بیدار بخت فاتح کی طرح اس کو بنچ پر بٹھا دیتا۔ سر تا پا تبسم ہانپتی ہوئی میری طرف دیکھ کر کہنے لگتی۔ ابھی تو دن کی روشنی باقی ہے آؤ کچھ پڑھیں"
میں اس کے پہلو میں بیٹھ جاتا اور ہم کتاب کھول کر پڑھنے لگتے ورق کو الٹنے سے پیشتر اسے میرا انتظار کرنا پڑتا وہ مجھ سے کہیں زیادہ زود خواں تھی ۔۔۔ "ختم کر لیا؟" وہ مجھ سے کہتی حالانکہ میں نے ابھی پڑھنا ہی شروع کیا ہوتا تب ہمارے دل آپس میں مل جاتے ہمارے بال آپس میں آنکھ مچولی کھیلنا شروع کر دیتے ہمارا سانس ایک دوسرے سے مل جاتا۔ ہمارے ہونٹ آپس میں پیوست ہو جاتے اور جب ہم اس نشہ کے خمار سے ہوش میں آتے۔ تو آسمان جگمگاتے ہوئے تاروں سے مزین ہوتا۔
"اوہ! امی اگر تمہیں معلوم ہو سکے ہم نے آج کی سیر سے کسقدر لطف اٹھایا ہے!" وہ واپسی پر اپنی ماں سے کہتی۔
"مگر تم چپ چپ سے ہو" میری والدہ کہتی۔ اسے کیا معلوم تھا۔ کہ میرے دل میں اس وقت جنت آباد ہوئی تھی میرے جیسا اور کوئی شخص اس وقت روئے زمین پر نہ تھا۔
یہ ان پیاری شاموں سے ایک شام ہے جسکی یاد میرے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتی ۔۔۔ جسے میں تمام عمر نہ بھولوں گا۔

(۳۴)

گھڑی کچھ بجا رہی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کیا؟

مجھے اس وقت سنائی نہیں دیتا کیونکہ کانوں میں عجب شور برپا ہے جیسے تمام گرجا گھروں کے گھڑیال ایک ساتھ بج رہے ہوں۔ ماں کی دہشت خیالات کی پریشانی اور موت کا خوف ہے۔ اسوقت جبکہ میں اپنی زندگی کے گمشدہ اوراق کی ورق گردانی کر رہا ہوں۔ ان دلچسپ اور لطیف ابواب کا مطالعہ کر رہا ہوں میرے دل میں یکایک اس خون کا خیال آیا جس سے میں نے اپنے ہاتھ رنگے تھے۔ اُف! اسکا خیال کرتے ہی کانپ جاتا ہوں۔ میں اپنے کئے پر نادم ہوں۔ مگر اس ندامت سے مجھے ابھی تک پوری تشفی حاصل نہیں ہوئی۔ اس سے دگنی عمر بھی اگر بحر ندامت میں ڈوبا رہوں تو بہ کروں۔ خدا کے حضور میں گڑ گڑاتا رہوں تو بھی ناکافی ہے۔

مگر موجودہ حالات میں گناہوں کے اعتراف کا کیا موقع ہے جبکہ میری زندگی اور موت کے درمیان صرف چند گھنٹوں کا فاصلہ باقی ہو۔

اب بھی یہی خواہش ہے۔ کہ جی بھر کے اشک ندامت بہاؤں اپنے گناہوں کی تلافی کیلئے ہر ممکن کوشش کروں۔ مگر مگر اپنی زندگی کے خاتمہ کو نزدیک آتے دیکھکر گناہوں کی تلافی تو درکنار اوسان خطا ہوئے جاتے ہیں۔

اس لطیف زندگی اور رذیل زندگی میں ایک خون کی ——— میرے اور مقتول کے خون کی ندی حائل ہے۔ ایک زمانہ کے بعد جن اشخاص کو ان سوانح کے پڑھنے کا اتفاق ہوگا۔ وہ کبھی بھی باور نہ کریں گے مگر ان کا آغاز جرم سے شروع تھا اور انجام کالا کالا ٹنے والے چبوترہ پر آہ! کچھ دیر کے بعد مرنے کا خیال خصوصاً اسوقت جبکہ ہی بدقسمت انسان ابھی ایک سال قبل معصوم اور آزاد ہر موسم بہار میں جانوروں کی سیر کرتا ہو۔ درختوں کے جھنڈ تلے اس جلاد جان کاہ سے بے خبر

راگ الاپ رہا ہو۔ آف !! ناقابل برداشت خیال !!!

(۳۵)

یہ خیال کرتے ہوئے کہ لوگ گلی کوچوں میں مُحوِ خرام مُحوِ تکلّم اور خوش نظر آتے ہوں گے اخبارات کے مطالعہ میں مصروف ہوں گے دکاندار خرید و فروخت میں مشغول نوجوان لڑکیاں ناچ کیلئے نیا لباس پہن رہی ہوں گی ۔ اور مائیں اپنے بچوں کے ساتھ کھیل میں مصروف اور میں —————— میں اس منحوس جگہ میں مقید۔ آہ !

(۳۶)

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ایک دفعہ میں دنوتر سے دیم اگرجا کا گھنٹہ گھر دیکھنے گیا تھا میں آہستہ آہستہ تاریک سیڑھیوں کے ذریعہ گھڑیال تک جا پہنچا۔ تمام سیڑھیاں میرے قدموں میں تھا ۔ اچانک گھڑیال بجنا شروع ہوا ۔ اس کے شور سے ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ دیواریں ہل رہی ہیں میں خوفزدہ ہو کر دیوار کے ساتھ لگ گیا میرے کان شور سے پھٹے جاتے تھے ۔ یہی معلوم ہو رہا تھا ۔ کہ اب گرا اب گرا۔

آج بھی معلوم ہوتا ہے ۔ کہ اسی گھنٹہ گھر میں ہوں۔ میرے ہوش جواب دے رہے ہیں ۔ میں اس جگہ سے محروم کر دیا گیا ہوں ۔ جہاں دیگر انسان آزاد گھوم پھر رہے ہیں ۔

(۳۷)

سامنے والی عمارت ایک ہوٹل ہے جس کی ڈھلوان چھت ۔ لاتعداد کھڑکیاں مسلسل دیواریں الجھی سیڑھیاں شکستہ محرابیں عجیب گھناؤنا اور خوفناک منظر پیش کر رہی ہیں ۔ اسقدر سیاہ عمارت کہ دن کی روشنی میں بھی اس کی سیاہی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سزائے موت یافتہ مجرم اپنی زندگی کے چند لمحات گذارتا ہے جہاں محافظ اور دیگر اہلکار جیل رہتے ہیں ۔

اس خونی دن جب مجرم کی گلو بریدی ہوتی ہے یہ منحوس عمارت ان محافظوں

کی آنکھوں سے اس منظر کا تماشا دیکھتی ہے۔

اس کے باہر رات کو روشنی کرنے کا کوئی انتظام نہیں ——— اگر کوئی روشنی ہے تو اس چراغ کی جو گھڑی کے ڈائل کے پیچھے جلتا ہے تاکہ لوگ وقت دیکھ سکیں۔

(۳۸)

سوا ایک کا وقت ہے۔

میں اس وقت شدید ذہنی اور جسمانی تکالیف سہہ رہا ہوں میرے سر میں شدت کا درد ہو رہا ہے میرے جسم کا رواں رواں درد کر رہا ہے میری پیشانی آگ کی طرح تپ رہی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دماغ گھسیٹ رہا ہو کنپٹیوں پر خون کی گردش اس قدر تیز ہے کہ کانوں میں عجب عجب آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔ لکھتے وقت قلم ہاتھ سے گر گر پڑتا ہے آنکھوں میں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ بازو جواب دے رہے ہیں۔ صرف دو گھنٹے اور باقی ہیں۔ اس کے بعد ان تمام تکالیف کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(۳۹)

ان کا خیال ہے کہ اس نوعیت کی سزا کوئی تکلیف دہ نہیں۔ یعنی گلو بریدگی مجرم کیلئے زیادہ اذیت رساں نہیں ہوتی

آہ! اگر وہ خدارا یہ تو بتلائیں۔ کہ دس چھ ہفتوں کے دکھ کو جن میں عمر بھر کے رنج و آلام یکجا کر دیئے ہوئے ہیں ——— اس یوم کی روح فرسا یاد کو جس کا خیال کرتے ہی بال سفید ہو جاتے ہیں۔ کیا نام دیتے ہیں ———!

[illegible] سیڑھی کو جس کا خاتمہ اچانک موت کے چبوترہ پر ہوتا ہے۔ کیا پکارتے ہیں؟ جسم کو خون کے آخری قطرے سے محروم کر دیا اور ذہن کو آہستہ آہستہ خیالات سے

عادی کر دینا دو متضاد چیزیں نہیں جسمانی قوت ——— اور ——— ذہنی موت مگر پھر بھی موت اتنی تکلیف دہ نہیں۔ مگر فلسفہ یہ تو بتلائیں کہ آخر انہیں یہ کیونکر معلوم ہوا

کیا انہیں مجرم کے کٹے ہوئے سر سے معلوم ہوا۔ یا موت کے بعد مجرم ان کا شکریہ ادا کرنے آتے اور کہا جناب یہ سزا بالکل تکلیف دہ نہیں محض اختلاج ہے۔ آپ اس پر بھروسہ رکھیں بس ایک ہی لمحہ میں کام تمام ہو جاتا ہے۔ اس سے کیا بیان کیا جا رہا ہے پیری کی ہے۔ یا نوی پانزدہم کی؟

کچھ بھی ہو ضرب بس ایک سیکنڈ میں ہی اپنا خونیں کام کر جاتی ہے۔ انہیں سے آج تک کسی نے بھی اس شخص کی تکالیف کا بغور مشاہدہ نہیں کیا جس کے سر پر چھرے کی بھاری ضرب کا انتظار ہوتا ہے ———

اس تیز چھری کی ضرب کا جو ایک لمحہ میں اس کی گردن کی نسیں چیرتی ہوئی حلقوم تک پہنچے گی اور گردن کو تن سے جدا کر دے گی۔

سچ ہے تکلیف واقعی نہیں ہوتی!!

درد موت کے ہولناک خیال سے مغلوب ہو کر اپنا اثر زائل کر دیتا ہے۔

(۴۰)

میرا ذہن بار بار بادشاہت کی طرف منتقل ہوتا ہے میں اپنے قصر محل میں بادشاہ کے وجود کو تصور کرتا ہوں۔ میرے قلب کی عمیق گہرائیوں سے پیدا ہونے والی امنگیں اسی جگہ میں اسی جماعت اسی جگہ کے قریب محل میں ایک اور ہستی ہے جس کے دروازوں پر محافظ پہرہ دے رہے ہیں۔ اس میں اور تم میں یہ فرق ہے کہ وہ جس قدر بلند ہے۔ تم اسی قدر پست ہو۔

اس کی محفل حیات سے مزین ہے۔ شرکت میں سطوت اور احترام ہے اس کے

سامنے بڑے بڑے شعور یدہ امرا اپنے سروں کو جھکا دیتے ہیں۔ اس کا ماحول زریں اور سیمیں ہے۔ اس وقت وہ اپنے وزرا سے کسی مشاورت میں مشغول ہوگا جہاں پاس کی مملکت سب کی رائے ہوگی یا جہاں جلوے پیام عیش و سرور کا منتظر ہو گا۔ معدودے چند کی تکالیف سے اپنی راحت حاصل کر سکتا ہے۔

اس انسان کی تخلیق بھی اسی آب و گل سے ہے جس سے تو بنایا گیا ہے۔ وہ موت کے احکام کو اپنے نام کے سات حروف سے عبدل بحیات کر سکتا ہے۔ وہ اچھا ہے۔ العدمیں بُراؤ

(۱۴)

آیئے موت کا خیال کیجئے۔ یہ کیا ہے؟ کس کی تلاش میں ہے؟ اس مسئلہ کے اعماق کا اندازہ لگایئے مرقد کی طرف دیکھیئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرنے کے بعد میری روح منور فضاؤں میں پرواز کرے گی۔ آسمان بجائے نیلگوں ہونے کے سنہری ہوگا۔ اور ستارے اس سنہری پردہ پر سیاہ داغ ہونے کے علاوہ ایک میدان کا رخ کیے جہاں اسی قسم کے دو سوئے رہ جو ہوں جب کبھی میری آنکھیں کھلیں گی۔ تو سوائے سیاہ آسمان کے انہیں کچھ نظر نہ آئے گا۔ جنہیں رات کے وقت سرخ ذرات بھی نظر آئیں گے مگر مجھ تک پہنچتے ہی وہ آگ کی طرح بن جائیں گے۔ یہ تو اترو تسلسل خیر محفوظ ختم ہوگا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوگا۔ کہ منزل موت کے تمام مجرم مجتمع ہو کر ایک جماعت کی صورت اختیار کریں گے وہاں تختہ دار بھی ہوگا۔ اور جلاد بھی شیطان اسی تختہ دار پر اسی جلاد کو لٹکائے گا جس کے ہاتھوں ہم مرے ہوں گے —— اور ہم سب اس کے گرد و گرد اس منظر کا تماشا کرتے ہوں گے۔ یہ سب کچھ چار بجے صبح ہو گا۔

اگر مُردوں کو دوبارہ زندگی بخشی جائے۔ تو وہ کس صورت میں ہوگی جسم کے علیحدہ علیحدہ حصوں کو کون یکجا کریگا؟

آہ! موت ہماری روحوں کے ساتھ کیا کرتی ہے!

کیا موت نے کبھی اپنے زمین کے شکاروں پر آنسو بہائے ہیں! آہ!

پادری۔ ایک پادری جو یہ سب کچھ جانتا ہے پادری اور صلیب میرے خدا!!

(۴۲)

میں نے سونا چاہا اس لئے بستر پر لیٹ گیا خون کے دوران کی تیزی وارفتگی اور پریشان خیالات نے مجھے تھپکی دیتے ہوئے سلا دیا۔ نہیں بے ہوش کر دیا۔ یہ بیہوشی میری آخری نیند ہے۔ اسی بے خودی میں ایک خواب دیکھا کہ رات ہے۔ اور میں دو تین دوستوں کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھا باتیں کر رہا ہوں باتیں جو ہولناک اور فرسا اچانک میں نے دوسرے کمرے میں کچھ آواز سنی آواز جو کسی دروازے کی چیخیں کھولنے سے پیدا ہوتی ہو اس خوفناک آہٹ نے ہم سب کے اوسان خطا کر دیئے ہمارے خون کو رگوں میں منجمد کر دیا۔ ہم نے یہی خیال کیا کہ چور گھر میں گھس آئے ہیں۔ اس لئے ہم اس کی جستجو کے لئے اٹھے میں شمع ہاتھ میں لئے سب کی رہنمائی کر رہا تھا۔

ہم کمرۂ شب خوابی سے گذرے وہاں میری بیوی اپنی بچی کو پہلو میں لٹائے سو رہی تھی۔ اس سے گذرتے ہوئے ہم بڑے کمرہ میں پہنچے مگر وہاں بھی اس اسرار کا سراغ ہاتھ نہ لگا خیال آیا کہ شاید کمرہ طعام میں ہی سے گوہر مقصود حاصل ہو جائے لہٰذا اس طرف قدم بڑھائیے۔

کانپتے ہاتھوں سے میں نے دروازہ کو آہستہ آہستہ وا کیا حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ایک معمر عورت کو فوق الفطرت حالت میں دیوار کے ساتھ کھڑا پایا بے جان تصویر کی طرح بے حس و حرکت دیوار سے چسپاں۔

اس کی موجودہ ہیئت کذائی اس قدر وحشت خیز تھی۔ کہ اس کا خیال کرتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"کیا کر رہی ہو تم" میں نے بالآخر جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش رہی۔

"تم کون ہو؟" میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

مگر وہ پھر نہ بولی اور آنکھیں بند کئے ویسے ہی جمی رہی۔ میں نے اس سے دوبارہ سہ بارہ سوال کیا۔ مگر بے سُود۔

ایک نے تنگ آکر اسے دھکا دے دیا۔ اسے دھکیلنا ہی تھا۔ کہ وہ بے جان گٹھڑی کی طرح زمین پر آ رہی۔

اس حادثہ نے ہمارے رہے سہے حواس گم کر دیئے۔ وہ کیا مُردہ تھی؟

"اس کی ٹھوڑی کو ذرا شمع کی لَو تو دکھاؤ"

مجھے ایک دوست نے رائے دی میں نے اس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے اس معمر عورت کی ٹھوڑی کے نیچے شمع رکھ دی اس پر اس نے ایک آنکھ کھولی۔ آنکھ وہ خوفناک آنکھ جو بینائی سے محروم تھی۔

"تم کون ہو، شیطان کی خالہ" میں نے اس سے دریافت کیا۔ مگر یہ کہنا ہی تھا کہ اس نے آنکھ بند کر لی۔

"پھر اس عمل کو دہراؤ" میرے دوستوں نے کہا جو اس معمہ کو حل کرنے کیلئے بہت بے چین تھے۔

میں نے پھر شمع اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ دی اس دفعہ اس نے دونوں آنکھیں کھول دیں۔ مگر برق ایسی تیزی سے آگے بڑھی اور شمع کو گل کر دیا۔

قیامت کی تاریکی چھا گئی ——— اسی وقت میرے بازو پر کسی کے

تین دانت پیوست ہو گئے   فرطِ خوف سے میں بیدار ہو گیا۔

پادری میرے سرہانے بیٹھا دعا پڑھ رہا تھا۔

"میں زیادہ سویا ہوں کیا؟"

"میرے بیٹے! تم نے صرف ایک گھنٹہ نیند کی ہے۔ ماما تمہاری لڑکی کو ملحقہ کمرے میں لئے تمہارا انتظار کر رہی ہے"۔

"آہ! میری لڑکی! میرے جگر کا ٹکڑا! کیا! خدا کے لئے اسے جلد میرے پاس لاؤ"۔

(۳۴)

"نازک کلی ——— معصومیت کی تصویر ——— میری لختِ جگر ——— میری بھولی بچی"

تیری اپنی ماما کے ساتھ میرے کمرے میں آئی۔

تتلی ایسے خوبصورت لباس میں کیسی بھلی معلوم ہو رہی ہے میں نے اسے گود میں اٹھا کر اس کے بالوں کو چومنا شروع کر دیا کبھی اسے چھاتی سے لگا تا اور کبھی نازک رخساروں کا بوسہ لیتا بھینچ لیتا۔ میری ان حرکات سے حیران اپنی ماما کی طرف دیکھ رہی ہے جو کونے میں اس منظر سے متاثر ہو کر آنسو بہا رہی ہے۔

"میری! میری پیاری میری" یہ کہہ کر میں نے اسے رنج و الم سے پر چھاتی سے زور کے ساتھ بھینچ لیا۔

"آہ! جناب! آپ مجھے تکلیف دے رہے ہیں" میری نے ہلکی سی چیخ مارتے ہوئے کہا۔

جناب! آہ! بلند آسمان! اسے مجھ سے جدا ہوئے تقریباً ایک سال کا عرصہ ہو گیا ہے، وہ مجھے بھول گئی۔ اسکے ذہن سے باپ کی شکل و شباہت اور آواز محو ہو گئی۔ اس کے علاوہ مجھے اس ہیئت کذائی میں پہچاننا بھی تو دشوار تھا لمبی سی ڈاڑھی یہ ذلیل لباس۔ اُف!! کیا میری تصویر اس کے ذہن سے اتر گئی ہے جس میں میں اسے

منعکس کرنا چاہتا تھا۔

کیا میں اپنی بیٹی سے اسی پیار سے اور شیریں لہجہ میں باپ کہتے ہوئے نہ سن سکوں گا
اُف! دماغ پھٹا جاتا ہے۔ دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے جناب! اُف یا میرے خدا یا!
آہ! میں اپنی چالیس سالہ زندگی کے بدلے صرف ایک چیز کا خواہشمند ہوں
اپنی موت کے عوض ایک لفظ چاہتا ہوں۔ اپنی پیاری بچی کے منہ سے صرف
باپ کا لفظ!

"دیکھو میری! کیا تم مجھے جانتی ہو؟ میں نے اس کے ننھے اور سپید ہاتھ اپنے ہاتھ
میں جوڑتے ہوئے کہا۔

میری طرف چمکتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر بولی "جی نہیں"۔

"میری غور سے دیکھو تو میں کون ہوں؟"

"شریف آدمی" اس نے بھولے پن سے جواب دیا۔

آہ! جس ذات سے میری تمام خواہشیں اور شرتیں وابستہ ہیں جو میری
محبت کا مرکز ہے۔ میرے سامنے بیٹھی باتیں کر رہی ہے مگر مجھے نہیں پہچانتی
اپنے تیرہ بخت باپ کی صورت سے ناآشنا ہے۔

میں اس سے تسکین قلب کا خواہاں ہوں۔ مگر وہ اس سے بے خبر ہے
نہیں جانتی کہ اس کے والد کو جس کی موت میں صرف چند گھنٹے باقی ہیں اس
کے منہ سے صرف ایک کلمہ سننے کی خواہش ہے۔

"میری! کیا تمہارا باپ ہے؟"

"جی ہاں"

"تو پھر وہ کہاں ہے؟"

وہ اس کا جواب دینے سے قاصر رہی۔

"تمہیں معلوم نہیں کہ وہ مر گیا ہے" یہ کہنا ہی تھا۔ کہ رونے لگ پڑی۔
"مر گیا ہے! میری کیا تمہیں معلوم ہے۔ کہ مرنا کسے کہتے ہیں"
"جی ہاں! وہ آسمان پر ہیں۔ میں ان کے لئے امی کے ساتھ ہر روز دعا مانگا کرتی ہوں"

اس نے جواب دیا۔

"میری وہ دعا تو سناؤ!"

"نہیں جناب دعا تو رات کے وقت مانگی جاتی ہے۔ نہ کہ دوپہر کے وقت اگر سننی ہو تو کسی دن رات کو میرے گھر آیئے۔

بس! بس! یہ الفاظ میرے مجروح دل کی نمک پاشی کیلئے کافی ہیں میں اور کچھ سننا نہیں چاہتا۔

"میری! میں تمہارا باپ ہوں" میں نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔

"نہیں"! میری نے حیرت سے کہا۔

"کیا میں تمہیں پسند نہیں!"

"نہیں جناب! میرا باپ تو بہت خوبصورت تھا"

میں نے اس کے چہرے کو اپنے آنسوؤں اور لگاتار بوسوں سے تر کر دیا وہ گھبرائی اور چیختے ہوئے کہنے لگی۔

آپ تو میرے رخسار اپنی داڑھی سے چھیل رہے ہیں"

میں نے اسے اپنے گھٹنوں پر بٹھلا لیا۔ اور کہا میری کیا تم پڑھ سکتی ہو؟"

"میں پڑھ سکتی ہوں۔ امی مجھے ہر روز پڑھایا کرتی ہیں"

"اچھا تو یہ پڑھو" میں نے اس کے ہاتھ سے ایک چھپا ہوا کاغذ لیتے ہوئے کہا۔ جس سے وہ غالباً کھیل رہی تھی۔ اس نے کاغذ کو کھولا۔ اور ننھی سی انگلی رکھتے ہوئے

لفظوں کے ہجے کرنے لگی۔ ف ا ت خ ت ا و ۔ ی ا دی م ، د ہ مو ات ۔ موت فتوٰی موت
میں نے اس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا ۔ وہ میری سزائے موت کا فتوٰی پڑھ رہی تھی
جو بازار میں ایک پیسہ کو بک رہا تھا ۔ اس نے اسے غالباً اپنی ماما سے لیا ہوگا ۔

اس وقت میرے دل کی جو حالت ہوئی وہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے ۔

"مجھے میرا کاغذ دے دو" میری چلا کر کہنے لگی ۔

"خدا کیلئے لے جاؤ اسے" یہ کہہ کر میں کرسی پر گر پڑا ۔ اب مجھے کسی کا خوف نہیں
جبکہ میرے بربط دل کا آخری تار بھی ٹوٹ گیا ہے ۔ میں موت کا مردانہ وار مقابلہ
کرنے کے لئے تیار ہوں ۔

(۴۴)

پادری اور محافظ دونوں بہت رحمدل ہیں مجھے یقین ہے کہ جس وقت میں
نے اپنی لڑکی کو واپس بھیجا ۔ تو پادری کی آنکھیں نمناک تھیں ۔

خیر! یہ تو سب کچھ ہوا ۔ مگر مجھے اب تختہ دار اور جلاد کے لئے گردن اور تماشائیوں
کیلئے دل کو مضبوط کر لینا چاہئے ۔

میرے پاس چیزوں پر غور کرنے کیلئے ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے ؛

(۴۵)

اس خونیں منظر کو دیکھنے کیلئے بہت سے لوگ جمع ہوں گے گلے کاٹنے کا چبوترہ
ان کے لئے موجب فرحت و انبساط ہوگا ۔ مگر وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں ۔ کہ
ان تماشا کرنے والوں میں سے جو اس وقت آزادانہ طور پر چل پھر رہے ہیں ۔ کئی ایسے
بدقسمت شخص ہوں گے جو میری طرح اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں قید کر دیئے
جائیں گے جن کا سر میری طرح اس خونیں چبوترہ پر قلم کیا جائیگا ۔ بیہوش بغافل!

(۴٦)

ننھی میری ایک گاڑی میں گزر جارہی ہوگی۔ وہ کھڑکی سے اس گروہ کا تماشہ دیکھے گی۔ "اس شریف آدمی"۔۔۔۔۔ آہ! مجھ بدبخت باپ کو بالکل بھول جائیگی اگر مجھے وقت ملا تو میں اس کیلئے ضرور کچھ نہ کچھ قلمبند کر دونگا شاید وہ تحریر آج انہیں دس سال بعد اس کو خون کے آنسو رلائے۔

جب وہ میرے سوانح حیات پڑھے گی۔ تو خود بخود سمجھے گی۔ کہ اس کے حقارت سے دیکھے جانے کا سبب کیا ہے۔ بھولی لڑکی! کاش وہ اپنے والد کی گود میں کچھ دیر اور کھیلتی!!

(۴۸)

ہوٹل دی ڈیل کا ایک کمرہ۔

ہوٹل دی ڈیل! میں یہاں ہوں۔ میرا مصائب سفر ختم ہو چکا ہے۔ قتل گاہ میرے سامنے ہے۔ کھڑکی کے نیچے تماشائیوں کا انبوہ کھڑا ہے جو میری صورت دیکھنے کیلئے بے حد منتظر ہے

جب میں نے تختہ دار کو دیکھا۔ تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے آخری گفتگو کرنی چاہی۔ انہوں نے اس مطلب کیلئے ایک وکیل کو بلا بھیجا ہے۔ اسکا منتظر ہوں۔

تین بجے انہوں نے مجھے اطلاع دی۔ کہ وقت قریب ہے۔ میں کانپ اٹھا۔ مجھ پر غیر متوقع تاثرات نے قبضہ جما رکھا ہے۔

وہ مجھے ایک کمرہ میں لے گئے جو کہ بہت تنگ تھا۔ سورج کی روشنی وہاں تک

نہ مختصر اوراق باوجود تلاش بسیار دستیاب نہ ہو سکے۔ شاید اسیر اپنے سوانح حیات نہ لکھ سکا۔ جیسا کہ آئندہ باب سے واضح ہوتا ہے۔ اسے اس کا دیر بعد خیال آیا ہوگا۔ افسوس

بمشکل پہنچ سکتی تھی۔

کچھ لوگ دروازے کے قریب کھڑے ہیں۔ دو حجام آہستہ سے میری طرف آئے اور میرے سر کے بالوں کو جو میرے شانوں پر بڑھے ہوئے تھے کاٹنا شروع کیا۔ اسوقت کمرے میں ہر شخص آہستہ گفتگو کرتا۔ مگر کمرے کے باہر عوام ہنس رہے تھے ---- ان کے شیطانی قہقہوں کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

کھڑکی کے قریب ایک نوجوان جس سے کچھ لکھ رہا تھا۔ دیکھتے وقت اس نے ملازم سے اس رسم کے متعلق دریافت کیا۔ میرے بال کاٹنے کے عمل کا نام پوچھا۔

"مجرم کا سنگار" حجاموں نے جواب دیا۔

اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ کہ وہ شخص نامہ نگار ہے۔ اور جو کچھ بھی یہاں ہو رہا ہے۔ وہ کل کے اخبارات میں شائع ہو جائیگا۔

اس کے بعد ایک ملازم نے میرے کپڑے اتارنے شروع کیے۔ جب وہ قینچی سے میرا کالر کاٹ رہا تھا۔ تو گردن پر سرد لوہے کو محسوس کرتے ہی میرے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی۔

"کیا آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی؟ معاف کر دیجئے گا۔" جلاد نے کہا۔

آہ! یہ جلاد بھی اپنی قسم کے رحمدل ہوتے ہیں۔

تب دوسرے آدمی نے میری کلائیوں کے گرد ایک ہلکا سا دھاگا لپیٹ دیا۔ اب ہر چیز پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ پادری صاحب کے نزدیک آیا۔ اور بولا۔

"آؤ میرے بیٹے آؤ۔"

کمرہ میں موجود لوگوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔ میں بمشکل دو چار قدم چل سکا۔ میرے پاؤں بہت ڈھیلے ہو چکے تھے۔

خیر بعض تنگ و تاریک کمروں سے گذر کر ہم ایک دروازہ تک آئے جس کے دائیں جانب محافظ سواروں کا ایک دستہ تھا۔ بائیں طرف ایک گاڑی تھی۔ زنداں کی

کوٹھری کی دوسری بہن۔

"وہ ہے .... وہ آخر کار وہ گیا" انبوہ سے آواز آئی بعض لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ گویا ان کے نزدیک اس سے مسرت بخش سماں کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ طویل القامت جلاد سب سے پہلے گاڑی میں داخل ہوا۔ اس کے بعد اسکا ایک نوکر داخل ہوا۔

اب میری باری تھی ۔ میں دل کو قوی کرتے ہوئے گاڑی پر سوار ہوا۔

"اس کے ہوش وحواس قائم ہیں" ایک خاتون گروہ سے بولی۔

میں نے اپنے گرد وپیش نظر دوڑائی۔ آگے محافظ ــــــــ پیچھے محافظ۔ انبوہ ــــــ انبوہ ــــــ ہزاروں انسانی سروں کا سمندر گاڑی کے چلتے ہی تمام جلوس نے بھی حرکت شروع کی۔

"ٹوپیاں اتارو" ہزارہا لوگوں نے کہا۔

گویا وہ کسی بادشاہ کا استقبال کر رہے تھے۔ میں مسکرایا اور پادری سے یوں کہا

"وہ اپنی ٹوپیاں اتارہیں ـ .... اور میں اپنا سر ...."

سامنے کھڑکیوں میں ہزارہا تماشائی بیٹھے ہوئے ہیں ــــ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔

بعض ظالموں نے میزوں اور کرسیوں سے جگہ آراستہ کر رکھی تھی اور وہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے۔

"کسی کو جگہ چاہیئے"

جی میں آئی کہ کھڑا ہو کر ان سے دریافت کروں "میری جگہ کسے چاہیئے" مگر چپ رہا۔

گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ قدم قدم پر گاڑی کو رکنا پڑتا، کیونکہ ہجوم میری

گاڑی کے آگے کھڑا ہو جاتا ــــ وہ مجھے بار بار دیکھنا چاہتے تھے۔ میرے خیالات بہت پراگندہ ہو گئے تھے۔ اس لئے میں نے چاہا۔ کہ ہر طرف سے لاپرواہ ہو کر صرف پادری کی طرف متوجہ ہوں میں نے صلیب کو اٹھایا۔ اور اسے بوسہ دیا۔

"میرے خدا مجھ پر رحم کر" میں نے گاڑی کی سیاہ چھت کی طرف تکتے ہوئے کہا مینہ برس رہا ہے۔ جس نے میرے کپڑوں کو تر کر رکھا ہے غضب کی سردی ہے اکڑا جا رہا ہوں۔

"میرے بیٹے! کیا تم سردی سے کانپ رہے ہو؟" پادری نے دریافت کیا۔

"مقدس باپ صرف سردی سے ہی نہیں"

پل کے اس پار چند عورتیں میری حالت اور جوانی سے متاثر میری موت پر اظہار افسوس کر رہی تھیں۔

آخر کار منزل مقصود پہنچی چاروں طرف لوگوں کا ہجوم ہے۔ ان میں سے ہر ایک میرا واقف ہے۔ میرا نام بچہ بچہ کے ورد زبان ہے۔ اس قدر لوگوں کی نگاہوں کے بار سے دبا جا رہا ہوں۔ اس منظر کی زیادہ دیر تک تاب نہ لا سکا۔ بیہوش سا ہو گیا۔ اب اپنے گردوپیش کے حالات سے بے خبر ہوں معلوم نہیں لوگ اظہار انبساط کر رہے ہیں یا اظہار تأسف!

میرے بائیں جانب "نوترے دیم" کا گرجا ہے۔

گاڑی آگے بڑھی اور تماشائیوں کے گروہ سے گذر گئی۔ میں خاموش پڑا رہا۔ اچانک گاڑی رک گئی۔

"میرے بچے ہمت کرو!" پادری نے کہا۔

گاڑی کے ساتھ ایک سیڑھی لگا دی گئی۔ روشنی میں کچھ نظر پڑا۔ آہ! وہ حقیقت ہے۔

"مجھے آخری خواہش کا اظہار کرنا ہے" میں نے ان سے التجا کی۔ انہوں نے میرے ہاتھ کھول دیئے۔ مگر رسی موجود ہے۔ آخری خواہش لکھ چکنے کے بعد پھر دی اتنی ہوگی

اور میری کلائیاں اور ہا

(۴۶)

منصف، اکمشنر یا مجسٹریٹ! خدا معلوم کون ——— آیا۔

میں نے اس سے اپنے معافی نامہ کیلئے استدعا کی۔ ہاتھ جوڑے ہوئے سفارش کے لئے کہا۔ زانو پر کھڑا ہو کر گڑگڑا کر التجا کی۔ مگر اس پتھر جیسے دل پر کوئی اثر نہ ہوا جو جواب دیا تو یہ "کیا یہی کچھ کہنا ہے تمہیں!"

معافی۔ معافی نامہ حاصل کرنے کیلئے صرف پانچ منٹ کا قلیل عرصہ ہے ——— میری خاطر نہیں تو خدارا رحم کی خاطر ~~کچھ صبر~~ کہ عرصہ میں میری رحم کی درخواست منظور ہو جائے۔ آہ!! اس عمر میں خصوصاً ایسی موت مرنا کس قدر ہولناک ہے۔ جناب! اگر وہ مجھ بدقسمت پر رحم نہیں کریں گے۔ تو کس پر کریں گے۔ کیا میں اس کا مستحق نہیں؟ میں ملتجی ہوا۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دے۔ جلاد کمرے میں داخل ہوا اور مجسٹریٹ سے کہنے لگا۔ چونکہ مقررہ وقت قریب آ رہا ہے۔ اس لئے آپ کی موجودگی وہاں ضروری ہے۔ خدا کے لئے تھوڑی دیر انتظار کرو تمہیں رحم کا واسطہ ایک لمحہ تو ٹھہرو۔ شاید معافی نامہ آ جائے۔ اگر آپ نہ کرو گے تو بخدا میں تمہیں کاٹوں گا اپنی جان بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کروں گا۔

مجسٹریٹ اور جلاد دیکھتے ہی چلے گئے۔ اب میں اکیلا ہوں۔ اکیلا دو محافظوں کے درمیان۔ اُف! میں پاگل ہو رہا ہوں۔ مگر اب بھی میرے دل میں اُمید کی آخری کرن باقی ہے ——— معافی ——— شاید میں اس ہولناک موت سے بچ جاؤں ——— ناممکن وہ میری درخواست رحم کو رد کر دیں گے ——— ظالم دستگاہ ——— کوئی میرے کمرے کی طرف آ رہا ہے۔ میرے اللہ! جلاد ہے ——— بس ——— خاتمہ ———

——— وِداع کا وقت ———

انتقامِ اسیر

آج سے آٹھ سال قبل پیرس کے خوبصورت شہر میں ایک غریب مزدور رہتا تھا۔ اپنے علاوہ اسے دو پیٹ اور پالنے پڑتے ——— اس کی مالکہ یعنی بیوی ——— اور ننھا سا بچہ ———

میں ناظرین کی خدمت میں حقیقت بیان کر رہا ہوں جس میں کسی قسم کے تصنع کو دخل نہیں۔ جو کچھ بھی ہے۔ صداقت پر مبنی ہے۔ اس سے سبق حاصل کرنا اس کے پڑھنے والوں پر چھوڑتا ہوں۔

بچپن ہی سے وہ پردۂ غفلت میں رہا۔ آغوشِ جہالت میں پرورش پاتا رہا مگر بایں ہمہ وہ ایک اچھے دماغ کا مالک تھا۔ دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے پر گھنٹوں فکر کرتا۔

موسم سرما آیا۔ حسب معمول تکالیف و مصائب کے ساز و سامان سے آراستہ ایندھن کی کمی ——— روٹی کی کمی ——— مزدوری کی کمی!!! وہ شخص، اس کی بیوی اور بچہ فاقوں پر فاقے کرتے۔ مگر انجام کار اس ذلیل زندگی سے تنگ آ گئے۔ مزدور چور بن گیا۔

مجھے معلوم نہیں اس نے کیا چرایا۔ مگر اتنا معلوم ہے۔ کہ اس کے اور اس کی

کی اس کے لئے تین دن کا خورد و نوش مہیا ہو گیا۔ اور اُس کیلئے پانچ سال کی سزا۔
اس کو سزا کے ایام پورے کرنے کیلئے زندان میں بھیج دیا گیا۔ زندان جو گرجا گھر کی عمارت میں تبدیل کر دیا گیا تھا —— اب اس معبد کے کمرے تنگ و تار کوٹھڑیاں اس کی قربان گاہ۔ وہ چوبی کٹہرا جس میں پھانسی دی جاتی ہے۔
بعض اصحاب کے نزدیک یہ ترقی ہے۔ تمدنی ترقی۔
خیر! زندان میں رات تو وہ کوٹھڑی میں بسر کرتا۔ اور دن بھر کارخانہ میں۔
مجھے کارخانہ سے کوئی نفرت نہیں۔
کلاودے گیو ریہ مجرم کا نام تھا، ایسا ایماندار ضرور۔ اگر چوری کرنے پر مجبور ہوا۔ تو اپنی مشکلات کی بنا پر۔ ورنہ وہ سلیم الدماغ نیک اور رحمدل تھا۔ وہ نہایت ہی اچھے دماغ کا مالک تھا۔
اب آپ دیکھیں گے۔ کہ سوسائٹی نے اس دماغ کے ساتھ کیا سلوک کیا اپنے کام کے دوران میں شاید ہی وہ کسی سے ہمکلام ہوتا۔ مگر اس کے چہرے سے وقار اور وفاداری عیاں تھی۔
جیل کے اندر کلاودے گیو کو کارخانہ میں کام کرنا پڑتا۔ اس کی نگرانی کیلئے ایک نائب ناظم مقرر تھا۔ وہ بیک وقت داروغہ اور سوداگر تھا۔
وہ ظالم تھا۔ اس نے کبھی ادراک سے کام نہ لیا۔ وہ تند خو ہونے کی بجائے سخت دل تھا۔ اگر ایک لمحہ وہ معروف مزاج اور شادماں ہوتا۔ تو دوسرے لمحہ وہ تند خو اور بد مزاج ہوتا۔ اس کا تعلق نسل انسانی کی اس جماعت سے تھا جس کے افراد میں نئے خیالات جذب کرنے کی اہلیت نہیں ہوتی —— جو بظاہر حوادث سے متاثر نہیں ہوتے۔ نفرت و حقارت کے ناپاک جذبات جس کے قلوب میں پرورش پاتے ہیں۔ جو اس چوب خشک کی مانند ہیں جس کا ایک سرا جل رہا ہو۔ مگر دوسرا برف کی مانند سرد

اس داروغہ کی سیرت ایسی ہٹ دھری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنی ضدی فطرت پر اس قدر نازاں تھا۔ کہ اپنے تئیں نپولین تصور کرتا۔ یہ محض فریب نظر تھا۔ وہ شمع کو درخشندہ ستارہ سمجھے بیٹھا تھا جب کبھی وہ ذلیل حرکت پر آمادہ ہوتا۔ تو وہ ضرور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا۔ بارہا ایسا ہوتا ہے۔ کہ جب کبھی ہم افتادِ بلا کے اسباب وعلل پر غور کرتے ہیں۔ تو ہم سب اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس کی ابتدا عناد اور اعتماد نفس سے ہوئی۔

ہمارا ناظم اس سیرت کا حامل تھا۔ اسے سوسائٹی نے دوسروں پر حکمران کر رکھا تھا۔ اس کی مثال بعینہٖ اس شخص کی مانند تھی۔ جو دبی ہوئی راکھ سے چنگاریوں کی جستجو کرتا ہو۔ مگر اکثر اس قسم کی چنگاریاں برق کی صورت میں نمودار ہو کر گلشن ہستی کو بیابانوں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ کلاؤدے گیو کے زندان میں داخل ہوتے ہی اسے مجرموں کا لباس پہنا دیا گیا اور ورکشاپ میں کسی کام پر لگا دیا گیا۔ ناظم کی نگاہوں نے تھوڑے دنوں کے بعد ہی تاڑ لیا۔ کہ کلاؤدے گیو دیگر مجرموں کی طرح نہ تھا۔ اس لئے اس نے اس کی اچھی طرح نگہداشت کرنی شروع کر دی۔

کلاؤدے زندان میں بہت مغموم سا رہتا تھا۔ اس کا نقطۂ نظر صرف اس کی بیوی اور بچے کی یاد تھی۔ جس کی امید پر وہ زندگی کی تاریک گھڑیاں صبر و تحمل سے گذار دینے پر آمادہ تھا۔ کلاؤدے کو حسرت و یاس کا مجسمہ دیکھ کر ناظم نے اس کا غم غلط کرنے اور حوصلہ افزائی کے لئے اسے تبلایا۔ کہ اس کی عورت بیسوا طبقہ میں شامل ہو چکی ہے۔ دوسرے لفظوں میں بیسوا کا لباس پہن چکی ہے۔

"اور لڑکا؟" قیدی نے پوچھا۔

[illegible] ناظم کو کچھ علم نہ تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد کلاڈے اس زندگی سے مانوس ہوگیا۔ اور رفتہ رفتہ وہ خیالات جو اس کی پریشانی کا باعث تھے۔ محو ہوگئے —— اس کے چہرے سے اب آہنی ارادے کے آثار نمایاں تھے۔ وہ اس زندگی اور اس عرصہ کو خندہ پیشانی کو خندہ پیشانی کے ساتھ گذارنا چاہتا تھا۔ خواہ وہ کیسی ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔

کلاڈے کی ہستی جیل میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی۔ اپنے ہم اسیر قیدیوں کے درمیان اس کا بہت رتبہ تھا۔ وہ تمام اس کی عزت کرتے اور اس سے اپنی اپنی مشکلات بیان کرکے مشورہ لیتے۔

تین ماہ سے کم عرصہ میں کلاڈے نے ہر شخص کے دل میں جگہ کر لی۔ اور اسی عرصہ میں ورکشاپ کے قیدیوں کا لیڈر بن گیا۔ وہ سب اس کی پرستش کرتے۔ حتیٰ کہ کئی دفعہ وہ گمان کرنے لگتا۔ کہ وہ بادشاہ ہے۔ ایک اسیر بادشاہ ہے۔ اپنے معتقدوں کے درمیان یہ لازمی امر تھا۔ کہ یہ ہر دلعزیزی اور شہرت دیگر افراد کے دلوں میں حسد کی چنگاریاں پیدا کرتی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ محافظوں کے دلوں میں کلاڈے کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا —— یہ اجنبی بات نہ تھی —— ہر دلعزیزی اور نفرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے —— مگر غلاموں کی محبت، آقا کی حقارت اور نفرت سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔

بدقسمتی سے کلاڈے لمبا، خوبرو واقع ہوا تھا۔ اس کی بھوک مٹانے کے لئے اس کی اپنی غذا ناکافی تھی۔ آزادی کے ایام میں وہ محنت سے اپنی پوری غذا مہیا کر لیتا۔ مگر دوران اسیری وہ دن بھر کام کرتا۔ تو بھی اسے پیٹ بھر کر کھانا نہ ملتا۔ وہ ہمیشہ بھوکا رہتا۔ مگر اس کی شکایت کے الفاظ اس کی زبان پر ہرگز نہ آئے۔ وہ اسی خصلت کا مالک تھا۔

ایک روز جبکہ کلاڈے اپنا کھانا ختم کرکے کام میں مشغول ہوا چاہتا تھا۔ اس

"محفوظ" کر اپنے کام میں محو کرنا چاہتا تھا کہ ایک دبلا پتلا قیدی ایک ہاتھ میں چاقو دوسرے میں کھانا پکڑے ہوئے اس کی جانب آیا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ جھجک گیا۔

"کیا چاہتے ہو تم" کلاوے نے اس سے درشت لہجے میں دریافت کیا۔

"ایک عنایت"

"عنایت؟"

"میرے پاس ضرورت سے زیادہ کھانا ہوتا ہے۔ مہربانی فرما کر اس میں سے تھوڑا سا آپ لے لیا کریں"

کلاوے کی آنکھیں نمناک ہو گئیں بغیر کسی تکلف کے اس نے کھانے کے دو حصے کئے۔ اور اپنا حصہ کھانا شروع کر دیا۔

"شکریہ! مگر کیا ہی اچھا ہو۔ کہ آپ ہر روز اسی طرح میرے کھانے میں حصہ لیا کریں" اس لڑکے نے مودبانہ کہا۔

"تمہارا نام؟"

"البین"

"تم یہاں کس طرح آئے"

"چوری کے جرم میں"

"خیر میرا بھی یہی جرم ہے۔"

البین بیس سال کا نوجوان تھا۔ مگر غیر معمولی کمزوری سے پندرہ سال کا معلوم دیتا تھا۔ کلاوے گو ۳۵ سال کا تھا۔ مگر لیکن اوقات پچاس سال سے بھی زیادہ عمر کا معلوم دیتا۔

ان دونوں کا رشتہ آپس میں باپ بیٹے جیسا تھا۔ البین ابھی بچہ تھا۔ اور کلاوے پیش از وقت بڈھا۔ وہ دونوں ایک ہی جگہ مشقت کرتے۔ ایک ہی جگہ سوتے۔ وہ

بہت خوش تھے۔ ـــ وہ ایک دوسرے کیلئے دنیا تھے۔
ہم جیل کے ناظم کے متعلق اس سے پیشتر بھی یہی ذکر کر چکے ہیں۔ کہ کلاڈے کا وجود اس کی نگاہ میں خار کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ کلاڈے قیدیوں کی نظروں میں بہت وقعت رکھتا۔ اور وہ اس کا ہر حکم ماننے کے لیے بسر و چشم حاضر رہتے۔
ایک دن جیل میں کسی قسم کی شورش پیدا ہو گئی۔ اور قیدیوں نے ناظم کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ناظم اور محافظوں نے لاکھ سر پٹکا مگر کچھ بن نہ آئی۔ لیکن کلاڈے کے دو الفاظ نے ان سب کو جھکا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ حسد کی چنگاری نے اب آگ کی صورت اختیار کر لی۔ اصلاح شدہ مجرم کی صورت اس لئے نفرت پیدا کر گئی ـــ راستی پر قوت کے غلبہ کی عیاں مثال۔
اس نوعیت کی نفرت جو سینہ میں خفیہ طور پر پرورش پاتی رہے۔ اس آتش فشاں پہاڑ کی طرح ہے۔ جس نے برسوں آگ نہ اگلی ہو۔
ایلبین کی رفاقت نے کلاڈے کو ناظم کے وقار سے بالکل غافل کر دیا تھا۔ ایک روز جبکہ دونوں کام میں مشغول تھے۔ ایک وارڈر آیا۔ اور ایلبین سے ناظم کے روبرو پیش ہونے کو کہا۔
"تمہیں ناظم نے کیوں بلا بھیجا ہے؟" کلاڈے نے ایلبین سے پوچھا۔
"معلوم نہیں"
ایلبین وارڈر کی معیت میں ناظم کے پاس چلا گیا۔ سارا دن گذر گیا۔ مگر ایلبین واپس نہ آیا ـــ بے سود اس کا انتظار کرتا رہا۔ رات ہونے پر بھی جب وہ نہ آیا تو نہایت بیقراری کی حالت میں اپنے محافظ سے پوچھا۔
"ایلبین بیمار ہے کیا؟"
"نہیں تو!" محافظ نے جواب دیا۔

"تو پھر کیا وجہ ہے۔ کہ وہ دن بھر سے غائب ہے"

"تمہیں معلوم نہیں، اس کا کمرہ تبدیل کر دیا گیا ہے" محافظ نے لاپروائی سے کہا۔

محافظ کے اس جواب پر کلاؤدے کا ہاتھ جس میں وہ شمع پکڑے ہوئے تھا۔ کانپا۔

"کس کے حکم سے؟" کلاؤدے نے تحمل سے کہا۔

"موسیو ڈی ——— کے حکم سے ——— یہ ناظم کا نام تھا۔

دوسرے روز شام کو ناظم حسب معمول کام کی دیکھ بھال کیلئے آیا۔ کلاؤدے نے اسے دیکھتے ہی اپنی اُونی ٹوپی سنبھالی۔ اور کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے ایک بنچ کے قریب کھڑا ہو گیا ——— یہ زنداں کے آداب میں سے ایک آداب ہے

جب ناظم اس کے قریب سے گذرا۔ تو کلاؤدے نے مؤدبانہ لہجہ میں کہا۔

"جناب"

ناظم مڑا۔

"جناب! کیا واقعی آپ نے البین کو دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا ہے"

"ہاں" ناظم نے جواب دیا۔

"جناب میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ آپ کو معلوم ہے۔ کہ میرے لئے اپنا کھانا ناکافی ہوتا ہے۔ اس لئے البین اپنے کھانے سے کچھ حصہ مجھے دیدیا کرتا تھا۔

"مگر مجھے اس سے کیا سروکار؟"

"جناب! کیا آپ اتنی عنایت نہیں کر سکتے کہ البین کو پھر میرے پاس واپس بھیج دیں"

"ناممکن! میرے احکام میں تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی"

"یہ حکم کس کا ہے؟"

"میرا!"

"تو پھر جناب ہی پر میری زندگی کا انحصار ہے۔"
میرا حکم تبدیل نہیں ہو سکتا۔
"جناب! کیا آپ کو مجھ سے عداوت ہے؟"
"نہیں"
"تو پھر آپ ایلین کو مجھ سے کیوں جدا کر رہے ہیں؟"
"اس لئے کہ یہ میری خواہش ہے۔"
یہ کہہ کر ناظم چلا گیا۔ کلادے اس شیر کی مانند جو اپنے شکار سے محروم کر دیا گیا ہو۔ سر جھکائے کھڑا تھا۔
"ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ یہ غم کلادے کی بھوک میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکا۔ وہ پہلے کی طرح ہی بھوکا رہا۔ اور بہت سے قیدیوں نے برضا و رغبت اپنا کھانا اُسے پیش کرنا چاہا۔ مگر اس نے خندہ پیشانی سے انکار کر دیا۔
کلادے حسب معمول خاموشی سے اپنا کام کرتا۔ اور ہر روز شام کو ناظم سے پُر درد اور غصہ آمیز لہجہ میں ——— دعا اور دھمکی کے مابین حرف دو الفاظ کہتا ———
"اور ایلین" مگر اس کے جواب میں ناظم کا یہ طرز عمل کسی حالت میں بھی قابل ستائش نہ تھا۔ اور یہ بھی صاف عیاں تھا کہ کلادے نے اس طرز عمل کے انسداد کیلئے کوئی تہیہ کر لیا ہوا ہے تمام زندان ہٹ دھرمی اور آہنی ارادہ کے درمیان فیصلہ کن جنگ دیکھنے کا منتظر تھا۔
ایک روز وہ ناظم سے یہ کہتا ہوا سنا گیا۔
"جناب! ایلین کو میرے پاس بھیج دیجئے۔ کیونکہ آپ کی اسی میں بہتری ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ میرے الفاظ مت بھولئے آپ!"
ایک اتوار کو وہ گھٹنوں سر کو زانوؤں میں دیئے صحن میں بیٹھا رہا۔ اور جب ایک قیدی میٹ نے اس سے پوچھا۔ کہ وہ کیوں مغموم سا ہے۔ تو کلادے نے سر کو اوپر اٹھاتے

ہوئے جواب دیا۔

"میں کسی شخص کا فیصلہ مرتب کرنے میں مصروف ہوں"

۲۵ ر اکتوبر ۱۸۳۱ء کی شام کو کلاڈ نے اپنی گھڑی کا شیشہ زمین پر اس غرض سے پھینکا۔ کہ ناظم کی توجہ اپنی طرف منبذول کرائے۔ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گیا ۔۔۔۔ ناظم آیا۔

"یہ شیشہ میں نے پھینکا تھا۔ جناب! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ میرے رفیق کو میرے پاس بھیج دیجیے" غلام نے کہا۔

"ناممکن ہے۔" آقا نے جواب دیا۔

"آپ کو ایسا کرنا پڑے گا" کلاڈ نے کہا۔ اور ناظم کی آنکھوں سے آنکھیں ملاتے ہوئے نہایت استقلال سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"دیکھئے آج اکتوبر کی ۲۵ ہے۔ میں آپ کو ۴ ر نومبر تک اس معاملہ پر سوچنے کی مہلت دیتا ہوں"

ایک وارڈر جس نے یہ الفاظ سنے۔ دھمکی پر تعبیر کئے۔ اور ناظم سے کلاڈ کے لئے سزائے تخلیہ تجویز کی۔ مگر ناظم نے اس بات کی کوئی پروا نہ کی۔ وہ ان الفاظ سے خائف نہ ہوا۔

دوسرے روز ایک اور قیدی نے کلاڈ کی مغموم طبع کے بارے میں سوال کیا

"کلاڈ تم کن خیالات میں غرق رہتے ہو۔"

"مجھے ڈر ہے۔ کہ ہمارے اچھے ناظم پر کوئی نہ کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے" کلاڈ نے جواب دیا۔

۲۵ ر اکتوبر اور ۴ ر نومبر میں پورے نو دن باقی تھے۔ اس قلیل مدت کے بعد ناظم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

کلادے ہر روز ناظم کے گوش گزار کر دیتا۔ کہ وہ اہلین کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان گزارشوں سے ناظم تنگ آ گیا۔ اور ایک روز اسے چوبیس گھنٹہ کی سزائے تخلیہ دیدی ——— رندانہ عجز و انکسار کا جواب۔

۴ رنومبر آ پہنچا۔ اس صبح کلادے نہایت اطمینان قلب سے خواب سے بیدار ہوا۔ گذشتہ ایام کی یادگاریں نکالیں۔ تاکہ انہیں جی بھر کے ایک دفعہ دیکھ لے۔ ایک قینچی اور ایک کتاب جو اس ہستی کی ملکیت تھی جسے وہ جان سے زیادہ عزیز جانتا تھا یعنی اس کی بیوی۔ ان عزیز چیزوں کو جیب میں رکھ کر وہ صحن میں ٹہلنے لگا۔ کہ ایک قیدی اس کی نظر پڑا۔ جو موٹی موٹی آہنی سلاخوں کے درمیان سے اس کی طرف متجسسانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"آج رات کو میں ان سلاخوں کو قینچی سے کاٹ ڈالوں گا" کلادے نے قینچی دکھاتے ہوئے کہا۔ قیدی اس ناممکن اور محیرالعقول بات کو سن کر ہنسنے لگا۔ کلادے بھی اس ہنسی میں شامل ہو گیا۔

اس دن اس نے غیر معمولی انہماک سے کام کیا۔ تاکہ اس چیز کی تیاری میں کوئی نقص باقی نہ رہ جائے۔ جس کے عوض اسے کھانا ملتا تھا۔

دوپہر سے کچھ پہلے وہ کسی بہانہ سے چوب سازوں کے کمرہ میں چلا گیا۔ جہاں قیدیوں نے اس کا پرجوش استقبال کیا ——— کلادے کی ہر جگہ عزت تھی۔

وہ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ جیسے وہ اس کے منہ سے کوئی کلمہ سننے کیلئے بیتاب ہوں۔ کلادے نے کمرہ میں نگاہیں دوڑائیں۔ اور مطمئن ہو کر کہ جیل کا کوئی وارڈر اس وقت موجود نہ تھا۔ یوں گویا ہوا۔

"کیا تم میں سے کوئی مجھے اپنی کلہاڑی دے سکتا ہے۔؟

"کس غرض کے لئے" انہوں نے دریافت کیا۔

"ناظم کو قتل کرنے کی خاطر" اس نے فوراً جواب دیا۔

اس پر سب نے اپنی اپنی کلہاڑیاں پیش کیں۔ کلاوے نے ان سب میں سے چھوٹی کلہاڑی منتخب کر کے اسے اپنے کوٹ کے دامن میں چھپا لیا۔

اس وقت ستائیس قیدی موجود تھے۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی اس راز کو افشا نہ کیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس واقعہ کے بعد اس موضوع پہ گفتگو تک نہ کی مگر وہ آنے والے حادثہ کے منتظر تھے۔ وہ حادثہ گو ہولناک تھا مگر بہت آسان۔

صحن سے گذرتے ہوئے کلاوے کو ایک قیدی ٹہلتا ہوا ملا جس نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کوٹ میں کیا چھپائے ہوئے ہے۔

"ایک کلہاڑی! موسیو ڈی ——— کے قتل کرنے کیلئے! تمہیں نظر آرہی ہے کیا؟" کلاوے نے کہا۔

"بہت کم" قیدی نے جواب دیا۔

دن کا بقایا حصّہ حسب معمول مصروفیتوں میں گذر گیا۔ سات بجے شام قیدی اپنے اپنے ورکشاپوں میں منتقل کر دیئے گئے تاکہ ناظم انکی حاضری لے سکے۔

کلاوے روزمرہ کی طرح اپنے ہم اسیروں کے ساتھ ایک بڑے سے ورکشاپ میں بند تھا۔ اس وقت اپنی قسم کا واحد واقعہ پیش آیا۔

کلاوے نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر مندرجہ ذیل تقریر شروع کی۔

"تمہیں معلوم ہے۔ کہ ایلین اور مجھ میں ایک بھائی کا رشتہ تھا۔ اولاً میری پسندیدگی کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ وہ اپنا کھانا میرے ساتھ تقسیم کرتا۔ مگر بعد ازاں وہ پسندیدگی محبت میں تبدیل ہو گئی۔ جب وہ میرے ساتھ الفت کا اظہار کرنے لگا۔

ہم دونوں کی دابستگی موسیو ڈی ——— کیلئے کسی حالت میں بار خاطر نہ تھی۔ مگر اس نے صرف ہٹ دھرمی اور حسد کی خاطر ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔

صرف اس لئے کہ وُہ بدخصلت ہے۔

میں نے اس سے بارہا التجا کی۔ کہ وُہ ایلین کو میرے پاس واپس بھیج دے۔ مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ آخرکار میں نے اُسے ۲ نومبر تک اس معاملہ پر سوچنے کے لئے کہا جس پر مجھے سزائے تخلیہ دی گئی۔ میں نے اسے ترازوئے عدل میں تولا تو اُسے سزائے موت کا مستحق پایا۔ چنانچہ میں نے اسکی موت کا دن ۴ نومبر مقرر کیا ہے۔ وہ ابھی ابھی یہاں آئیگا میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ میں اسکی جان لینے پر تلا ہوا ہوں۔ کیا تمہیں اس کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔؟"

قبر کی خاموشی چھائی۔

کلادے نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ اور اپنے رفیقوں سے۔ اکیاسی چوروں سے وجوہات بیان کرنی شروع کیں۔ جو اس عمل کی محرک ہوئی تھیں۔

"میں اس خطرناک اقدام پر اس لئے مجبور ہوں۔ کہ راستی پر ہوں۔ اس لئے کہ اس نے مجھے سخت روحانی تکلیف پہنچائی ہے۔ اس لئے کہ میں دو ماہ کے غور و فکر کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس اقدام کے معنے میری موت ہے۔ چونکہ میں راستی پر ہوں اس لئے مجھے اپنی قربانی کی کوئی پرواہ نہیں اگر تم میں سے کوئی اس کے خلاف کہنا چاہتا ہے تو وہ علانیہ کہے۔"

اس قبر جیسی خاموشی میں صرف ایک آواز نے چلا کر کہا۔

"مگر قتل کرنے سے پیشتر تمہیں پھر اسے ایک دفعہ متنبہ کرنا چاہئے۔"

"درست ہے۔ میرے دوست میں اسے اطلاع دے دونگا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی چند ایک چیزیں جو اسے نہایت عزیز تھیں ان قیدیوں میں تقسیم کر دیں لیکن قینچی اپنے پاس رکھ لی۔ ہر ایک قیدی سے بغلگیر ہوا۔ ان میں سے اکثر اس منظر کو بغیر آنسو بہائے نہ دیکھ سکے۔

کلاڈے حسب معمول خوش گپیوں میں مشغول ہو گیا۔اس کو اس طرح دیکھ کر بعض نے خیال کیا کہ وہ اس خوفناک ارادہ سے باز آ گیا ہے۔

ایک نوجوان قیدی کلاڈے کے خوفناک ارادہ سے ابھی تک خائف ایک کونے میں کھڑا کانپ رہا تھا۔

"نوجوان آدمی! ہمت کرو بس ایک لمحہ کا کام ہے" کلاڈے نے اس سے کہا۔

کلاڈے نے ہر ایک سے مصافحہ کیا۔ اور الوداع کہنے کے بعد سب کو حکم دیا۔ کہ وہ اپنے اپنے کام میں مشغول ہو جائیں۔ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔

وہ خود بھی اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ اچانک گھڑی کے گجر کی آواز سنائی دی۔ اس پر وہ اُٹھا۔ اور دروازے کے قریب خاموش کھڑا ہو گیا۔

دروازہ کھلا۔ اور ناظم کمرے میں داخل ہوا۔ وہ حسب معمول نہایت اطمینان سے کسی حادثہ سے بے خبر گذر رہا تھا۔ کہ اپنے پیچھے کسی کی آہٹ سن کر مڑا۔ تو کلاڈے کو کھڑا پایا۔

"تم اس جگہ کیا کر رہے ہو۔ اپنی جگہ پر کیوں نہیں جاتے۔" ناظم نے پوچھا۔

"میں جناب سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں" کلاڈے نے مودبانہ کہا۔

"وہ کیا؟"

"البین کی واپسی۔"

"پھر وہی ضد۔"

"ہوشیار رہیے گی۔"

"معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمہارے لیے ہم نے گھنٹہ سزائے تخلیہ ناکافی تھی" ناظم نے وہاں سے چلتے ہوئے کہا۔

"جناب میرا رفیق مجھے واپس عنایت کیجیے" کلاڈے نے اس کے پیچھے چلتے

ہوئے کہا۔

" ایسا ہونا ناممکنات سے ہے۔" ناظم نے جواب دیا۔

" جناب میں پھر ایک دفعہ التجا کرتا ہوں۔ کہ میرے رفیق کو میرے پاس بھیجد یجئے۔ پھر آپ دیکھیں گے۔ کہ میں کس طرح دل لگا کر کام کرتا ہوں۔ آپ آزاد ہیں۔ اس لئے آپ اس شخص کے احساسات قلب کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جس کا دنیا میں ایک ہی دوست ہو۔ ایک ہی رہا سہا سہارا ہو۔ زندان کی چار دیواری میں اس رفیق کی موجودگی ہی میرے لئے دنیا کی عزیز ترین نعمت ہے۔ آپ آزادانہ چل پھر سکتے ہیں۔ آپ کے لئے دنیا میں سب کچھ موجود ہے۔ مگر میرے لئے ایلین ہی دنیا ہے۔ خدا کیلئے! اسے میرے پاس بھیجد یجئے۔ یہ بھی آپکو معلوم ہے۔ کہ وہ اپنا کھانا میرے ساتھ تقسیم کیا کرتا تھا۔ اگر ایک تیرہ بخت انسان کلادے اس جگہ اپنے رفیق کے ساتھ تنہائی کے ایام بسر کرے۔ تو اس میں آپ کا کیا ہرج ہے۔ آپ سے صرف اجازت چاہتا ہوں —— " صرف ہاں "

جناب! میرے اچھے جناب! میں خدا کے نام پر ملتجی ہوں۔ کہ میری گذارش کو قبول فرمائیے۔

یہ کہہ کر کلادے جذبات کا طوفان سینہ میں دبائے ناظم کے جواب کا منتظر تھا۔

" یہ کبھی نہ ہوگا! میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں۔ کہ میرے احکام میں تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔ جاؤ تم ستاتے ہو " یہ کہہ کر ناظم نے دروازہ کی جانب رُخ کیا۔

اکیاسی چوروں پر قبر جیسی خاموشی طاری تھی۔

کلادے نے ناظم کے کندھے کو چھوا اور کہا " مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ آخر کن وجوہ کی بنا پر آپ میرے ساتھ ظلم کر رہے ہیں ؟"

" اس لئے کہ یہ میری مرضی ہے۔" ناظم نے جواب دیا۔

یہ جواب سُنکر کلاوے ایک قدم پیچھے ہٹا۔ ایک سو باسٹھ[۱۶۲] آنکھوں نے اُسے کوٹ سے کلہاڑی نکالتے ہوئے دیکھا۔ ایک لمحہ میں ناظم کی لاش زمین پر بے جان پڑی تھی۔ تین ضربوں نے اس کے سر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے کلہاڑی کی چوتھی ضرب سے اس کی شکل پہچاننی مشکل تھی۔

کلاوے نے جو غصہ و انتقام سے اندھا ہو رہا تھا۔ ایک اور کلہاڑی ناظم کی بے جان لاش پر پورے زور سے ماری۔ مگر بے فائدہ ناظم پہلے وار سے ہی سرد ہو چکا تھا۔ کلہاڑی کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کلاوے چلایا" اب دوسرا

دوسرا وہ خود آپ تھا۔ اپنی بیوی کی قینچی نکال کر اس نے اپنی چھاتی میں پیوست کر لی۔ مگر حسب مقصود نتیجہ نہ نکلا۔ قینچی اس کی مضبوط چھاتی میں اچھی طرح نہ جا سکی۔ قینچی سے بیس وار کئے۔ اور کئے۔ مگر بے سود۔ آخر کار چلایا۔ لعنت! دل کی جگہ بھی نہیں ملتی کہاں ہے" کہا۔ اور خون آلودہ بے ہوشی کے عالم میں زمین پر گر پڑا۔

" بتایئے ان دونوں میں سے کون کس کا شکار تھا۔؟

جب کلاوے نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو پٹیوں سے ملبوس ہسپتال میں پایا۔ اس کے آس پاس ہسپتال کی نرسیں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اس کی طبیعت کا حال پوچھا۔

خون کی مقدار اس کے بدن سے خارج ہو چکی تھی۔ اور قینچی کے زخم بہت خطرناک صورت اختیار کر گئے تھے۔ مگر سب سے مہلک ضربات وہ تھیں۔ جو موسیو ڈی کے جسم پر پڑیں۔

ہوش آنے پر سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ ناظم کے قتل کے بارے میں اس سے سوالات کئے جانے لگے۔ ان کے جواب میں اس نے بہادرانہ طور اعتراف جرم کر لیا۔

تھوڑے دنوں بعد اس کے زخموں نے نہایت خوفناک صورت اختیار کرلی۔ جس کی وجہ سے اس کے جسم کی حرارت بہت تیز ہوگئی۔

نومبر۔ دسمبر، جنوری اور فروری علاج معالجہ میں ہی گذر گئے۔ معالج اور منصف دونوں اس کی حالت دیکھنے آتے ـــــ معالج اس کا علاج کرنے۔ اور منصف تختہ دار مہیا کرنے کے لئے۔

خیر ١٦ مارچ ١٨٣٢ء کو جب کلادے بالکل روبہ صحت ہوگیا۔ تو اس کا مقدمہ ٹرائے کی عدالت میں پیش ہوا۔ کمرہ عدالت تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

کلادے کی ظاہری صورت نے ججوں کے دل میں اس کی نسبت اچھی رائے قائم کردی۔ اس کا خط بنا ہوا تھا۔ وہ ننگے سر مجرموں کے لباس میں کٹہرے کے نزدیک کھڑا تھا۔

سرکاری وکیل نے بطور حفظ ماتقدم دروازوں پر پولیس افسر مقرر کر دیئے تھے۔ تاکہ ان قیدیوں کے درمیان جو اس مقدمہ کے گواہ تھے۔ کوئی گڑبڑ واقع نہ ہو جائے۔ دوران مقدمہ ایک نئی مشکل پیش آئی۔ ان گواہوں یعنی قیدیوں میں سے کوئی شخص بھی اس معاملہ کے متعلق گفتگو کرنے کو تیار نہ تھا۔ ججوں اور انسپکٹروں نے دھمکیاں دیں۔ مگر بے سود۔ وہ کلادے کے خلاف ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نکالنے کے لئے تیار نہ تھے۔

کلادے کا اصرار اور ہدایت ہی صرف اُن کی زبان کھلوا سکی۔ جس پر انہوں نے چشم دید حالات کو من وعن سنا دیا ـــ جہاں کہیں وہ اس خونی داستان کے بیان دینے میں رک جاتے۔ کلادے اُن کو صحیح واقعہ بتلا دیتا۔

اس منظر کو دیکھ کر کمرہ عدالت میں موجود عورتوں کی آنکھوں سے آنسو

وہاں تھے۔ اب نقیب نے الیتین کو پکارا۔

الیتین وفورِ جذبات سے متاثر ہوتا یا تھر تھر آتا ہوا آیا۔ اور آتے ہی اپنے آپ کا کلاودسے کی باہوں میں ڈال دیا۔

"یہ وہی بدبخت انسان ہے۔ جس نے ایک بھوکے کو روٹی کھلائی —"

کلاودسے نے سرکاری وکیل کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

یہ کہہ کر وہ الیتین کی طرف بڑھا۔ اور اس کے ہاتھوں کا بڑی محبت سے بوسہ لیا۔

جب سب گواہوں کا بیان ہو چکا تو سرکاری وکیل اٹھا اور جیوری کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا:۔

"جیوری کے جملہ اراکین! سوسائٹی کو بہت حرج ہوگا۔ اگر اس قسم کے قانون کو سزائے موت نہ دی گئی۔ جس نے ————"

———— سرکاری وکیل کے بیان کے بعد کلاودسے کے وکیل نے جرح کی ————

جرح جو عموماً ایسی نام نہاد عدالتوں میں اس موقع پر ہوا کرتی ہے۔

کلاودسے کا بیان ہوا۔ تو حاضرین کی آنکھیں فرطِ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جب انہوں نے ایک غریب اور جاہل مزدور سے ایک فاضل مقرر کے سے الفاظ سنے بغیر کسی لغزش کے کلاودسے نے تمام واقعات کمال راستبازی سے بیان کر دیئے۔ وہ کٹہرے میں اس انداز سے کھڑا تھا۔ جیسے وہ سچ بولنے پر تلا ہوا ہے۔

دورانِ بیان بعض دفعہ ایسا موقع آتا کہ ہجوم پر اس کے ہر لفظ کا اثر دکھائی دیتا۔ اس شخص — علم سے محض نابلد شخص نے اپنی جواب میں بہت سے وزنی دلائل پیش کیئے جن کی اس سے توقع نہ تھی۔ مگر دورانِ گفتگو میں اس نے ادب کو ہاتھ

سے نہ جانے دیا۔ لیکن جب سرکاری وکیل نے یہ کہا۔ کہ قتل کی واردات فوری غصہ اور رنج کا باعث نہ تھی۔ تو کلاڈ سے کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔

مجھے رنج دہ پہنچایا گیا۔ درست ہے۔ اگر کوئی شراب سے مخمور مجھ پر حملہ کرتا۔ اور میں اُسے جان سے ہلاک کر دیتا۔ تو تم اس فعل کو فوری غصہ پر تعبیر کرتے۔ سزائے موت کو حبس دوام میں تبدیل کر دیتے۔ مگر ایک شخص نے جس نے ہر ممکن طریقہ سے مجھے مجروح کرنا چاہا۔ جو متواتر چار سال میری ذہنی اذیت کا باعث رہا جس نے اسی قدر عرصہ تک مجھے ذلیل بنائے رکھا۔ جو ہر روز میرا تمسخر اڑاتا۔ جس کا دن کے چوبیس گھنٹے اور چار سال تک یہی مشغلہ رہا کہ وہ اپنے ترکش کے تیر مجھ پر خالی کرتا رہے۔ جب میں نے اپنے مصائب و نوائب کے منبع کو تباہ کیا۔ تو تم کہتے ہو۔ کہ وہ عمل فوری غصہ سے محرک ہوا۔

میرے ساتھ ایک عورت کا دامن وابستہ تھا۔ جس کی خاطر میں نے چوری کی۔ وہ اس کی بابت میرے احساسات مجروح کرتا رہا میں ایک بچے کا باپ تھا۔ جس کی خاطر میں نے ایسا رذیل کام کیا۔ وہ اس بچے کی باتیں سنا سنا کر میرے زخموں پر نمک پاشی کرتا رہا۔ میں بھوکا تھا۔ ایک دوست نے مجھے اپنا کھانا پیش کیا۔ وہ اس دوست کو مجھ سے جدا کر کے گیا۔

میں نے اس کی خدمت میں التجا کی۔ اس نے مجھے اندھیری کوٹھڑی میں دھکیل دیا۔ جب میں نے اپنی تکلیفات کا اظہار کیا۔ تو اس نے جواب دیا۔ کہ اس کے کان ایسی باتوں کی سماعت کے لئے تیار نہیں۔

اگر تم میری جگہ ہوتے۔ تو کیا کرتے؟

میں نے ان مصیبتوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس شخص کو جو میری قلبی تکلیفات کا باعث تھا قتل کر دیا۔ تم اس قتل کو وحشیانہ عمل گردانتے ہو سکتے ہو۔

کہ مجھے صعوبات نہیں پہنچائی گئیں۔ سو تم میرا سر قلم کرنے کے درپے ہو۔ بصد خوشی کہ وہ میرا سر تمہارے ہاتھوں کا کھلونا بننے کے لئے حاضر ہے "

انسانی قانون اس نوعیت کے فوری غصہ کو اس قسم کے مظالم کا فیصلہ کرتے وقت پیش نظر نہیں رکھتا صرف اس لئے کہ اس وار کے نشانات غیر مرئی ہوتے ہیں

جیوری بحث ختم ہوتے ہی فیصلہ مرتب کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اور کلاڈے کے اس عمل کو خونریزی کا ایک بھیانک عمل قرار دیا۔ اور اس کی زندگی کا نقشہ یوں کھینچا۔ کلاڈے کی زندگی کی ابتدا ایک ایسی لڑکی سے ہوئی۔ جو اس کی بیاہتا نہ تھی۔ اس نے چوری کی۔ پھر قتل کیا۔ یہ سب کچھ سچ تھا۔

فتویٰ صادر کرنے سے پیشتر جیوری نے کلاڈے سے دریافت کیا۔ کہ آیا اسے اس بارے میں کچھ اور کہنا ہے۔

" بہت کم! میں چور ہوں۔ قاتل ہوں۔ میں جملہ اراکین جیوری سے صرف اس قدر دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ کہ وہ کونسا امر تھا جس نے مجھے چوری کرنے پر مجبور کیا۔ وہ کونسی شئے تھی۔ جو میرے قاتلانہ حملہ میں محرک ہوئی؟"

جیوری بغیر جواب دیئے دوسرے کمرے میں فیصلہ مرتب کرنے کی خاطر چلی گئی۔ شہر کے ان بارہ معززین۔ ان نام نہاد اراکین نے کلاڈے پر موت کا فتویٰ صادر کیا۔ فیصلہ کرتے وقت ان کے پیش نظر کلاڈے کا دوسرا نام "گیو" یعنی بدمعاش بھی تھا۔ جو خاص طور پر ان کے فیصلہ کرنے میں محرک ہوا

جب حکم سنایا جا چکا تو کلاڈے نے صرف اس قدر کہا " مجھے یہ سزا قبول ہے۔ مگر مقام تاسف ہے۔ کہ انہوں نے میرے دو سوالات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے چوری کیوں کی؟ اور میں نے قتل کس بنا پر کیا۔؟

زندان میں اس رات کو اس نے خواب سیر ہو کر کھانا کھایا!

کلاؤدے نے رحم کی درخواست کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر جب اس نرس نے جس نے اس کی تیمارداری کی تھی۔ اس بات پر اصرار کیا۔ تو وہ رضامند ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ یہ رضامندی صرف نرس کی خوشنودی کی خاطر تھی۔ کیونکہ جس وقت اس کی درخواست پیش ہوئی۔ تو رحم کی درخواست کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ کلاؤدے نے عمداً دیر لگا دی تھی۔

جس وقت نرس اُسے یہ خبر سنانے کیلئے آئی تو دفورِ جوش اور محبت سے اُسے پانچ فرانک کا نوٹ دیا جسے کلاؤدے نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے پاس رکھ لیا۔

اس کے ہم اسیر قیدیوں نے جو سب کے سب اس کے دامِ الفت میں گرفتار تھے۔ ہر ممکن ذریعہ سے اس کی فراری کیلئے کوشش کی۔

انہوں نے روشندان کے ذریعے کلاؤدے کی کوٹھری میں ایک کیل کچھ تار اور ایک لوہے کا ٹکڑا پھینکا۔ ان چیزوں میں سے کوئی ایک بھی اس کی فراری کا موجب ہو سکتی تھی۔ مگر اس نے وہ سب چیزیں وارڈ کے حوالے کر دیں۔

۸ رجون ۱۸۳۲ء کو قتل کے واقعہ سے پورے سات ماہ چار دن بعد محافظ جیل کلاؤدے کے پاس آیا۔ اور اُسے مطلع کر دیا۔ کہ اس کی زندگی میں اب صرف ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس کی درخواست رحم مسترد کر دی گئی تھی۔

"میں نے نہایت اطمینان سے آج کی رات بسر کی ہے اور امید کرتا ہوں کہ اسی طرح آخری لمحات بھی گذار دونگا" کلاؤدے نے محافظ سے کہا۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کے آہنی ارادہ رکھنے والے انسان موت سے کبھی خائف نہیں ہوتے۔ بلکہ موت کی آمد پر نہایت عالی حوصلگی سے گفتگو کرتے ہیں۔

کلاؤدے کی کوٹھری میں پہلے پادری آیا۔ بعد ازاں جلاد۔ پادری کے ساتھ

کلاوے نہایت ادب اور سلوک سے پیش آیا۔ اور بہت عرصہ تک دینی علوم سے نا اہل ہونے پر اظہارِ تاسف کرتا رہا۔ اپنے آپ کو دینی معلومات سے فائدہ نہ حاصل کرنے کی بنا پر لعنت ملامت کرتا رہا۔

جلاد کے ساتھ بھی وہ ایسے ہی خلوص سے پیش آیا۔ درحقیقت اس نے اپنی روح پادری کے حوالے کر دی تھی۔ اور اپنا جسم جلاد کے۔

جب اس کے بال تراشے جا رہے تھے تو کسی نے ذکر کیا۔ کہ اس گرد و نواح میں ہیضہ پھیل رہا تھا۔ اور امکان تھا۔ کہ بہت تھوڑے عرصے میں ٹرائے بھی اس موذی مرض کا شکار ہو جائے گا۔

"مجھے اس سے کیا تعلق۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہیضہ کیا کوئی مرض بھی مجھ پر اثر نہ کر سکے گا۔" کلاوے نے متبسمانہ لہجے میں کہا۔

خودکشی کے وقت کلاوے سے قینچی ٹوٹ گئی تھی۔ آدھا حصہ اس کے پاس ابھی تک موجود تھا۔ اس نے وصیت کی۔ وہ حصہ اس کے رفیق البین کو دے دیا جائے۔ اس کا آدھا حصہ اس کی چھاتی میں زخموں کی صورت میں پنہاں تھا۔ یہ بھی خواہش کی۔ کہ اس کا شام کا کھانا بھی اس کے دوست کو دے دیا جائے۔

اگر کچھ چیز اپنے پاس رکھی۔ تو پانچ فرانک کا نوٹ جو کہ اُسے نرس نے دیا تھا۔ وہ اُسے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ جب اُسے رسی میں باندھا گیا۔

پونے آٹھ بجے یہ ماتمی جلوس زندان سے گلو بریدی کے چبوترہ کی طرف روانہ ہوا۔ کلاوے نہایت استقلال کے ساتھ اس چبوترہ پر چڑھا۔ اس کی آنکھیں پادری کی صلیب پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ صلیب اس کے پنہاں زخموں پر مرہم کا کام دے رہی تھی۔ اس ہیبتناک مشین پر باندھے جانے سے پیشتر اس نے پادری کو پانچ فرانک کا نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ "غریبوں کے لئے۔"

مگر چونکہ آٹھ بجے کا گجر بج رہا تھا اس لئے پادری اس شور میں کلاڈے کی آواز کو نہ سن سکا۔ کلاڈے نے گھنٹہ کا شور ختم ہوتے ہی پھر ایک دفعہ پادری سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "منوسینیئر کے لئے۔"

ابھی یہ لفظ اس کی زبان پر ہی تھے۔ کہ یہ شریف اور حساس سر جسم سے علیحدہ ہو چکا تھا۔

سزائے موت کیلئے رسم الموت مقرر کیا گیا تھا۔ تمام روز گلو بریدی کی مشین لوگوں کے خیالات و حسیات کو مشتعل کرتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہجوم کے ہاتھوں ایک ٹیکس وصول کرنے والا سر کا قتل ہوتے ہوتے بچ گیا۔ کیا ان کے پیشِ نظر یہی نظریہ عبرت ہے

مذکورہ بالا واقعات۔ صرف اس واحد غرض سے صفحہ قرطاس پر لائے گئے ہیں کہ وہ تنسیخ سزائے موت ایسے مشکل اور نازک موضوع کی گتھی سلجھانے میں مدد دیں۔ کیونکہ ہمیں یقین واثق ہے۔ کہ اس داستان کا ہر لفظ نبات خود ہمارے نظریہ کے مخالفین کا جواب ہے۔ اور یہ کہ انیسویں صدی عیسوی کے اہم ترین مسئلہ کا حل اسی داستان میں موجود ہے۔

کلاڈے کی زندگی میں صرف دو امر قابلِ غور و فکر ہیں۔ اولاً اس کی تعلیم ثانیاً اس سزا کی نوعیت جو اس پر عائد کی گئی۔

کسی دائرہ کے لئے یہ امر باعثِ دلچسپی ہو گا۔ کہ کلاڈے ایک اچھے فہم و فراست کا مالک تھا۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ اس میں کس چیز کی کمی تھی۔ اس مسئلہ عظیم پر انسانی معاشرت کی بلندی کا انحصار ہے۔ یہ چیز فطرت نے انسان کو بخشی۔ سوسائٹی کا فرض ہے۔ کہ اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔

کلاڈے کی طرف دیکھئے۔ ایک بہترین دماغ اور شریف زاد محض گاتا زاد

فضا میں پرورش پانے کے باعث چور بن گیا۔ سوسائٹی نے اسے ایسے زندان میں رکھا جہاں گناہ پہلے سے بھی زیادہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ چور سے قاتل بن گیا۔ وہ قابل گرفت ہے۔ یا ہم؟

یہ مسئلہ غور طلب ہے۔ ہم اس کے عواقب و عواطف سے غافل رہ کر اس پر غور نہیں کر سکتے۔ حقائق ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اگر حکومت ان پر غور نہ کرے تو حکام کس لئے ہیں؟ ایوانہائے سلطنت ہر سال الاکین سلطنت کی نشستگاہ بنتے ہیں۔ وہاں مداخل و مخارج پر بحث ہوتی ہے ذاتی مفاد کے لئے طرح طرح کے حیلے تراشے جاتے ہیں۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم وزراء و اراکین سلطنت کو ہر ایک موضوع سے باخبر کر دیں۔ خواہ اُن کا انجام کچھ نہ ہو۔

مقننین! تم اپنا وقت محض گفتار میں بسر کرتے ہو۔ تمہاری گفتار ایک دیہاتی مدرس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ لے آتی ہے۔ تم کہتے ہو۔ کہ موجودہ زمانے کے عیوب خود تمدن کے پیدا کردہ ہیں۔ گویا تم جو کیٹیا خدر را، اوڈی پس، میڈیا اور دوڈو گونا سے واقف تک نہیں۔

ایوان کے بڑے بڑے خطیب جس وقت سرگرم مباحثہ ہوتے ہیں تو فرانسیسی زبان ان کی قابلیت اور علمیت زبان پر نوحہ خوانی کرتی ہے۔ ہم اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ تاہم اس سے زیادہ اہم مضامین آغوش عدم میں پڑے رہتے ہیں۔ ان فضول مناظروں کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔؟

اراکین اس وقت کیا جواب دے سکتے ہیں جب ان میں سے ایک مندرجہ ذیل سوال کرے۔

"خاموش! ہر وہ شخص جو اس سے قبل گفتگو کر چکا ہے۔ خاموش رہے! آپ کو اس پر زعم ہے۔ کہ آپ مسئلہ کے ہر پہلو سے واقف ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے

کہ آپ بالکل تاریکی میں ہیں۔"

وہ مسئلہ یہ ہے! ایک سال ہوا جب "عدل و انصاف" کے نام پر پیرس میں ایک شخص کے ٹکڑے اڑا دیئے گئے۔ جون میں ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پیرس میں لاتعداد افراد قتل کئے گئے۔

یہ مسئلہ ہے۔ آؤ اس پر غور کرو۔

تم! تم وہ ہو۔ جو صرف قلی محافظ کی وردیوں پر غور کرتے ہو۔ صرف اس نکمی بحث پر وقت ضائع کرتے ہو۔ کہ سپاہیوں کی وردیوں کے بٹن سفید ہوں یا زرد۔

حضرات! صرف عوام الناس تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ خواہ حکومت شخصی ہو۔ یا جمہوری۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ غربا بدستور مصائب کا شکار رہتے ہیں۔ لوگ مفلسی کے ہاتھوں تنگ ہیں۔ ان کا خون رگوں میں سرد ہو چکا ہے۔ وہ زندہ درگور ہیں۔ یہی سیاہ بختی۔ انہیں جرائم کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہے بیٹے جیلوں کو آباد کرتے ہیں۔ اور لڑکیاں عشرت کدوں کی زینت بڑھاتی ہیں۔

تمہارے ہاں لاتعداد مجرم اور بے شمار عصمت فروش موجود ہیں۔ مجلسی بدن کی رگوں میں بدی کا خون موجزن ہے۔ تم بیمار کے قریب ہو۔ اس کی عیادت کرو اس کی صحت کے لئے کوئی نسخہ تیار کرو۔

تم سب غلطی پر ہو۔ مسئلہ پر نہایت غور و فکر سے سوچو۔ تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ تمہارے قوانین کا نصف حصہ ہے۔ تمہارے روزمرہ کے کاروبار کا۔ اور دوسرا نصف تمہاری جاہلی کا۔

تم مجرموں کے جسموں پر داغ دیتے وقت ان کے مکتوب حیات پر جرائم کی مہر لگاتے ہو۔ تم اس سزا کے دو رفیق پیدا کرتے ہو۔ کبھی جدا نہ ہونے والے ساتھی۔ داغ اور جرم۔

جیل خانے اصلاح کی بہ نسبت افساد کا مرکز ہیں۔ جہاں تک سزائے موت
کا تعلق ہے۔ وہ ازمنہ بربریت کی آخری یادگار ہیں۔ اس لئے داغ دینا۔ زندان
اور سزائے موت سب ایک ہی شجر کے اثمار ہیں۔ تم نے داغ کی سزا موقوف کر دی
ہے۔ مگر باقی ماندہ سزاؤں کا بھی خاتمہ کرو۔ جب تم نے آہنی سلاخ کو توڑ دیا۔ تو
پھر جلاد اور زندان کی کیا ضرورت ہے۔ اس زینہ کو جو بام جرم کی طرف لئے جاتا
ہو۔ توڑ دو۔ اپنے قوانین پر نظر ثانی کرو۔ قانونی کتب کو نئے سرے سے مرتب کرو۔
زندانوں کو از سر نو تعمیر کرو۔ عدالتوں میں نئے ججوں کا تقرر عمل میں لاؤ۔ قوانین
کو عصر حاضر کے مطابق بناؤ۔

آپ لوگوں کے پیش نظر کفایت شعاری ہے۔ مگر خدا را اس کی خاطر تمہیں
لوگوں کے سروں کو اس بیدردی سے ان کے تنوں سے جدا نہیں کرنا چاہیے۔

اگر تم فی الحقیقت سختی پر تلے ہوئے ہو۔ تو جلاد پر سختی کرو۔ اسی مشاہرہ پر
جو تم اپنے ۸۰ جلادوں کو دیتے ہو تم چھ سو مدرس قائم کر سکتے ہو۔ جو ان ہونے
والے مجرموں کے اذہان کی اصلاح کریں۔

کیا تم نے کبھی اس امر پر بھی غور و پرداخت کی ہے۔ کہ تمہارے ملک فرانس
میں تعلیم یافتہ شخصوں کے کیا اعداد و شمار ہیں۔ یورپ کے چپہ چپہ پر علم کی شعاعیں
پہنچ چکی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں قریباً تمام افراد تعلیم یافتہ ہیں۔ بلجیم میں ہر شخص پڑھا
ہوا ہے۔ تمام یونان تعلیم یافتہ افراد سے بھرا ہوا ہے۔ اگر علم سے بے بہرہ ہے
تو تمہارا فرانس کیا یہ امر تمہارے لئے باعث شرم نہیں۔

زندانوں میں جاؤ۔ مجرموں کا بغور مطالعہ کرو۔ تمہیں اپنے رد کئے ہوئے
شخصوں نے کئی ایسی خصلتیں نہاں نظر آئیں گی۔ جو تھوڑی سی تعلیم حاصل کرنے پر
تمہارے ملک کے درخشاں ستارے بن سکتیں۔ مگر ان کی موجودہ حالت حیوانوں سے

بدتر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ قدرت بھی قابل الزام ہے۔ مگر تعلیم کی کمی کا ان اذہان کو آغوش جرم کی طرف لے جانے میں بیشتر از بیش حصہ ہے۔

اس لئے ہمیں چاہئے۔ کہ ان اذہان کی تعلیم و تربیت کے لئے کوشش کرو ان پودوں کو جو عدم نگہداشت کی نذر ہو رہے ہیں۔ سینچو اور ان کو علم کے سایہ میں پرورش پا کر پھیلنے کا موقعہ دو۔

اقوام کی قابلیت کا اندازہ ان غیر معمولی افراد سے ہوتا ہے۔ جنہیں وہ پیدا کرتی ہیں۔ جب روم اور یونان جیسے ممالک تعلیم یافتہ ہو گئے۔ تو کیا تم اپنی مادرِ وطن کے فرزندوں کو علم سے مستفید نہیں کر سکتے؟

جب فرانس میں تعلیم عام ہو جائے۔ تب عوام کو اخلاقی بلندی تک لے جاو۔ عدم علمیت گمراہ کن تعلیم سے بہتر ہے۔ ۱۸۳۰ء کے پروانہ آزادی اور دیگر فرانسیسی کتب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی ایک اور کتاب ہے۔ جو بائیبل ہے۔

تم جمہور کے لئے جو چاہو کرو۔ ان کی اکثریت کا دامن مفلسی اور تباہی سے وابستہ رہے گا۔ ان کی زندگی کشمکش پیہم ان تھک محنت اور قوت برداشت سے مرکب ہے۔

ترازوئے عدل کی طرف دیکھو۔ تمام مصائب غربا کے لئے اور تمام مسرتیں امرا کے لئے۔ دونوں پلڑے غیر مساوی ہیں۔ ترازوئے عدل کو دھوکا نہیں دینا چاہئے۔ اور نہ ہی حکومت کو اس دھوکا دہی میں مدد کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے غربا کے مصائب میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔

تم عدل و انصاف کو کام میں لاؤ۔ تاکہ غربا کو معلوم ہو جائے۔ کہ ان کے لئے نیلگوں آسمان کے نیچے کوئی جائے پناہ ہے۔ ایک خوشنما جنت ہے جس کی لطیف فضاؤں سے وُہ بھی متمتع ہو سکتا ہے۔ اس کا مرتبہ بلند کرو۔ تاکہ

اسے بھی معلوم ہو۔ کہ امرا کی تعیش پسندی میں وہ بھی برابر کا شریک ہے۔
یہ مسیح کی تعلیم تھی۔ جو والٹیر سے زیادہ علم رکھتے تھے۔
تب ان لوگوں کو جو یہاں کام کرتے ہیں۔ آئندہ دنیا میں حصولِ اجر کی امید دلاؤ۔ وہ صبر اور شکر سے ایامِ زیست بسر کریں گے۔

پس دین کی اشاعت کرو۔ اس کی تعلیم کو ہر مقام پر پہنچاؤ۔ تاکہ لوگوں کی سیرت بہتر اور ارفع ہو سکے۔

عوام کے سروں میں سودائے خام کی بجائے تابناک جوہر موجود ہیں۔ انہیں نیکی کی طرف بلاؤ۔ اور پھر دیکھو۔ کہ ان کی خوابیدہ قوتیں کس طرح بیدار ہوتی ہیں۔

حالات کے ماتحت کلاڈے کو قاتل بننا پڑا۔ اگر اس کی تربیت بہتر طریقوں سے کی جاتی۔ تو وہ اپنی ملت کا بہترین خادم ثابت ہوتا۔

ظلمت کدۂ ضمیر منور کرو۔
عوام کی حالت بہتر بناؤ۔
انہیں تعلیم دو۔
ان کے اخلاق کی حفاظت کرو۔
پھر تمہیں ایسے انسانی سر کاٹنے کے لئے تیغِ ستم کی ضرورت نہ ہوگی۔
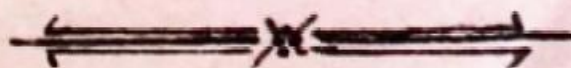
ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔ کہ وہ اپنے ملک میں تعلیم پھیلائے۔ اور جرائم کو کم کرنے کی کوشش کرے۔

دین محمدی پریس لاہور میں حکیم محمد یوسف حسن پرنٹر پبلشر نے
چھپواکر نیرنگِ خیال بکڈپو فلیمنگ روڈ لاہور سے
شائع کیا۔